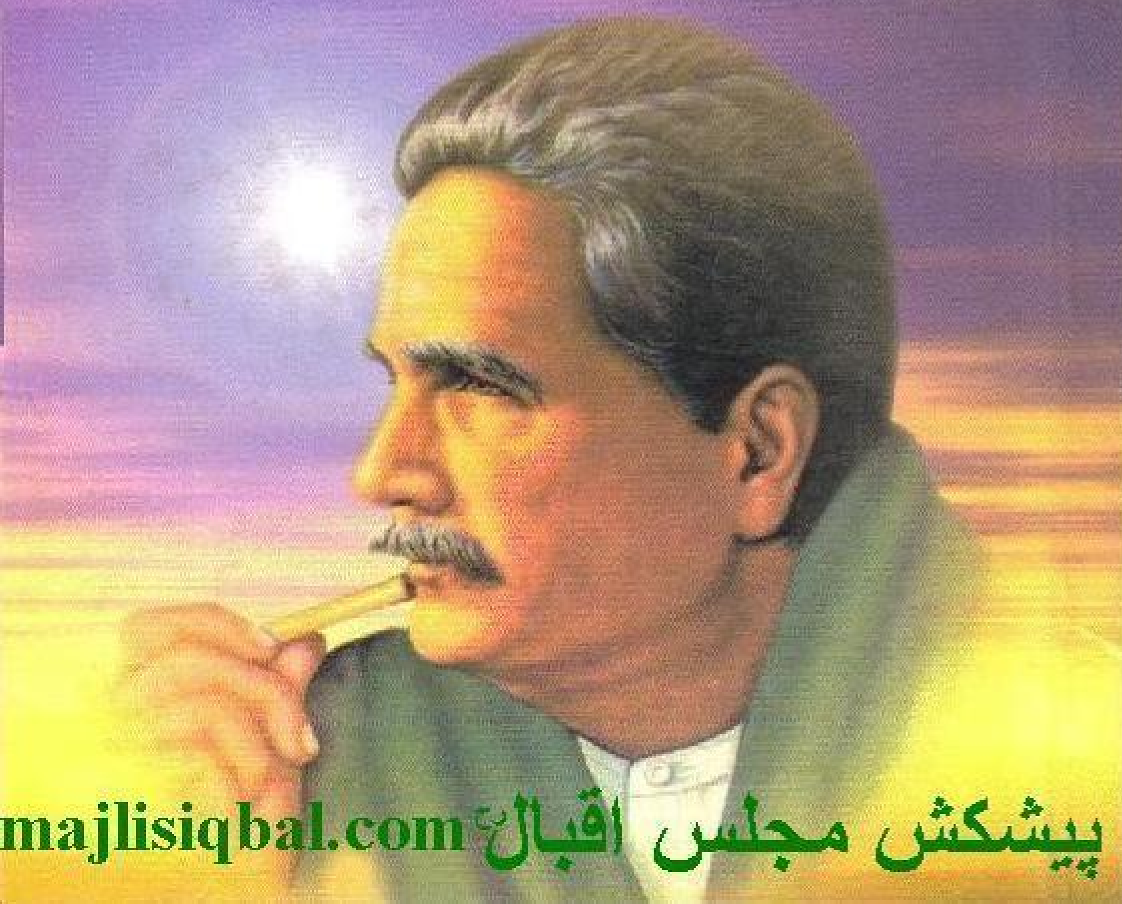
# بالِ جبریل

## (متن و شرح)

شارح: اسرار زیدی

تشریح الفاظ: نثار اکبر آبادی









محمد ابوبکر صدیق نے یہ کلیات اقبالؒ (ندیم یونس پرنٹرز لاہور سے)

چھپوا کر شیخ محمد بشیر اینڈ سنز لاہور سے شائع کی

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور فون: 7660736


پیشکش: مجلس اقبال

نشر و توزیع: محمد اسلم باقر

# فہرست

## غزلیات (حصہ اول)

## غزلیات (حصہ دوم)

# رُباعیات

## منظومات

001

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

"بال جبریل" کی پوری شاعری انسانی اور معاشرتی سطح پر انقلاب سے ہم آہنگ ہونے والے پیغام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اوپر درج ہونے والا شعر اپنی جامعیت کے اعتبار سے کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ جس طرح رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر کے خورشید اپنی آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور بتدریج ساری فضاء کو روشن اور منور کر دیتا ہے اسی طرح سے ہمیں اپنی زندگی کا آغاز ایسی جدوجہد سے کرنا چاہئے کہ اس میں مایوسی ختم ہو اور رجائیت کا دور دورہ ہو۔ عملاً یہ شعر اقبال کی حکمت و فکر کا عنوان ہے۔

ان دو اشعار کی تشریح و تفہیم کے بعد اب اگر "بال جبریل" کی پوری شاعری کی طرف آیئے تو اس کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان میں کا بیشتر حصہ مسلسل غزلوں پر مشتمل ہے یا پھر انہیں مقفی نظموں سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا حصہ رباعیات و قطعات سے تعلق رکھتا ہے۔ باقی حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ تاہم اس مجموعے میں جو ترتیب پیش نظر رکھی گئی ہے اسی حساب سے اشعار کی تشریح بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اولین مسلسل غزل کے پانچ اشعار کو اسی حوالے سے دیکھنا پڑے گا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر
(بھرتری ہری)

"بانگ درا" کے بعد علامہ اقبال نے اردو شاعری کے دوسرے مجموعے "بال جبریل" کا آغاز مندرجہ بالا شعر سے کیا ہے۔ ہر چند کہ یہ شعر خود اقبال کا ہے تاہم اس کا بنیادی اور مرکزی خیال قدیم مالوہ (بھارت) کے ایک تاریخ ساز راجہ بھرتری ہری کے حکیمانہ تصور سے ماخوذ ہے۔ جنوبی ہند کی ریاست مالوہ کی شناخت بھرتری ہری کے علاوہ روپ متی اور باز بہادر کی شخصیات سے ہوتی ہے۔

روپ متی اور باز بہادر کا رومان اور جراءت مندی بھارت کی تاریخ کا ایک اہم جزو ہیں۔ عابد علی عابد نے انہی کرداروں کو بنیاد بنا کر جو ڈرامہ لکھا وہ ہمارے ادب میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے علاوہ بھرتری ہری نے اپنی حکمرانی کا بیشتر حصہ اگرچہ عیش و عشرت میں گزارا تاہم بعد میں وہ اقتدار کو تج کر درویش بن گیا۔ اس کے حکیمانہ نظریات پر مشتمل شاعری نے نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ علامہ اقبال جیسے صاحب فکر شاعر نے بھی مذکورہ شعر میں اس کے ایک خیال سے استفادہ کیا ہے۔

اس شعر کی تشریح کچھ یوں کی جا سکتی ہے کہ پھول کی پتی جیسی نازک شے سے ہیرے جیسی سخت چیز کو کاٹنا تو بے شک ممکن ہے جب کہ ایسا شخص جو دانش و سمجھ سے بے بہرہ ہو اس پر معقول اور سیدھی سادی بات اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس شعر میں اقبال نے واضح کر دیا ہے کہ معقولیت پسند انسان ہی سچائی اور حقیقت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن نا سمجھ اور نافہم شخص کے لئے یہ سب کچھ بے معنی اور بے مقصد شے ہیں۔

(1)

002

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں
گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

**معنی:** **ذات:** باری تعالیٰ کی ہستی، وجود مطلق۔ **نقش بند:** نقش باندھنے والا نقشے بنانے والا نقاش۔ **صفات:** باری تعالیٰ کی وہ صفتیں جن کی وجہ سے انسانوں میں ذات کا صحیح تصور پیدا ہوتا ہے۔ **رست خیز:** قیامت۔

① اس مسلسل غزل کے پہلے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میری عشقیہ اور والہانہ پکار سے بارگاہ ایزدی میں ایک شور و تلاطم برپا ہو گیا جب کہ یہ وہ مقام ہے جہاں کسی فرد کے لئے بھی مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔ شاعر کو ذات خداوندی سے ایسا والہانہ عشق ہے کہ وہ اس کی صفات کو بھی ایک بتکدے کی مانند اپنی وارفتگی کی راہ میں حائل سمجھتا ہے چنانچہ وہ سمجھتا ہے کہ میری یہی والہانہ صدا اس بتکدۂ صفات کو بھی متلاطم کر گئی۔ عملاً یہ شعر بڑا وسیع المعانی ہے جس کی تفہیم کے لئے عشق حقیقی کی ایک رمق ہی میسر آ جائے تو غنیمت ہے۔

② دوسرا شعر بھی یوں پہلے شعر کا تسلسل ٹھہرتا ہے کہ میری والہانہ صدا جب حریم ذات میں تلاطم پیدا کر سکتی ہے تو حور اور فرشتے لاکھ غیر مادی سہی پھر بھی وہ میرے تخیل کے اسیر ہیں۔ میں ان کی اصلیت کا مکمل ادراک کر سکتا ہوں میری بے باک نگاہی نے تو اے والا صفات تیری تجلیوں میں بھی خلل پیدا کر کے رکھ دیا ہے۔

③ اے باری تعالیٰ تجھے پانے کے لئے میں نے بت خانوں اور مسجدوں کی تعمیر کا اہتمام بھی کیا لیکن تلاش بسیار کے باوجود وہاں کچھ نہ ملا تو پھر اپنی فریاد سے میں نے کعبے اور بت خانوں میں قیامت برپا کر دی۔ اقبال یہاں دراصل اس نکتے کو پیش نظر رکھے ہوئے ہیں کہ ذات الٰہی عبادت گاہوں تک محدود نہیں ہے۔ اس کا نور تو ہر جگہ ہر مقام پر ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے تو بس دیدۂ بینا کی ضرورت ہے۔

④ زندگی میں کبھی ایسا مرحلہ بھی آیا کہ میں نے اپنی تیز نگاہی سے انسانی وجود کی داخلی کیفیتوں اور حقیقتوں کا ادراک کر لیا اور کبھی یوں بھی ہوا کہ اپنے ہی توہمات میں ایسا الجھا کہ اپنی ہی شناخت مشکل ہو گئی۔ اس شعر میں دو متضاد انسانی اور نفسیاتی کیفیتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

⑤ یہ شعر بظاہر سیدھا سادہ ہے لیکن اتنا سادہ بھی نہیں کہ با آسانی اس کی گہرائی تک پہنچا جا سکے۔ اقبال کے شارحین نے اس شعر کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ تجزیہ مولانا غلام رسول مہر جیسے اقبال شناس کا ہے کہ شعر کے لفظی معانی بیان کرنے کے بعد یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ "اشعار کے عام مطالب واضح کر دیئے گئے لیکن ان سے حقیقی لذت اندوزی ذوقی و وجدانی چیز ہے۔ محض تشریح پر موقوف نہیں"۔ بہرحال میرے نزدیک یہ شعر "عظمت آدم سے زوال آدم" تک جو داستان ہے اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں اس کا احاطہ کیا ہے۔ کہاں آدم مسجود ملائک تھا اور کہاں اسے ایک معمولی

سی غلطی کی پاداش میں زمین پر پھینک دیا گیا۔ اس شعر میں اقبال نے اپنی ذات کے حوالے سے خالق کائنات سے اسی اقدام کے ضمن میں گلہ کیا ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی شاید غیر ضروری نہ ہو کہ محض اس شعر کے لغوی معنی بیان کرنے کے بعد قاری سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے ذوق و وجدان کی مدد سے ہی شعر سے لطف اندوز ہو سکے گا' قطعی غیر مناسب ہے۔ اقبال نے شعر میں اپنے فکر و نظریات کو جس سلیقے اور مشاقی کے ساتھ سمویا ہے اس تک رسائی کے بغیر اقبال کی تفہیم ممکن نہیں۔

003

## (2)

اگر کج رو ہیں انجم' آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکر جہاں کیوں ہو' جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یا رب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

اسے صبح ازل انکار کی جراءت ہوئی کیونکر؟
مجھے معلوم کیا! وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

① "بال جبریل" کی اولیں غزل کی طرح یہ دوسری غزل بھی اپنے مطالب اور مضامین کے حوالے سے مسلسل ہے اور پانچ اشعار پر ہی مشتمل ہے۔ اس غزل کے پہلے شعر میں اقبال خداوند عز و جل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ستاروں کی چال درست نہیں تو اس کے لئے مجھے تو سزاوار نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ آسمان کا مالک بھی تو ہی ہے اور اس پر جگمگاتے ہوئے ستاروں پر بھی تیرا ہی اختیار ہے۔ بے شک تو ہی قادر مطلق ہے اور میں تو ایک عاجز و لاچار بندہ ہوں۔ اس جہان کی فکر بھی مجھے نہیں بلکہ تجھے ہی ہونی چاہئے کہ یہ جہاں یقیناً تیرا ہی پیدا کردہ ہے۔

② یہ لامکاں' یہ فضائے بسیط بھی تیری ہی دسترس میں ہے۔ اس کے باوجود اگر یہاں تجھ سے والہانہ شیفتگی کا اظہار نہیں ہوتا تو اس کی ذمہ داری بھی اے خدا تجھ پر ہے۔ مجھ پر نہیں ہو سکتی۔

③ ابلیس نے جو تیرے احکام سے روگردانی کی تو اپنے مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسے انکار کی جراءت کیونکر ہوئی۔ اس لئے کہ ابلیس تو تیرے وابستگان خاص میں سے تھا اور تیرا رازداں بھی تھا۔ اس صورت میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس ساری صورت حال کا تعلق مجھ سے تو نہیں تھا بلکہ تجھ سے اور صرف تجھ سے تھا۔

④ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خاتم الانبیاء پیغمبر انقلاب حضور سرور کائنات احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے فرستادہ تھے۔ تمام فرشتوں میں افضل و اعلیٰ حضرت جبریلؑ جو تیری وحی انبیاء کرام کو پہنچایا کرتے تھے ان کا تعلق بھی تجھ سے ہی تھا؟ پھر وہ **صحیفہ کاملہ** جب قرآن کی صورت میں پیغمبر آخر الزماںؐ پر نازل ہوا وہ بھی تیرا تھا مگر وہ حرف شیریں جو وحی کی صورت میں نازل ہوا میرا تو نہیں تیرا ہی تھا۔

⑤ کائنات میں انسان کی حیثیت اس تابندہ ستارے کی طرح ہے جس سے سارا جہاں منور ہوتا ہے اور یہ روشنی تیری شناخت کا سبب بنتی ہے چنانچہ اگر یہی انسان زوال سے دوچار ہوا تو اس میں نقصان تیرا ہی

ہے میرا نہیں۔
فی الواقع ان پانچوں اشعار میں معنی و مفہوم کے اعتبار سے جو بات مقصد مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ایک قربت الٰہی کا خواہاں بندہ اپنے محبوب سے گلہ مند ہے کہ تیرے وابستگان خاص میں سے ابلیس یا کسی اور انسان نے نافرمانی کی تو میری ذات سے تو اس کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ فرشتے ہوں یا انسان کوئی بھی مخلوق ہو ان کی تخلیق کی ذمہ داری خداوند تعالیٰ پر ہی عائد ہوتی ہے کسی اور فرد پر نہیں!

## 004 رباعی

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے؟ بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم! بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے!

① اقبال نے اس رباعی میں بھی گلہ مندی کا رویہ اختیار کیا ہے تاہم ابتدائی شعر میں قدرے طنز بھی ہے۔ خداوند عزوجل سے مخاطب ہوتے ہوئے اقبال استفسار کرتے ہیں کہ قادر مطلق ہونے کے باوجود تو ضرورت مندوں کی پوری طرح کفالت کیوں نہیں کرتا۔ تمثیلی سطح پر اگر سمندر کسی پیاسے کی تشنگی رفع کرنے کے لئے محض ایک قطرہ آب فراہم کرتا ہے تو اس سے اس کی پیاس کیسے بجھ سکتی ہے۔ اس عمل کو تو رزاقی کی جگہ کنجوسی سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔

## 005 (3)

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر!

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں!
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!

تو ہے محیط بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر!

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خذف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر!

نغمہ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر!

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر!

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر!

① اقبال اس غزل میں اپنے رویے کے اعتبار سے پہلی دو غزلوں سے قدرے مختلف نظر آتے ہیں۔ پہلی غزلوں میں گلہ مندی کے ساتھ ایک حد تک طنزیہ انداز بھی اختیار کیا گیا تھا جب کہ اس غزل میں استدعا اور خواہش کا رنگ نمایاں ہے۔ غزل کے پہلے شعر میں رب تعالیٰ سے مخاطبت میں ایک واضح اشارہ موجود ہے کہ اپنے جلوؤں کو درون پردہ چھپا کے نہ رکھ بلکہ ان کو اس قدر نمایاں کر دے کہ دیکھنے والوں کے قلب و نظر اور ہوش و خرد شکار ہو کر رہ جائیں اور ان پر تیری مکمل گرفت قائم ہو۔

② اے میرے محبوب یہ کون سی ادا ہے کہ عشق بھی پردے میں ہو اور حسن بھی حجاب کا دھند لکا

ہوئی ہو یعنی اس امر کی توقع کی جائے کہ تیری ذات سے جو وارفتگی ہے اس کا اظہار بھی نہ کیا جائے اور تیرا اپنا وجود بھی پوشیدہ رہے۔ میں تو اس امر کا خواہاں ہوں کہ یا تو تو خود اپنے وجود کو ظاہر کر دے یا مجھے اپنے ساتھ والہانہ عشق کے اظہار کی اجازت مرحمت کر!

③ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ تیری ذات شعور سے بہت زیادہ بلند و بالا ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرا وجود تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ چنانچہ تیری عظمت اور بلندی اس حقیقت میں ہی مضمر ہے کہ میرا مرتبہ بھی بلند کر دے۔

④ خداوندا! اگر میرا وجود ایک سیپی تصور کر لیا جائے تو اس میں پوشیدہ جوہر کی قدر و قیمت کا اندازہ تو ہی کر سکتا ہے اور اگر میں ایک ٹھیکری کی طرح سے ہوں تو یہ تیرے قبضہ قدرت میں ہے کہ مجھے ایسا گوہر آبدار بنا دے جو تاج شاہی کے شایان شان ہو۔ بالفاظ دیگر اس شعر میں کہا گیا ہے کہ تو ہی میری قدر و قیمت سے آشنا ہے اور تو ہی مجھے لازوال عظمتوں سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

⑤ اے مالک کل کائنات اگر آنے والی بہار کے نغمے یعنی متوقع کامیاب مستقبل کا ثمر میرے مقدر میں نہیں ہے تو کم از کم ایسا پرندہ ہی بنا دے جو آنے والی بہار اور روشن مستقبل کا نقیب ہی بن سکے۔ اقبال کا یہ شعر یاسیت کے عالم میں رجائیت کا مظہر ہے۔

⑥ خداوندا! کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تیرے حکم سے ہی مجھے جنت سے نکال کر اس کرۂ ارض پر بھیجا گیا تھا کہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکوں۔ یہ روز حشر تک کرنا پڑے گا۔ اس شعر میں اقبال پوری طرح اپنی شاعرانہ انا کے ساتھ اس جذبے سے مسلح نظر آتے ہیں جو ان کے نزدیک انسانی عظمت کا آئینہ دار ہے۔

⑦ اس شعر میں اقبال نے بڑی صناعی اور چابکدستی کے ساتھ بندہ و خالق کے مابین جو رشتہ ہے اس کی نشاندہی اپنے مخصوص فکری انداز میں کی ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ روز قیامت جب میرے گناہوں کا حساب تیرے روبرو پیش ہو گا تو یہ عمل میرے لئے تو یقیناً شرمساری کا سبب ہو گا کہ مجھ سے یہ گناہ سرزد ہوئے ہیں لیکن جب تجھے یہ خیال آئے گا کہ میں نے ہی اس گناہ گار کو اپنا جانشین بنا کر دنیا میں بھیجا تھا تو اس لمحے تیرا ردعمل کیا ہو گا؟

## (4)

006

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد — نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد!
یہ مشت خاک، یہ صرصر، یہ وسعت افلاک — کرم ہے یا کہ ستم تیری لذت ایجاد!
ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمہ گل! — یہی ہے فصل بہاری؟ یہی ہے باد مراد؟
قصوروار غریب الدیار ہوں لیکن — ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد!
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے — وہ دشت سادہ وہ تیرا جہان بے بنیاد!
خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد!

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد!

① مولائے کائنات! یہ امر تو اپنی جگہ کہ میری فریاد میں اثر ہے یا نہیں! تاہم اس کو سننے میں تو کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے کہ میں تو ان افراد میں سے ہوں جو داد کا طلب گار ہونے کی بجائے اس نوع کے جھمیلوں سے آزاد ہوتے ہیں۔

② انسان جو ایک مشت خاک کے مانند ہے گوناگوں مصائب اور بلاؤں کے ہجوم میں گھرا ہوا ہے۔ یہ بلائیں اور مصائب آسمانوں کی تمام تر وسعت کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اب اس کا اندازہ کیسے ہو کہ تیرے ذوق تخلیق میں یہ عمل قہر و غضب پر مبنی ہے یا لطف و عنایت کا حامل ہے۔

③ یہ درست ہے کہ بہار آئی تو باغوں میں پھول کھلے لیکن خزاں کے جھونکوں سے وہ سب کے سب مرجھا گئے۔ کیا یہی وہ مختصر عرصۂ زیست ہے جسے بہار کے موسم اور باد مراد سے منسوب کیا جاتا ہے؟ اسی مضمون کے حوالے سے ایک شعر ملاحظہ ہو۔

فرق یہی ہے بس ہونے میں اور نہ ہونے میں
غنچہ چٹکا' پھول بنا' مرجھایا اور گیا

(اسرار زیدی)

④ خداوندا! بے شک تو نے آدم کو ایک گناہ کی پاداش میں کرۂ ارض پر جلاوطن تو کر دیا تاہم اس نے اس خرابے کو ایک گلشن میں تبدیل کر دیا ظاہر ہے کہ یہ عمل تیرے فرشتوں کے بس کا روگ نہ تھا۔

⑤ یہ آدم کی محنت اور جفاکشی تھی جس نے ویران خطۂ ارض کو گل و گلزار بنا دیا۔ یہاں کے موجود عناصر آج بھی اس حقیقت کے معترف ہیں۔

⑥ خطروں اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے والی طبائع کسی ایسے گلستان کو بھی ناپسند کرتی ہیں جہاں کوئی مدمقابل موجود نہ ہو۔

⑦ اے خدا! یہ جاں نثاری کا عمل تیرے فرشتوں کے بس کا نہیں ہے۔ اس کے سزاوار تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن میں جراءت و ہمت کی کمی نہ ہو۔ اس شرط پر فرشتے نہیں بلکہ آدم ہی پورا اتر سکتا ہے۔

اقبال کے کلام میں اس نوع کے بہت سے اشعار ملیں گے جن میں انہوں نے خداوند لایزال کے پیش نظر عظمت آدم کے بالمقابل فرشتوں کے مقام کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے کے حوالے سے وہ انسان کی فضیلت پر یقین رکھتے ہیں۔

(5) 007

کیا عشق ایک زندگیِ مستعار کا!
کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا!

وہ عشق، جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا!

میری بساط کیا ہے؟ تب و تاب یک نفس!
شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا

کر پہلے مجھ کو زندگیِ جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا!

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو!

معنی: مستعار: لفظی معنی مانگی ہوئی' اصطلاحی عارضی اور فانی۔

① اقبال نے یہ اشعار اگرچہ غزل کی ہیئت میں لکھے ہیں تاہم تکنیکی اور فنی سطح پر یہ ایک نظم کے اشعار ہیں۔ اس نظم کے پہلے شعر میں وہ کہتے ہیں کہ حیات انسانی عارضی اور فنا ہونے والی ہے اسے اس ذات مطلق سے عشق کا حوصلہ کیسے ہو سکتا ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

② وہ عشق جو فنا کے ایک تھپیڑے کا بھی متحمل نہ ہو سکے اس میں ہجر کی تپش اور انتظار میں جو اضطرابی کیفیت ہوتی ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

③ میں اپنے وجود میں ایک ایسے ستارے کے مانند ہوں جو لمحے بھر کے لئے چمک دکھا کر غائب ہو جاتا ہے۔ مجھ سا ایک ادنیٰ انسان اس ذات مطلق سے کیسے الجھنے کا حوصلہ کر سکتا ہے جو پوری کائنات پر ہر طرح کی قدرت رکھتا ہے۔

④ خداوندا! اگر میرا حوصلہ اور شوق وارفتگی دیکھتا ہے تو ایسی طویل عمر عطاء کر جس میں فنا کا تصور بھی موجود نہ ہو۔

⑤ اے میرے معبود میرے دل کو وہ خلش عطا کر جو ہمیشہ برقرار رہ سکے اور ایسا درد دے جس کی کسک لازوال ہو۔

008

## رباعی

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر!

① اس رباعی میں اقبال دعائیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے خداوند عز و جل سے درخواست گزار ہیں کہ مولا! انسانی قلوب کو اپنی محبت سے لبریز کر دے اور انہیں راہِ وفا پر گامزن کر دے۔

② وہ مفلس و نادار اور بے سروسامان لوگ جن کے وسائل اتنے محدود ہیں کہ پیٹ بھرنے کے لئے جو کی روٹی پر ہی اکتفا کرتے ہیں تو یہی سہی تاہم ان کے بازوؤں کو قوت حیدریؓ سے بھی نواز دے۔ اقبالؒ نے یہاں علامتی سطح پر "نان جویں" اور قوت حیدریؓ کا جو تذکرہ کیا ہے اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ محض کسی کو جو کی روٹی کی فراہمی کافی نہیں اسے شیر خدا علی مرتضیٰؓ کی جراءت و ہمت اور قوت سے بھی تو نواز دے۔ اقبالؒ نے اپنے کلام میں بے شمار مقامات پر حضرت علی مرتضیٰؓ کی جراءت و ہمت اور استغنیٰ کا بار بار ذکر کیا ہے کہ وہ ان کے مثالی کردار کے بڑی شدت کے ساتھ قائل تھے۔

## (6)

009

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے! جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے
نہ کر دیں مجھ کو مجبور نوا فردوس میں حوریں مرا سوزِ دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے!
کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے!

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے!

کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے!

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

**معنی: ناپیدا کراں**: جس کا کنارہ نظر نہ آئے۔ **خود نگہداری**: اپنے آپ کو نگاہ میں رکھنا۔ **دنبالہ**: پشت پیچھے۔

① اس غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے۔ اس کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ موت کے بعد میری خاک کے منتشر ذرات اگر یکجا ہو کر دل کی صورت اختیار نہ کر لیں تو پھر میں اسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گا جو عشق کی صورت میں زندگی کے دور میں مجھ پر مسلط تھی۔ مطلب یہ کہ زندگی میں بس عشق میں گرفتار رہا ایسا نہ ہو کہ موت کے بعد بھی اسی صورت حال سے دو چار ہو جاؤں۔

② اگر بہشت میں بھی پہنچ گیا تو وہاں موجود حوریں مجھے اظہار عشق کی اس کیفیت پر مجبور نہ کر دیں جس کے سبب میری زندگی میں فتور برپا رہا۔ اقبال نے اس شعر میں ایک ایسے نفسیاتی رویے کی طرف اشارہ کیا ہے جو انسانی فطرت کا بنیادی عنصر ہے۔

③ منزل تک رسائی میں ناکامی کا جو دکھ ہوتا ہے وہ مسافر کے لئے ایک مستقل خلش بن جاتا ہے اور منزل تک پہنچنے کے لئے جدوجہد میں حائل ہو جاتا ہے۔ اقبال اس صورت حال کو اپنے فکر کی نفی تصور کرتے ہیں۔

④ جذبہ عشق نے مجھے ہر چند کہ ایسی وسعت عطا کر دی ہے جو ایک بیکراں سمندر کی سی ہے' اب خدشہ یہ ہے کہ یہی تصور ایک ایسے ساحل کی حیثیت اختیار نہ کرے جو میرے عمل ارتقاء کی جدوجہد میں سنگ راہ بن جائے۔

⑤ اس شعر میں اقبال نے لیلیٰ اور مجنوں کے معاشقے کی روایتی داستان کے حوالے سے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ میں اس عالم بے رنگ و بو میں بھی جنون عشق میں مبتلا ہو کر مذکورہ داستان کی تمثیل نہ بن جاؤں۔ یعنی زندگی بھر تو محبوب کی طلب ناکامی کا مظہر رہی اور اگر بعد از مرگ دوسری دنیا میں بھی ایسا ہوا تو انتہائی کرب انگیز ہو گا۔

⑥ اس شعر میں اقبال نے ستاروں اور مہ کامل کی علامتوں کے حوالے سے اپنے عہد میں انسان کے ارتقاء کا ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آج ایک عام انسان کی جدوجہد کے سبب اسے جو عروج حاصل ہو رہا ہے اس نے معاشرے میں موجود اشرافیہ کو خوفزدہ کر کے رکھ دیا ہے کہ اس نے اپنی جدوجہد کے ساتھ کامیابی کی منزل تک رسائی حاصل کر لی تو ان کی (اشرافیہ کی) اہمیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔

(7) 010

دگرگوں ہے جہاں' تاروں کی گردش تیز ہے ساقی!
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی!

وہی دیرینہ بیماری ! وہی نامحکمی دل کی! علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی!
حرم کے دل میں سوز آرزو پیدا نہیں ہوتا کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی!
نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی!
نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!
فقیر راہ کو بخشے گئے اسرار سلطانی بہا میری نوا کی دولت پرویز ہے ساقی!

**معنی:** پیدائی: ظہور۔

① "بال جبریل" کی ساتویں اور آٹھویں غزلیں عملاً ایک طرح کے تسلسل کی آئینہ دار ہیں اور انہیں جزوی سطح پر ساقی نامہ کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے غزل کو نظم سے زیادہ قریب لانے کے ضمن میں جو تجربے کئے ہیں۔ یہ دونوں غزلیں بھی ان تجربوں کا شاہکار ہیں۔ ان دو غزلوں کے سلسلے کی پہلی غزل میں علامہ اقبال نے اس عالمی انتشار کی جانب اشارہ کیا ہے جو مسلم امہ کو درپیش ہے۔ بقول ان کے اس عالم انتشار میں ملت اسلامیہ کی مخالف قوتوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دی ہیں جن کے نتیجے میں پورا ماحول عرصہ قیامت بنا ہوا ہے۔

② دوسرے شعر میں اقبال اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کو وہ لوگ جو خداوند ذوالجلال کے حقیقی نام لیوا ہیں اب وہ ایسی مشکلات سے دوچار ہو چکے ہیں کہ انہوں نے اپنے حقیقی منصب کو بھی فراموش کر دیا۔

③ امت مسلمہ میں عقیدے اور جذبات کی سطح پر ماضی کی طرح ایک بے یقینی کی کیفیت طاری ہے۔ اس مسئلے کا حل ایک انقلاب نامہ میں مضمر ہے۔ ایسا انقلاب جو سرور کائنات کے فرمودات سے ہم آہنگ ہو۔

④ جیسا کہ سطور بالا میں اشارتاً کہا گیا ہے کہ مذکورہ دونوں غزلوں کو جزوی سطح پر ساقی نامہ سے تعبیر کیا جانا چاہئے ان میں ان کا خطاب بالواسطہ طور پر خالق حقیقی سے ہے۔ اس شعر میں بھی وہ خداوند تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ مسلم امہ کے دل جذب و کیف سے خالی ہو چکے ہیں۔ حوصلہ اور بیداری کی قوت ناپید ہو چکی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تیرے مظاہر پردۂ حجاب میں ہیں۔ اگر تیری تجلیات ان کے دلوں کو منور کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان میں وہ جذبہ پیدا نہ ہو جائے جو ابتدائے اسلام کا آئینہ دار تھا۔

⑤ اس حقیقت کا کسے علم نہیں کہ اقبال کا شمار مولانا روم کے مداحوں میں ہوتا ہے۔ وہ ان کے افکار و نظریات کو اپنی سوچ کا مرکز و محور تصور کرتے ہیں۔

دوسری مولانا روم کے استاد شمس تبریز کا تعلق بھی ایران سے ہی تھا یہی وجہ تھی کہ اقبال مملکت ایران اور اس کے دانشوروں کی صلاحیت کے ہمیشہ سے قائل تھے۔ ایک اور نظم میں ان کا مشہور شعر اس امر کی دلیل ہے۔ فرماتے ہیں۔

تہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

بہر حال پانچویں شعر میں مولانا روم کی شخصیت کو علامتی سطح پر بلندئی افکار کا مظہر سمجھتے ہیں۔ اس امر پر کبیدہ خاطر ہیں کہ مولانا روم کے بعد ایران کی سرزمین سے بھی کوئی دوسرا ایسا دانشور پیدا نہیں ہوا جو مسلمانان عالم کی رہنمائی کر سکے۔

⑥ اس شعر میں علامہ اقبال کی رجائیت پسندی پھر سے لوٹ آئی ہے اور کسی نوع کی ناامیدی کا شکار ہونے کی بجائے حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یقین ظاہر کرتے ہیں کہ ذرا حالات سازگار ہوں تو ہم ہر مرحلۂ جاں گداز سے گزر سکتے ہیں۔

⑦ اس غزل کے ساتویں اور آخری شعر میں اقبال خود اپنے افکار کے بارے میں کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قدرت نے مجھے ایسے درویش کو جن رازہائے درون پردہ سے آشنا کیا ہے اور میں جس انداز سے ان کو عام لوگوں پر منکشف کرتا ہوں اس پر بادشاہوں کے خزانے بھی نچھاور کیے جا سکتے ہیں۔

## (8) 011

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی!
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی!

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی!

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی!

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
ہو نہ روشن، تو سخن مرگ دوام اے ساقی!

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہ تمام اے ساقی!

**معنی:** تہی: خالی۔ **تیغ جگر:** جوہر دار تلوار جس کی کاٹ بے پناہ ہو۔

گذشتہ غزل کی شرح کے آغاز میں اس امر کی نشاندہی کی گئی تھی کہ یہ غزل (نمبر7) اور نمبر8 غزل عملاً ساقی نامہ کے اجزاء پر مشتمل ہیں۔ یہ بات ان کی ہیئت سے ظاہر ہوتی ہے۔ دونوں غزلوں میں ساقی ایک ایسے کردار سے مطابقت رکھتا ہے جس سے مراد خالق حقیقی ہے۔

① اس شعر میں اقبال خدائے عزوجل سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے پالنے والے مجھے وہی جذبہ عطاء کر دے جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں تھا اور جس جذبے کے تحت انہوں نے عروج حاصل کیا تھا۔ اس جذبے کے حصول سے ہی میں وہی مرتبہ حاصل کر سکتا ہوں جو اس دور کے مسلمانوں کا تھا۔

② اس شعر میں بھی اقبال نے ہندوستان میں اپنے عہد کی صورت حال اور گذشتہ تین سو سال کے دوران ملت اسلامیہ پر جو جمود طاری رہا ہے اس کے حوالے سے وہ دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے فیض خداوندی عام ہو اور یہ جمود ٹوٹ جائے۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس شعر کے ضمن میں جو وضاحت پیش کی ہے وہ بڑی حد تک درست معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں تین سو سال کی مدت کا اقبال نے جو ذکر کیا ہے اس سے مراد حضرت مجدد الف ثانی سے ہے جنہوں نے مغلیہ دور کے شہنشاہ اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں احیائے شریعت کے لئے بڑا کام کیا۔ اقبال بذات خود مجدد الف ثانی سے بہت متاثر تھے۔

③ شاعر کا کہنا ہے کہ میری تخلیقات میں کہیں کہیں دین کے فکری اجزاء موجود ہیں۔ شریعت کے دعویدار شیخ کو ان کا وجود بھی گوارا نہیں۔ بالفاظ دگر آج کا مولوی اس قدر رجعت پسند ہے کہ اسلام کے فکری نظام کے حوالے سے اس کا کوئی ترقی پہلو کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔

④ اس شعر کا مضمون بھی پہلے دو شعروں کا تسلسل ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ دین کو فکری سطح پر پرکھنے کی بجائے جذباتیت اور عصبیت کے حوالے کیا جا رہا ہے اور اس کے ذمے دار عملاً وہ لوگ ہیں جو ذہنی اور فکری سطح صوفی اور ملا کے پیروکار ہیں اور دینی امور میں کسی قسم کے اجتہاد کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں۔

⑤ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بنیادی عقیدے اور جذبے سے جو عشق تھا وہ ختم ہو کر رہ گیا ہے جس کے باعث وہ علم بھی اسی طرح کی حیثیت کا حامل بن گیا ہے جیسے کہ میدان کارزار میں کوئی تلوار نکالنا چاہے تو اسے نیام خالی ملے۔

⑥ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ انسان میں کچھ حاصل کرنے اور جذب کرنے کا شعور ہو تو بات میں وزن پیدا ہو جاتا ہے اور جب یہ شعور ہی موجود نہ ہو تو کتنی ہی اہم بات کہی جائے وہ بے معنی ہی نظر آتی ہے۔ بالفاظ دگر اس شعر کی وضاحت یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ انسان حقیقت شناس ہو تو حق بات اس کی زندگی کے لئے ایک نصب العین بن جاتی ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو کتنا ہی اہم قول ہو وہ بے معنی بن جاتا ہے۔

⑦ اقبال اس شعر میں بھی اپنے مخصوص علامتی انداز اور استعاروں میں بارگاہ ایزدی میں درخواست گزار ہیں کہ میری قوم بے شک ادبار کا شکار ہے لیکن تو براہ کرم اسے اپنے بے پناہ وسائل سے محروم نہ رکھ اور اسے اپنے الطاف و کرم سے نواز دے۔

## (9)

012

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مے لا الہ الا ہو!

نہ مے نہ شعر نہ ساقی نہ شور چنگ و رباب!
سکوت کوہ و لب جوئے و لالۂ خود رو!

گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو!

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو!

میں نو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو!

اگرچہ بحر کی موجوں میں ہے مقام اس کا
صفائے پاکی طینت سے ہے گہر کا وضو

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہ شاعر رنگیں نوا میں ہے جادو!

① اس غزل کے بیشتر اشعار میں عملاً گذشتہ دو غزلوں سے بڑی حد تک ہم آہنگ جو اپنی ہیئت اور مواد کے اعتبار سے ساقی نامے سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ اس غزل کے مطلع میں کہ پالنے والے کے حسب ارشاد من و تو کا فرق مٹا دیا ہے۔ یعنی خدائے ذوالجلال کے علاوہ اور کوئی فرد نہیں ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا عبادت کے لائق اور کوئی فرد نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا عبادت کے لائق اور کوئی فرد نہیں ہے اور اسی کے سبب میں اور تو کا فرق مٹا کر کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا گیا۔

② اس شعر میں کہا گیا ہے کہ مجھے نہ تو شعر کی ضرورت ہے نہ شراب کی' نا ہی ساقی کی اور نا ہی ساز و نغمہ کی! اس کے برعکس میں تو پہاڑ کے دامن کا سکوت ندی کا کنارا اور اس پر اگے ہوئے خود رو لالے کے

پھولوں کا خواہاں ہوں کہ یہی وہ اشیاء ہیں جو میرے قلب و روح کے لئے باعث سکون و اطمینان ہو سکتی ہیں۔

③ یہاں اقبال" کا کہنا ہے کہ میں ایک ایسا درویش ہوں جس کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ آب حیات کے چشمے پر پہنچ کر بھی اس کا ایک قطرہ پینے سے بھی اجتناب کرتا ہے اور اس کے جملہ لوازمات سے بھی بیگانہ بن چکا ہے۔

④ اس عہد کم سواد میں تو میری محدود فکر سے پیدا ہونے والی روشنی کو ہی غنیمت سمجھ! کہ اس عہد کے "اہل صفا" تو علم و ہنر کی روشنی سے محروم و بیگانہ ہو چکے ہیں بالفاظ دگر یہ عہد شعور سے خالی ہو گیا ہے۔

⑤ علامہ اقبال اس شعر میں عشق الٰہی کے اس ابتدائی مرحلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جہاں ایک نیاز مند قربت خدا اور اس کے جلوے کی تمنا کر سکے اس لئے کہ ایسے میں چاہنے والے کی نگاہ بھی دل سے زیادہ مضطرب اور بے قرار ہوتی ہے جس پر قابو پانا محال ہو جاتا ہے۔ اس شعر میں اقبال نے عشق الٰہی کے ابتدائی ایام کی اضطرابی کیفیت کی جانب اشارہ کیا ہے۔

⑥ یہ درست ہے کہ موتی کا اصل مقام سمندر میں ہوتا ہے جہاں ہر لمحے اس کا واسطہ سمندر کے پانی سے ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی فطرت کی پاکیزگی ہی اسے مصفا بناتی ہے۔ اس شعر میں اقبال کا اشارہ اس حقیقت کی جانب ہے کہ انسان کو کتنا اچھا ماحول ملے کہیں اس کی فطرت میں موجود پاکیزگی ہی اس کی عظمت و صفا کا سبب بنتی ہے۔

⑦ یہ ایک خوبصورت اور باصلاحیت شاعر کی صلاحیتوں کا کمال ہے کہ جب وہ اپنے اشعار میں پھولوں کا ذکر کرتا ہے تو اس کے تخلیقی فیض کے سبب یہ پھول بھی زیادہ شاداب و خوش رنگ نظر آتے ہیں۔

## (10)

013

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی!

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی!

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو
میری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی!

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کار آشیاں بندی!

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آداب فرزندی؟

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی!

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی!

**معنی**: **دیر پیوندی**: دیر کے بعد ملنا۔ **الوندی**: الوند سے متعلق، الوند ایران کا ایک مشہور پہاڑ ہے۔
**مشاطگی**: بناؤ سنگار کرنا۔

① دیکھا جائے تو "بال جبریل" کی بیشتر غزلیں مسلسل ہیں جو عملی سطح پر نظم سے زیادہ قریب ہیں۔ دراصل اقبال نے کم و بیش تمام تخلیقات میں فکر کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ انہوں نے اپنے مافی الضمیر کو شعری جملہ اصناف میں حسب ضرورت پیش کیا ہے جن میں قدر مشترک فکر ہی ہے۔ اس مسلسل غزل

میں بھی یہی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے مطلع میں اقبال نے کہا ہے کہ عشق حبیب میں سوز و درد ایسے عوامل ہیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ ناممکنات سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے وجود کی انفرادیت کے مقابلے میں آقائیت کی بے نیازی کا سودا کرنے کے لئے تیار نہ ہو سکوں گا۔

② اس شعر میں اقبال خداوند تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ ہم انسان اپنے وجود میں آزاد کیسے ہوئے جب کہ زندگی میں تو ہم پر فناء ہونے کی پابندی عائد کی گئی ہے اور موت کے بعد دوبارہ جینا بھی ممکن نہیں ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انسان اپنی ذات میں خود مختار کیسے ہوا جب کہ اسے اپنی مرضی سے نہ تو مرنے کا اختیار ہے نا ہی بعد از فنا دوبارہ زندہ ہونے کی استطاعت رکھتا ہے۔

③ وادئ محبت میں سرگردانی تو چاہنے والے کا مقدر ہوتی ہے تاہم یہ ضرورت ہے کہ محبوب کا پردے میں رہنا اس کے جذبات کے لئے (یعنی عاشق کے لئے) اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے کہ محبوب جب تا دیر پردے میں رہے تو سوز عشق میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دگر ہجر کی گھڑیاں عاشق کے لئے اضطراب کا سبب بن جاتی ہیں۔

④ اس شعر میں شاہیں کا استعارہ شاعر نے بلند حوصلہ اور جراءت مند لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے کہ جس طرح شاہیں اپنا گھونسلہ بنانے کو ذلت تصور کرتا ہے اس کے برعکس وہ آزادانہ پرواز کے ساتھ پہاڑوں اور جنگلوں میں بسیرا کرتا ہے اسی طرح مردان حر کو بھی کسی خاص مکان کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہاں اپنا سر چھپا کر بیٹھ جائیں بلکہ وہ جدوجہد کے ذریعے اپنا مستقبل استوار کرتے ہیں۔

⑤ حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے پدر بزرگوار حضرت ابراہیمؑ کے خواب کی تکمیل کے لئے جس طرح خود کو قربانی کے لئے پیش کیا ان کا یہ کردار کسی مدرسے کی تعلیمات کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس میں حضرت ابراہیمؑ کی تربیت کا پوری طرح سے عمل دخل تھا۔ اقبال کے مطابق نیک اور فرمانبردار اولاد کا ایسا ہی کردار ہونا چاہئے جیسا کہ حضرت اسمٰعیلؑ کا تھا۔ ان کی فرمانبرداری اور جذبہء قربانی ایک ایسی مثالی حیثیت کے حامل ہیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

⑥ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ موت کے بعد میری لحد مستحکم ارادہ رکھنے والے اور حوصلہ مند لوگوں کے لئے زیارت گاہ کی حیثیت اختیار کر لے گی کہ میری تعلیمات نے تو راستے کی خاک پر بھی قدرت الٰہی کے راز افشاء کر دیئے۔ اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ایک آدمی کو بھی معرفت الٰہی سے آشنا کر کے نظام اسلام کو تقویت بخشی ہے۔

⑦ فطری حسن کو کسی بناوٹ اور سنگھار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس طرح قدرت نے لالے کے پھول کو ایک فطری سرخ رنگ عطا کیا ہے اسی طرح سے سچائی کے اظہار میں کسی ملمع سازی کی حاجت نہیں ہوتی۔

014

(11)

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ  وہ ادب گہ محبت! وہ نگہ کا تازیانہ!

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراش آزرانہ!

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے! نہ قفس نہ آشیانہ!

رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ!

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے!
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ!

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ!

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ!

اگر یہ کہنے کی جسارت کی جائے کہ علامہ اقبال کی اس غزل کے بیشتر اشعار نسبتاً کمزور ہیں تو بے جا نہیں ہو گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس غزل میں جو دو تین اچھے اور ان کے معیار کے اشعار ہیں ان کی خاطر علامہ نے باقی اشعار کہے ہیں۔ یہاں یہ نشاندہی بھی شاید غیر ضروری نہ ہو کہ "باقیاتِ اقبال" ایک ضخیم مجموعے کی شکل میں علامہ کی وفات کے کافی عرصے بعد مولانا عبداللہ قریشی نے مرتب کر کے شائع کرائی۔ اس مجموعے میں علامہ کا ایسا کلام شامل ہے جو انہوں نے بوجوہ مسترد کر دیا تھا۔

تاہم "باقیاتِ اقبال" کے مطالعے کے بعد اس امر پر قدرے حیرت ہوتی ہے کہ اس میں شامل متعدد تخلیقات کو علامہ اقبال نے کس بناء پر مسترد کر دیا تھا جب کہ اپنے معیار اور اسلوب کے حوالے سے یہ تخلیقات زیرِ گفتگو غزل سے کہیں بہتر ہیں۔ ان جملہ ہائے معترضہ سے اقبالؒ پر کسی نوعیت کی تنقید مقصود نہیں بلکہ محض ایک صورتِ حال کی نشاندہی ہے۔

① اسی غزل کے مطلع میں اقبالؒ اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ کیا تجھے وہ زمانہ یاد نہیں جب پہلے پہل میرا دل تیری جانب ملتفت ہوا تو ہم دونوں کے رویے ایک دوسرے کے جذبات سے ہم آہنگ تھے لیکن اس ادب گہ محبت میں مجھ پر تیری نگاہ کسی تازیانے سے کم نہ تھی۔

② اس شعر میں اقبالؒ نے عہد کی درس گاہوں سے فارغ التحصیل ہونے والے افراد کی ذہنی صلاحیت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ یہ بے شعور لوگ کسی بت کی مانند ساکت و بے حس ہیں۔ نہ تو ان میں کافروں کی سی خصوصیات ہیں نا ہی ان کی تراش خراش میں آزر کی سی ہنر مندی کا کوئی شائبہ دکھائی دیتا ہے بالفاظ دگر مذکورہ قسم کی افراد کی تربیت میں کوئی صلاحیت نہیں محسوس ہوتی۔

③ یہ ماحول کتنا ہی آزاد روی کا حامل ہو لیکن عملاً اس میں کہیں بھی کشادگی اور فراغت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ عجیب جہان ہے جس میں نہ قید خانے کا پتہ چلتا ہے نا ہی آشیانے کا وجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا جو ماحول ہے اس پر گھٹن کی ایسی فضا محیط ہے جہاں اضطراب اور بے چینی کے سوا کچھ نہیں۔

④ اس شعر کے لغوی معنی سے قطع نظر اقبال مالکِ حقیقی سے ملتمس ہیں کہ ہماری تہذیب تباہی و بربادی کے آخری مراحل میں داخل ہو چکی۔ مولا! اب تیرا ہی لطف و کرم اس کی بقا اور تعمیر کا سبب بن سکتا ہے۔

⑤ میں نے جو عشق و محبت کے نغمے الاپے تو میرے ہمراہیوں نے یہ سمجھا کہ جس طرح موسمِ بہار میں مرغانِ چمن مست ہو کر اپنی اپنی لے میں گاتے ہیں میرے یہ اشعار بھی شاید موسمِ بہار کے اثرات سے ہم آہنگ ہیں۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ یہ لوگ عشق و محبت کے نغموں میں جو سوز و کرب پوشیدہ ہوتا ہے اس سے قطعی واقف نہیں۔

⑤ خداوندا! یوں لگتا ہے کہ تو نے انہی لوگوں کے خاک و خون سے بطور انعام اس جہان کی تخلیق کی

ہے اس لئے کہ شہادت اور قربانی کا صلہ حیات جاوداں ہی تو ہے۔
⑦ مولائے کریم! میں جس بے نیازی کے ساتھ شب و روز گزار رہا ہوں یہ عمل تیرے لطف کرم کے سبب ہی تو ہے یہی وجہ ہے کہ نہ تو مجھے دوستوں سے کسی قسم کا گلہ ہے اور نا ہی زمانے کا شاکی ہوں۔

## (12) 015

ضمیر لالہ مئے لعل سے ہوا لب ریز
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز!
بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارث پرویز!
پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز!
کسے خبر ہے کہ ہنگامہ نشور ہے کیا
تری نگاہ کی گردش ہے میری رستاخیز!
نہ چھین لذت آہ سحرگہی مجھ سے
نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز!
دل غمیں کے موافق نہیں ہے موسم گل
صدائے مرغ چمن ہے بہت نشاط انگیز!
حدیث بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز'
زمانہ با تو نسازد' تو بازمانہ ستیز!

**معنی:** ہنگامہ نشور: قیامت کا شور۔

① اس غزل کے مطلع میں اقبالؒ کہتے ہیں کہ میں تو ایک ایسے لالے کے پھول کے مانند ہوں جس کا ضمیر شراب سرخ سے لبریز ہو چکا ہے۔ بالفاظ دگر ایک عام فرد تو ہر جائز و ناجائز شے کو قبول کر لیتا ہے لیکن وہ لوگ جو مذہب کا لبادہ اوڑھے ہوئے ان کو کیا ہو گیا ہے کہ چشم زدن میں ہی اپنے مفادات کی خاطر مذہبی اصولوں کی نفی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

② عشق الٰہی اتنی بڑی قوت ہے کہ جب وہ کسی فرد کے دل میں گھر کر لیتا ہے تو لاچار و نامراد ہونے کے باوجود تخت شاہی کا مالک بن جاتا ہے یعنی عشق الٰہی کے طفیل ایک بے سروسامان فرد بھی انتہائی ارفع اور بلند مدارج پر پہنچ جاتا ہے۔

③ اس شعر میں اقبالؒ اپنے رب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے مالک دو سرا تیری پوری کائنات اور اس کا نظام بوسیدہ اور پرانا ہو چکا ہے۔ میں تو ایک ایسی کائنات اور نظام کا خواہاں ہوں جو نیا اور منفرد ہو جس میں تازگی بھی ہو اور شگفتگی بھی ہو!۔

④ قیامت کا حشر کیا چیز ہے اس کی ہیئت اور نوعیت کیا ہے؟ یہ تو ایک سوالیہ نشان کے مانند ہے جس کا جواب اس لئے ممکن نہیں کہ قیامت کی حقیقت سے تو اسی وقت کوئی آشنا ہو سکتا ہے جب وہ اسے اپنی آنکھ سے دیکھ لے۔ میرے لئے تو اے محبوب تیری نگاہ التفات اور لطف عنایات سے محرومی کا عمل ہی قیامت سے کم نہیں ہے یعنی میں تو اس صورت حال کو ہی قیامت تصور کرتا ہوں۔

⑤ خداوند ذوالجلال علی الصبح مجھے تجھ سے آہ و فریاد میں جو لطف حاصل ہوتا ہے مجھے تو وہی کافی ہے۔ اپنے تغافل میں لطف و کرم کی آمیزش نہ کر کہ یہ میرے جذبہ عشق سے مطابقت نہیں رکھتی۔

⑥ موسم بہار میرے دل رنجور کو راس نہیں آتا کہ یہ ماحول میری فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا ہر اس موسم میں خوشنما اور خوش نوا پرندوں کی صدائیں بڑی کیف آور ہوتی ہیں تاہم میرے دل

رنجور کو یہ بھی پسند نہیں۔

⑦ معاشرے اور ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لیتا ہے علم اور حقیقت سے بے خبر لوگوں تک ممکن ہے قابل قبول ہو لیکن جو لوگ باشعور اور حقیقت شناس ہیں وہ ناساعد حالات میں بھی معاشرتی انتشار کے خلاف بڑی جراءت مندی کے ساتھ سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔

## (13) 016

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی! ـــ میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی!
میں کہاں ہوں تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کو لامکاں ہے؟ ـــ یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی؟
اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں ـــ کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی!
وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں ـــ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی
نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں ـــ کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی!
نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا ـــ یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی!
کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے ـــ کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

① قادر مطلق سے خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں اتنا بڑا تخلیق کار ہونے کے باوجود میں اب بھی اسی طرح کم نصیب ہوں جس طرح کہ تو ہر معاملے سے بے نیاز ہے۔ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شعر گوئی میں میں نے جو کمال حاصل کیا تھا وہ عملاً میرے لئے بیکار ثابت ہوا۔

② خدایا یہ تو بتا کہ میں کس مقام پر ہوں اور تو کس مقام پر ہے اور جس جگہ میرا قیام ہے وہ مکان ہے کہ لامکان! یہ حقیقت بھی ایک راز سربستہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ عالم امکان میرے اپنے تخیل کا پیدا کردہ ہے یا اسے تیری کرشمہ سازی نے تخلیق کیا ہے؟ مطلب یہ کہ انسان کو ابھی تک حقیقت ابدی کا سراغ نہیں مل سکا۔

③ میری زندگی کی بیشتر راتیں تذبذب اور ذہنی کشمکش کا شکار رہیں کبھی مولانا رومی کے سوز و ساز سے دل ہم آہنگ ہوا اور کبھی اس پر امام رازی کی فلسفیانہ موشگافیاں مسلط رہیں۔

④ اس شعر میں علامہؒ نے شاہین اور کرگس کی علامتوں کے ذریعے قوم کے نونہالوں کی جانب اشارہ کیا ہے کہ وہ جس بزدلانہ اور منافقانہ ماحول میں پرورش پا رہے ہیں ان سے جراءت مندی اور انقلاب پسندی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ اس کی توجیہ کچھ یوں بھی ہوتی ہے جو قوم کے جو نونہال انگریز کی غلامی اور ان کی تقلید کو ہی شرف قبولیت دے چکے ہیں ان سے ایسے نظام اور اقدار سے بغاوت کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟ وہ تو اس حقیقت سے بھی بے خبر ہیں کہ آزاد اور حوصلہ مند نوجوانوں کی فطرت کیا ہونی چاہیے؟

⑤ اس غزل کے بیشتر اشعار میں اقبال اپنے عہد کے مسلمانوں کے انحطاط و انتشار کے پیش نظر یاسیت سے دوچار نظر آتے ہیں تاہم کہیں کہیں ایسی توقعات کی جانب اشارہ بھی کر جاتے ہیں جو رجائیت کی آئینہ دار ہیں۔ اس شعر میں انہوں نے عہد کے تخلیقی عمل کو بے معنی قرار دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ

اس میں تاثر ناپید ہے ساتھ ہی اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ قوم کو کوئی پر لطف اور دلکشا نغمہ ملے جو خواہ فارسی زبان میں ہو یا عربی میں! اس کے لئے زبان کی کوئی قید نہیں!

⑥ اس شعر میں درویشی اور بادشاہی کے حوالے سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بظاہر وہ دونوں میں کوئی امتیاز اور فرق محسوس نہیں ہوتا۔ درویش اپنے افکار و خیالات کے ذریعے اور بادشاہ تلوار کے ذریعے لوگوں پر حکومت کرتا ہے عملاً دونوں کا کردار یکساں طرز کا ہے۔

⑦ یہ شعر ہر چند کہ چھ سات دہائی قبل کہا گیا ہے اس کے باوجود مسلمانان عالم بالخصوص ہمارے اپنے ملک میں کم و بیش نصف صدی سے جو صورت حال رہی ہے اس کی غمازی کرتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ کیفیت یہ ہے کہ ہر شخص انتشار و بے یقینی کا شکار ہو کر اپنا اپنا راگ الاپ رہا ہے۔ کسی کو اجتماعی مفاد سے واسطہ نہیں۔ اس کی قطعی وجہ یہی ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں اقتدار ہے اور جسے قافلہ سالاری کے فرائض انجام دینے چاہئیں وہی اپنی بے عملی اور ذاتی مفاد کے سبب قوم کی رہنمائی کا حامل نہیں ہے۔ ایسے شخص کا قول و فعل اور کردار دوسروں کو کس طرح متاثر کر سکتا ہے جو ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ شعر آج کی صورت حال کی پوری طرح تصویر کشی کرتا ہے۔

017

## (14)

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں!

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

کہہ گئیں رازِ محبت پردہ دارہائے شوق!
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں!

معنی: ردائے نیلگوں: نیلی چادر۔

① اس غزل میں اقبال اپنے فکری موضوعات کو مخصوص انداز میں بیان کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ مطلع کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ اپنی کارکردگی اور جدوجہد کو میں صرف زمیں تک محدود سمجھا تھا یہاں تک کہ پانی اور مٹی کے مابین جو ربط ہے وہی میری کائنات تھی۔ بالفاظ دگر میں نے ایک خاص سطح سے بڑھ کر بلندی تک دیکھنے کی زحمت نہ کی۔

② میری نگاہوں کا طلسم اس لمحے ٹوٹ کر رہ گیا جب تو نے حجاب سے باہر آکر اپنا جلوہ دکھایا ورنہ صورت حال یہ تھی کہ فضاء میں جو نیلے بادل ہیں ان کو ہی میں نے آسماں سمجھ لیا تھا تیرے جلوے کے پرتو سے مجھ پر حقیقت منکشف ہوئی۔

③ سورج، چاند اور ستاروں کو میں نے اپنا سفر جانا تاکہ عروج کی منازل طے کر سکوں لیکن میرے یہ سفر راہ کے پیچ و خم میں تھک کر رہ گئے اور یوں میں تنہا ہو کر رہ گیا۔

④ عشق ہی وہ قوت تھی جس کے ایک لمحے نے ہی مجھ پر ساری حقیقت کھول کر رکھ دی ورنہ قبل

ازیں اپنی کم علمی کے سبب زمیں اور آسماں کو لاانتہا اور وسیع تر سمجھ رہا تھا یعنی عشق ہی وہ قوت ہے جو شعورِ ذات اور شعورِ کائنات سے روشناس کراتی ہے۔

⑤ ہوائیوں کہ شوق کی پردہ داری نے ہی رازِ محبت فاش کر دیا اور جس کیفیت کو میں نے ضبطِ فغاں کا نام دیا رازِ محبت فاش ہونے کے بعد پتہ چلا کہ ضبطِ فغاں بھی عملاً فغاں بن گئی۔

⑥ فی الواقعہ وہ کسی درماندہ مسافر کی صدائے دردناک تھی جسے اپنی بے خبری سے میں نے قافلے کے کوچ کے اعلان کی آواز سمجھ لیا تھا۔

018

## (15)

اک دانش نورانی' اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی!

اس پیکر خاکی میں اک شے ہے' سو وہ تیری
میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی!

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی!

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی!

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی!

تیرے بھی صنم خانے' میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی' دونوں کے صنم فانی!

**معنی: دانش نورانی:** اس سے وہ عقل مراد ہے۔ جو انسان کے دل و دماغ کو منور کر دے۔ اور اسے حقیقتوں کو پہچاننے کے قابل بنا دے۔ یہ عقل نورِ ایمان اور نورِ یقین کے مترادف ہے۔ **دانش برہانی:** وہ عقل جس میں فلسفیانہ دلیلوں سے کام لیا جائے یہ یقینی طور پر حقیقتوں تک نہیں پہنچاتی اور عموماً دلیلوں ہی کے اندھیرے میں چکر لگاتی رہتی ہے۔

① اس غزل کے مطلع میں اقبالؒ نے دانش نورانی اور دانش برہانی کے مابین فرق کو واضح کیا ہے۔ ان کے مطابق ایک دانش تو وہ ہوتی ہے جو نورِ ایمان اور نورِ یقین کے امتزاج سے جنم لیتی ہے اور قلب و روح کو منور کر دیتی ہے اس کے برعکس دانش برہانی کا تعلق تعقل اور استدلال سے ہے جس سے حقائق تک رسائی مشکل ہوتی ہے۔ اور دلائل کی بھول بھلیاں ہی میں گردش کرتی رہتی ہے اس سے انسان کے تجسس میں تو اضافہ ضرور ہوتا ہے لیکن یہ کسی بنیادی نتیجے پر پہنچنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتی۔

② انسانی جسم میں ایک ایسی شے ہے جو تیری نذر کے قابل ہے اور وہ شے روح ہے یہی سبب ہے کہ میرے لئے اس کا تحفظ ممکن نہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس شعر کی تشریح میں اس شے کو دل سے تعبیر کیا لیکن میرے نزدیک یہ تشریح مناسب نہیں کہ اقبالؒ نے واضح طور پر ایک ایسا اشارہ دیا ہے جو دل کی نسبت روح کو زیادہ بہتر طور پر نمایاں کرتا ہے۔ شعر کچھ اس طرح سے ہے کہ۔

اس پیکر خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری
میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی

علامہ نے پہلے مصرعے میں پیکرِ خاکی کا ذکر کرتے ہوئے جس شے کا حوالہ دیا ہے وہ روح کے سوا اور دوسری کوئی چیز نہیں ہو سکتی جو کسی مرحلے پر بھی انسان کے قبضۂ قدرت میں نہیں۔ مزید یہ کہ بے شک

خداوند تعالیٰ ہر شے کا خالق اور اس پر قابض ہے تاہم دل تو ایک مادی شے ہے جو اس وقت تک برقرار رہتا ہے جب کہ جسم زندہ ہے لیکن روح فنا ہوتی ہے تو جسم کے ساتھ دل بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ آخری بات یہ کہ خداوند قدوس کا رابطہ مادہ سے کہیں زیادہ روح کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان فنا ہو جائے تو دل اور جسم تو یہیں دنیا میں رہ جاتے ہیں جب کہ روح عالم بالا کو پرواز کر جاتی ہے۔

③ میری آہ و فریاد اب اگر ستاروں تک جا پہنچی ہے تو یہ تو ایک فطری امر ہے۔ اس میں میرا کیا قصور ہو سکتا ہے جب کہ شعر کے ذریعے اظہار کا جوہر تو اے خدا خود تو نے ہی مجھے عطا کیا ہے۔

④ انسان جس طرح سے فنا و بقا کے مراحل سے گزرتے ہیں اس سے تو اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی وجود ایک نقش باطل کی طرح تھا جب چاہا اسے تیرے قبضۂ قدرت نے ختم کر ڈالا لیکن یہ تو بتا کہ انسان جس کو تو نے خود تخلیق کیا اور فرشتوں سے بھی افضل قرار دیا پھر اس آسانی سے اس کو فنا کرنے اور اس کی ناقدری کیا خود تیرے لئے باعث مسرت ہے۔

⑤ تسلیم کہ مغرب کی تعلیم و تہذیب نے مجھے تو مذہب سے لاتعلق کر دیا لیکن اس عہد کے ملا پر تو مغربی تہذیب و علوم کا سایہ تک نہیں پڑا پھر کیا وجہ ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ مذہب سے لاتعلق ہے بلکہ اس کے لئے باعث ننگ ہو کر رہ گیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ملا بالعموم اپنے مفادات کے لئے اسلام کی غلط تاویلیں کر کے عام لوگوں کو اس سے منحرف کر رہے ہیں۔

⑥ وہ احمق لوگ ہیں جو انسان کو تقدیر کا پابند سمجھتے ہیں جب کہ وہ تقدیر کے خلاف جدوجہد کی قوت بھی رکھتا ہے اور واقع یہ ہے کہ انسان نے اپنی بے ہمتی اور بے عملی کے سبب کسی بھی معاملے کو تقدیر کا نام دے دیا ہے حالانکہ خدا نے انسان کو وہ قوت بھی عطا کی ہے جو ناساعد حالات کو اپنی مرضی کے مطابق بدل ڈالے۔ اقبال کا ایک اور شعر اس معاملے کی یوں تصویر کشی کرتا ہے۔

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے شمشیر و سناں اول' طاؤس و رباب آخر

ایک دوسرا شعر بھی اس ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبال کا مندرجہ بالا شعر خاصی گہرائی کا حامل ہے۔ وہ ایسے افراد کی نشاندہی کرتے ہیں جو اپنے تساہل اور بے عملی کے سبب ہر مصیبت کو ہی تقدیر کے پلڑے میں ڈال دیتے ہیں۔ جب کہ ہمت و جراءت عمل اور جدوجہد کے ذریعے انسان کم و بیش ہر مشکل پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

⑦ یہ شعر قدرے الجھا ہوا ہے اور اس کی تشریح یوں تو ایک سے زیادہ ہو سکتی ہے تاہم صحیح تشریح کے لئے خاصی تگ و دو کی ضرورت ہے چونکہ اس غزل کے باقی اشعار میں اقبال' خدائے ذوالجلال سے مخاطب ہیں لہٰذا شعر کے مطابق یہ کہنا غلط ہو گا کہ جس طرح انسان کے بنائے ہوئے بت مٹی کے ہیں اسی طرح خدا نے بھی جو بت بنائے ہیں وہ مٹی کے ہیں اور ہر دو طرح کے بت فنا ہو جانے والے ہیں۔ یہ تصور بھی بے معنی ہے لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ اس شعر میں اقبال کا مخاطب خدا نہیں بلکہ اور کوئی ہے اور وہ کون ہے یہ امر ایک سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔

019

## (16)

یا رب! یہ جہانِ گزراں خوب ہے لیکن — کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنر مند؟
گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ — دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند!
تو برگِ گیاہے ندہی اہلِ خرد را — او کشتِ گل و لالہ بہ بخشد بخرے چند!
حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں — مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند!
احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسر — تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند!
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا — افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند!
مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر — کر دے اسے اب چاند کی غاروں میں نظر بند!
فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی! — خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند!
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش — خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند!
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش — میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند!
پُر سوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار — آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خور سند!
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم — کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند!
چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ — کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند!

**معنی:** **موعظہ:** وعظ، نصیحت۔ **پاژند:** ژند کی تفسیر۔ پارسیوں کے عقیدے کے مطابق ژند وہ کتاب تھی جو ان کے پیغمبر و رہبر زرتشت پر اتری۔ **قریہ:** گاؤں، بستی۔ **دماوند:** ایران کا ایک مشہور پہاڑ۔ **اسپند:** ہرمل، وہ کالا دانہ جو نظرِ بد کا اثر دور کرنے کے لئے جلا دیا جاتا ہے اور آگ پر پڑتے ہی تڑخ کر پھٹ جاتا ہے۔ شاعر تڑخ کی آواز کو سپند کا نالہ یا فریاد کہتے ہیں۔

① بنیادی طور پر "بالِ جبریل" کی یہ تخلیق غزل نہیں بلکہ اقبال کے مخصوص اسلوب کی نظم ہے اس کے ابتدائی شعر میں علامہ اس کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ یہ دنیا اپنی جگہ خوبصورت اور خوشنما سہی لیکن یہ کیا وجہ ہے کہ یہاں جو صاف دل اور باکمال ہنرمند موجود ہیں ان کی تذلیل کس لئے ہوتی ہے اور انہیں نچلی سطح کا فرد کیوں سمجھا جاتا ہے؟ یہ سوال اس شعر میں اقبال نے خدا کو مخاطب کر کے اٹھایا ہے۔

② دوسرے شعر میں اسی موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ ہر چند اس دنیا پر سرمایہ دار طبقے کا تسلط اور اجارہ داری قائم ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے لوگ انگریز کو بھی اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔

③ نظم کا یہ شعر فارسی زبان میں کہا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس شعر میں جو مضمون باندھا گیا ہے اس کے اظہار کے لئے شاعر نے فارسی زبان کو زیادہ مناسب سمجھا ہے چنانچہ یہاں بھی اقبال خدا سے گلہ مند ہے کہ بظاہر تو باکمال اور اہلِ دانش افراد کو گھاس کی ایک پتی سے بھی نہیں نوازتا جب کہ ہندوستان پر

مسلط انگریز نے انتہائی احمق اور نالائق افراد کو انتہائی عروج پر چڑھا رکھا ہے۔

④ یہ شعر بھی فارسی زبان میں کہا گیا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ عیسائیوں کے کلیساؤں میں تو شراب و کباب فراہم کئے جاتے ہیں جب کہ اسلامیات عالم کی مساجد میں خشک قسم کے وعظ و پند اور نصیحتوں کے سوا اور کیا رکھا ہے بالفاظ دیگر ان مساجد میں عام مسلمان کی دلچسپی کا تو کوئی سامان موجود نہیں اس لئے ان کے ہاں گریز کی کیفیت ملتی ہے۔

⑤ اے رب حقیقی اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ تیرے تمام احکام برحق ہیں تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے مفسرین نے قرآنی آیات کو بھی بے جا تاویلات اور پیچیدہ مفاہیم سے ان کے معانی اور مطالب کو بے معنی اور غیر فطری مباحث میں الجھا کر ان کی حیثیت ہی بدل دی ہے۔ بالفاظ دگر ان مفسرین نے قرآن کریم کو بھی "پاژند" بنا کر رکھ دیا ہے۔ واضح رہے کہ پاژند وہ کتاب ہے جو پارسیوں کے پیغمبر حضرت زرتشتؑ پر نازل ہونے والے صحیفہ "ژند" کی تفسیر ہے اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے اصل متن کے معانی و مطالب کو بدل کر رکھ دیا گیا ہے۔ عملاً اقبال قرآن کے بیشتر مفسرین سے غیر مطمئن اور ناخوش نظر آتے ہیں۔ ان کے متعدد اشعار اس کا ثبوت ہیں۔

⑥ یا رب! تو نے اپنے فرمانبردار اور اطاعت شعار بندوں سے بعد وفات جو بہشت عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے وہ برحق! تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ بہشت کو آج تک کسی نے بھی نہیں دیکھا جب کہ افرنگیوں کا ہر قصبہ و شہر بہشت کی مانند آراستہ ہے اور جو لوگ محض ظاہری خوبصورتی کے قائل ہیں وہ ان سے متاثر کیوں نہیں ہوں گے؟۔

⑦ میری سوچ اور فکر ایک عرصے سے انتشار کا شکار ہے۔ ان کی وسعت اور بلندیوں کو کسی نے بھی قبول نہیں کیا نا ہی ان سے استفادہ کیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تو اب میرے خیالات کو چاند کے غاروں میں مقفل کر دے۔

⑧ اسی حوالے سے اقبال اپنے افکار کے بارے میں یوں گویا ہیں کہ فطرت نے مجھے وہ جوہر عطا کئے ہیں جو فرشتوں میں ہوتے ہیں حالانکہ میری تخلیق تو خاک سے ہوئی اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ میرا اس خاکی دنیا سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔

⑨ میں تو ایسا درویش ہوں جس کا تعلق نہ مشرق سے ہے نا ہی مغرب سے! اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میرا وطن نہ تو دلی ہے نہ اصفہان اور نا ہی سمرقند ہے بلکہ تیرے عشق نے مجھے ساری دنیا سے بے تعلق کر کے رکھ دیا ہے۔

⑩ خدایا! میں تو سیدھی سچی اور کھری بات کرنے کا عادی ہوں۔ وہی میرا قول ہوتا ہے جسے حق پر مبنی سمجھتا ہوں۔ یہی سبب ہے کہ نہ تو میں ایسا جلساز ہوں جس نے مسجد کو اپنی پناہ گاہ بنا رکھا ہو نا ہی جدید تہذیب کی مکاریوں اور منافقتوں کا قائل ہوں۔ مطلب یہ کہ نا تو ملا کی طرح سے رجعت پسند ہوں نا ہی جدید تہذیب کا حامی کار اور اندھا مقلد ہوں۔

(11) یہی سبب ہے کہ میری حق گوئی کے سبب اپنے بھی مجھ سے خفا ہیں اور بیگانے لوگ بھی ناخوش ہیں کہ میں زہر کو زہر ہی اور قند کو قند ہی کہنے کا قائل ہوں یعنی ریاکاری اور منافقت کسی مرحلے پر بھی میرے قریب سے نہیں گزری۔

(12) ایک ایسے سچے اور حقیقت پسند انسان کے لئے یہ امر ناممکنات میں سے ہے کہ وہ خس و خاشاک کے ڈھیر کو دماوند پہاڑ سے تشبیہ دے یعنی حقیقت سے روگردانی کرے اس طرح کے کھلے جھوٹ اور فریب کا میں روادار نہیں ہو سکتا۔

(13) جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کی آگ میں بھی خود کو ثابت قدم رکھا تھا۔ یہی کیفیت میری ہے کہ زمانے کی ابتلاؤں کا بھی بڑے عزم و استقلال سے مقابلہ کر رہا ہوں اس لئے کہ میں بندۂ مومن ہوں وہ کالا دانہ نہیں جسے کمزور عقیدہ خواتین ٹونے ٹوٹکے کے لئے آگ میں پھینکتی ہیں اور وہ بلا تاخیر چٹخ جاتا ہے۔ میں تو ایسا پیکر استقامت ہوں جو ہر چھوٹی بڑی مصیبت کو برداشت کرنے کا اہل ہوتا ہے۔

(14) میرا کردار یہ ہوتا ہے کو دل سوز و گداز سے لبریز ہے۔ انسان کی خوبیاں دیکھتا ہوں عیب تلاش نہیں کرتا نا ہی کسی کے لئے باعث آزار ہوں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اپنی تمام انا کے باوجود آزاد بھی ہوں اور خود کو پابند قفس بھی محسوس کرتا ہوں اور مال و زر سے محرومی کے باوجود مطمئن اور مسرور ہوں۔

(15) کتنی ہی مشکلات و مصائب ہوں میرا دل تو ہر حال میں مطمئن و مسرور رہتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ کوئی کلی کے لبوں سے مسکراہٹ نہیں چھین سکتا کہ یہ تو اس کی فطری صلاحیت کی مظہر ہے۔

(16) نظم کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ یزداں کے حضور میں بھی میں خاموش نہ رہ سکا بلکہ بڑی بے باکی اور صاف گوئی کے ساتھ اپنی معروضات پیش کر دیں۔ اس جسارت کو بے شک گستاخی پر محمول کیا جائے اور اس کے لئے جو سزا تجویز کی جائے وہ بصد احترام قبول! لیکن یہ بھی تو طرز وفاداری ہے کہ محبوب کے روبرو دل کھول کر رکھ دیا جائے۔ اس پوری نظم میں علامہ نے خداوند ذوالجلال کی بارگاہ میں کچھ معروضات بھی کی ہیں۔ گلے شکوے بھی کیے ہیں۔ اپنی کیفیت قلبی بھی بیان کی ہے۔ اپنے عہد اور کائنات کے معاملات پر بھی گفتگو کی ہے۔ مجموعی طور پر بہرحال بلا عنوان کے یہ ایک بھرپور نظم ہے۔ اگر وہ اس کا کوئی عنوان وضع کرتے تو وہ یقیناً یہی ہوتا کہ "خدا کے حضور میں!"

حصہ دوم




پیشکش:مجلس اقبال
نشر و توزیع:محمد اسلم باقر

020

## (1)

اعلیٰ حضرت شہید امیر المومنین نادر شاہ غازیؒ کے لطف و کرم سے نومبر 33ء میں مصنف کو حکیم سنائی غزنویؒ کے مزار مقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ چند افکار پریشاں جن میں حکیم ہی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی کی گئی ہے۔ اس روز سعید کی یادگار میں سپرد قلم کیے گئے۔ 'ما از پے سنائی و عطار آمدیم'

*

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا!

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا!

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا!

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ!

*

021

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاک قیصر و کسریٰ

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ!

حضور حق میں اسرافیلؑ نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا!

ندا آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے
'گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!'

لباب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا!

*

022

غلامی کیا ہے؟ ذوق حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا!

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا!

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختی خارا!

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا!

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا!

محبت خویشتن بینی محبت خویشتن داری
محبت آستان قیصر و کسریٰ سے بے پروا!

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
'کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را'

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ!
سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا!



**معنی: حلاج**: لفظی معنی دھنیا۔ جو شخصیت عام طور پر منصور کے نام سے معروف ہے اس کا نام حسین بن منصور تھا چونکہ اس کے والد کا پیشہ روئی دھنکنا تھا۔ اس وجہ سے وہ حلاج مشہور ہوا۔ منصور کو بھی بعض اوقات اسی نسبت سے حلاج کہتے ہیں۔ یہاں منصور مراد ہے۔ **استغنا**: بے پروائی' بے نیازی' سیر چشمی۔ **صہبا**: شراب۔ **گلیم**: گدڑی۔ **اویس**: حضرت اویسؓ قرنی۔ **ابوذر**: مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ جو اسلامی فقر کا ایک عجیب و غریب نمونہ تھے۔ **دلق**: خرقہ۔ **زہرا**: حضرت فاطمہؓ کا ایک لقب۔ **اسرافیل**: ایک فرشتہ جو قیامت کے دن صور پھونکے گا۔ **لا**: عربی زبان کا حرف نفی جو کلمہ طیبہ کا پہلا حرف ہے یہاں مراد ہے دہریت اور خدائی قانون کی نفی سے۔ **الا**: عربی زبان کا حرف استثناء مراد ہے الا اللہ سے یعنی ہستی باری تعالیٰ اور اس کے مقررہ حکموں کا اقرار نیز ان پر عمل۔ **تیز دستی**: لفظی معنی ہاتھ تیزی سے چلانا یعنی مشاق و ہنرمند ہونا۔ **موج تند جولاں**: زور شور سے اچھلنے والی لہر۔ **نہنگ**: مگرمچھ۔ **سبل**: سبیل کی جمع' راستے۔ **ختم الرسل**: رسولوں کا خاتم یعنی آخری رسول'

"بال جبریل" کی جو ترتیب ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں سے اس کے دوسرے حصے کا آغاز ہوا ہے۔ اس کی اولیں تخلیق اگرچہ غزل کی ہیئت میں ہے لیکن خود علامہ اقبال کے بقول یہ اشعار انہوں نے افغانستان کے مشہور بزرگ حکیم سنائی کے مزار اقدس کی زیارت اور ان کے ایک بلند پایہ فارسی قصیدے سے متاثر ہو کر کہے ہیں۔ علامہ کہتے ہیں کہ 1933ء میں والی افغانستان اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی دعوت پر ان کے علاوہ سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود بھی کابل تشریف لے گئے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ تینوں سرکردہ بزرگ افغانستان کے طلباء کے لئے نصابی کتب کی ترتیب کے سلسلے میں مقامی محکمہ تعلیم کی رہنمائی فرمائیں۔ تاریخی حقائق کے مطابق علامہ اقبال درہ خیبر' پشاور اور جلال آباد کے راستے کابل پہنچے پھر غزنی' ہرات اور قندھار کے راستے واپس آئے۔ موصوف نے اس سفر کی یادگار کے طور پر مشہور مثنوی "مسافر" لکھی جو بعد میں ایک دوسری نظم "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" میں شامل کی گئی۔ حکیم سنائی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ انتہائی عالم و فاضل بزرگ اور بلند پایہ شاعر بھی تھے تاہم ان کی تخلیقات زیادہ تر غزنی بادشاہوں کے دربار میں قصیدہ گوئی تک محدود تھیں۔

روایت ہے کہ سلطان بہرام غزنوی ہندوستان کی مہم پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تو حکیم سنائی قصیدہ تیار کر کے دربار میں سنانے کے لئے گھر سے برآمد ہوئے تو راہ میں انہیں ایک مجذوب جس کا نام "لائے خوار" تھا مل گیا۔ وہ بالعموم شراب خانوں سے تلچھٹ حاصل کر کے پیا کرتا تھا۔ جب حکیم سنائی پر اس کی نظر پڑی تو وہ شراب فروش سے کہنے لگا۔ "ایک پیالہ اسے بھی دے دینا کہ یہ شخص بے بصیرت ہے"۔ شراب فروش کو اس امر پر بڑا تعجب ہوا۔ اسی اثنا میں "لائے خوار" پھر گویا ہوا کہ "یہ شخص دو چار جھوٹ سچ جوڑ کر کسی صاحب ثروت شخص کو سنا دیتا ہے۔ ایسے لوگوں سے حاصل کردہ بخشش ہی اس کا ذریعہ معاش ہے۔ قیامت میں جب اس سے استفسار کیا جائے گا کہ توشہ آخرت کیا لایا ہے تو اس کے پاس کوئی

جواب نہ ہو گا"۔

کہا جاتا ہے کہ اس مجذوب کی اس بات نے حکیم سنائی پر دہشت کا عالم طاری کر دیا۔ ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور ایسی کایا پلٹی کہ دربار جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے بعد پابرہنہ حج کو گئے۔ واپسی پر عملاً گوشہ نشینی اختیار کر لی کبھی باہر نکلتے بھی تو ننگے پاؤں ہی نکلتے۔ ان کی ایک مشہور تصنیف کا نام حدیقہ ہے۔ علامہ اقبال ان کے قصائد سے بے حد متاثر تھے۔

① زیر تشریح نظم بھی انہوں نے حکیم سنائی کے ایک مشہور قصیدے سے متاثر ہو کر اسی اسلوب میں تخلیق کی ہے اس کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ میرے جذبۂ عشق میں اتنی شدت اور وسعت ہے کہ اگر اس کا احاطہ کیا جائے تو وہ صحرا کی لامحدود پہنائیوں میں بھی نہیں سما سکتا۔ وہ اس شعر میں اپنی اس جذباتی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں جو خود ان کے اپنے اندازے سے بھی کہیں زیادہ شدید ہے۔ جنون عشق میں روایتی سطح پر صحرا ہی پناہ گاہ ہو سکتا ہے لیکن اقبال کہتے ہیں کہ میرے لئے تو وسعت صحرا بھی ناکافی ہے۔

② کائنات کے جو رازہائے سربستہ ہیں وہ محض خودی کے توسط سے ہی منکشف ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ طلسم ٹوٹ جائے تو پھر ذات باری کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ توحید عملاً اسی حقیقت سے ہم آہنگ ہے جسے ابھی تک فی الواقع کوئی بھی سمجھ نہیں سکا۔

③ انسان عملاً اس حقیقت سے کلی طور پر غافل ہے کہ نور مطلق ہی دراصل فطرت کی حقیقی روح ہے۔ جس طرح دریا اپنی موجودگی کے بغیر محض ایک ٹھہرے ہوئے پانی کا ذخیرہ بن سکتا ہے۔ یہی کیفیت نور مطلق کے شعور کے بغیر انسان کی ہے اور بدقسمتی یہ کہ انسان ابھی تک اسی شعور سے بیگانہ ہے۔

④ وہ علمائے ظاہر جو علم و عرفاں سے بے بہرہ ہو کر انہیں اپنا رقیب سمجھے بیٹھے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ علم ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا اور ذات باری کا عرفان بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ظاہر بیں ملا ان سے کد رکھتے ہیں اور حسین بن منصور حلاج جیسے معرفت شناس صوفی کو اپنا رقیب سمجھے بیٹھے ہیں حالانکہ حسین بن منصور حلاج تو معرفت ذات باری میں اس حد تک جذب ہو گیا تھا کہ اپنی ذات کی نفی کر کے من و تو کے فرق کو مٹانے کی کوشش کی۔ علمائے ظاہر اس کی معرفت شناسی تک رسائی حاصل کرنے کی بجائے اس سے حسد کرنے لگے اور اپنا حریف سمجھ کر اسے پھانسی پر لٹکا دیا۔

⑤ اس شعر میں اقبال نے ایک ایسا اہم نکتہ بیان کیا ہے جو ہمیشہ سے زیادہ آج کی صورت حال میں زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اقتدار ہو یا محکومی دونوں حالتوں میں سچے اور نیک باطن لوگ حرص و ہوس سے بے نیاز رہ کر ہی انتشار و اضطراب اور دینی نوع کے مسائل سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں یعنی استغنا ایسا عمل ہے جو ہر حالت میں انسان کو تمام مسائل و آلام سے محفوظ رکھتا ہے۔

⑥ اس شعر میں اقبال فرشتوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ تم ہم ایسے عمل پسند اور عشق حقیقی میں سرشار لوگوں کی تقلید کیا کرو گے کہ تمہارے نزدیک تو ہر لحہ ذکر خداوندی، تسبیح خوانی اور عرش الہی کا طواف ہی کافی ہے۔ جب کہ عشق حقیقی کی راہیں بے حد کٹھن ہیں۔ اس حقیقت کا عرفان تمہیں ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

*

⑦ اس شعر سے زیر تشریح قصیدہ نما نظم کے دوسرے حصے کا آغاز ہوتا ہے جس میں اقبال کہتے ہیں کہ مشرق اور مغرب کے مابین جو تضاد ہے وہ بالکل واضح ہے۔ عملاً اس شعر میں وہ مشرقی اور مغربی تہذیب و علوم کا موازنہ یوں کرتے ہیں کہ یہ بد قسمتی ہے کہ مشرق میں بے پناہ علوم و فنون موجود ہیں لیکن ان کو وسعت دینے کی صلاحیت سے اہل مشرق محروم ہیں۔ اس کے مقابلے میں اہل مغرب اپنے علم و فن کو وسعت دینے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن ان علوم و فنون میں وہ روح نہیں جو انسان پر براہ راست اثرانداز ہوتی ہے۔ بالفاظ دگر مغربی تہذیب و علوم راہ حق دکھانے کی بجائے صرف مادی افادیت سے ہم کنار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بس۔

⑧ جن اہل حق اور جراءت مند انسانوں نے روم و ایران کی سلطنتوں اور تہذیب کو اپنی حق گوئی، بے باکی اور جراءت و شجاعت سے خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا اب وہ شخصیتیں نہ تو ایران میں باقی رہی ہیں نہ توران میں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مشرق کے اسلامی ملک اب ایسے صاحب کردار اور جانباز فرمانرواؤں سے محروم ہو چکے ہیں جن کی شان و شوکت اور دبدبہ ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ اب تو صورت حال یکسر بدل گئی ہے۔

⑨ اقبال عرب ممالک کی صورت حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ وہ ممالک تھے جنہیں کعبہ کا سردار کہا جاتا تھا لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ یہاں کے سرداروں نے ابوذر غفاری کی گدڑی، حضرت اویس قرنی کا خرقہ اور سیدہ فاطمۃؓ الزہرہ کی چادر تک بیچ کھائی ہے۔ اقبال کا مفہوم یہ ہے کہ عرب کے سردار غیرت و حمیت سے محروم ہو چکے ہیں اور انہوں نے اپنے باوقار اور صاحب کردار آباء و اجداد کا ترکہ بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔ وہ تمام اسلامی اور انسانی خصوصیات سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کے نزدیک تو عیاشی اور شکم پروری ہی سب کچھ ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ نچلی سے نچلی سطح تک جانے کو تیار ہیں۔

⑩ اس شعر میں علامہ حضرت اسرافیلؑ کے حوالے سے اپنی حق گوئی اور بے باکی کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ فرشتوں کو بھی اس امر کا خوف ہے کہ میری یہ صلاحیتیں اور جراءت مندی کہیں قیامت سے پہلے قیامت برپا نہ کر دے چنانچہ انہوں نے اس امر کی خداوند تعالیٰ کے روبرو بھی شکایت کی۔

(11) یہ شعر بھی ایک طرح سے اس سے پہلے شعر سے مربوط ہے۔ اس شعر کے مطابق فرشتے کی شکایت کے جواب میں عرش معلیٰ سے آواز آئی کہ یہ حقیقت ہی قیامت سے کیا کم ہے کہ کعبہ سے ہزاروں میل دور رہنے والے اہل چین تو عمرہ و حج کے لئے کمربستہ رہتے ہیں جب کہ خود اہل مکہ کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ وہ خانہ کعبہ کے نواحات میں خواب خرگوش میں مبتلا ہیں۔ اقبال کے اس شعر کا دوسرا مصرعہ حکیم سنائی کے قصیدے سے اقتباس ہے۔

(12) گیارھویں شعر تک علامہ نے اپنی نظم میں مشرقی تہذیب کے حوالے سے بات کی ہے لیکن اس شعر سے وہ مغربی تہذیب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مغرب میں تو اب خدا کی ذات سے بھی انکار ہو رہا ہے اور کوئی اس کے احکام کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ عملاً وہاں ابلیس کی حکمرانی ہے۔ اس کے برعکس وہاں کوئی بھی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو اہل مغرب کو خدا کے وجود اور اس کے احکامات کو تسلیم کرنے پر آمادہ کر سکے۔

(13) انکار خداوندی اور اس کے احکامات کی عدم تکمیل کے سبب مغرب میں جو انتشار و اضطراب کا

غلغلہ ہے، ہرچند کہ اس کو خوش آئند نعروں اور اسی نوع کی دوسری چیزوں نے عارضی طور پر دبا رکھا ہے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکے گا۔ بالآخر اس صورت حال کا ردعمل کسی نہ کسی شکل میں واضح ہو کر سامنے آئے گا۔

(14) ہرچند کہ یورپ اس وقت بڑی طاقتوں کا مرکز ہے۔ اس نے دنیاوی سطح پر بھی بڑی ترقی کر لی ہے لیکن آخر کار وہاں موجود تہذیب ہی ان طاقتوں کی تباہی کا سبب بنے گی۔ اس حوالے سے علامہ نے اپنے ایک اور شعر میں بھی واضح الفاظ میں اسی نوع کی پیش گوئی کی ہے کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

اقبال کی یہی پیش گوئی ایک طرح سے دوسری جنگ عظیم کے حوالے سے بھی پوری ہوئی۔

(15) حقیقت یہ ہے کہ اس قصیدہ نما نظم میں علامہ اقبال نے ایک سے زیادہ موضوعات کو اپنے اظہار میں پیش نظر رکھا ہے۔ آئندہ جو تین اشعار ہیں ان میں اپنے نقطہ نظر سے غلامی اور آزادی کا تجزیہ کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ غلامی دراصل حسن و زیبائی سے محرومی کا نام ہے اور فکر و عمل کی آزادی کے بغیر کوئی شخص بھی آزاد تصور نہیں کیا جا سکتا نا ہی اس کی رائے کو کوئی اہمیت دی جا سکتی ہے۔

(16) اس شعر میں بھی گزشتہ شعر کے موضوع کے تسلسل میں علامہ نے کہا ہے کہ غلاموں کی بصیرت بھی ناقابل اعتماد ہوتی ہے اس لئے کہ بصیرت تو صرف ان مردان حر کے پاس ہوتی ہے جو بلا خوف و خطر حالات و واقعات کا جائزہ لینے کے لئے اپنی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔

(17) وہی آج کے عہد کا کامیاب و کامران قائد ہے جو اپنی ہمت و صلاحیت کے بل بوتے پر مستقبل کے متوقع مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ان سے نمٹنے کی قدرت رکھتا ہو۔ مقصد یہ کہ عہد حال میں جو کچھ آنکھوں کے سامنے عمل میں آ رہا ہے اس کا اندازہ تو قریب قریب ہر سمجھدار شخص کو ہو سکتا ہے لیکن حقیقی رہنما وہی ہوتا ہے جو اپنی دوربین نگاہوں اور ادراک و شعور سے مستقبل میں وجود پذیر ہونے والے معاملات تک رسائی حاصل کر سکے۔ ایسا شخص ہی اپنے دور کے علاوہ آئندہ عہد کی نسلوں کی رہنمائی کا حقدار ہوتا ہے۔

(18) مذکورہ بالا تین اشعار کے بعد اقبال پھر اپنا موضوع بدلتے ہیں۔ ان کے مطابق اہل یورپ نے مشرق کی مستحکم اور باوقار قوتوں کو اپنی شعبدہ بازی اور مکاری کے ذریعے ان کی تمام تر صلاحیتوں اور قوتوں سے محروم کر رکھا ہے لیکن مجھے قدرت نے ایسی توفیق عطا کر دی ہے کہ جس کے ذریعے میں اہل مشرق میں ہمت اور مقابلے کی استطاعت پیدا کر سکوں۔

(19) ہرچند کہ اس عہد کے فرعون میرے افکار کے شدت سے مخالف ہیں اور ہر لمحے مجھے شکست سے ہمکنار کرنے کے لئے اپنے جال بچھائے رہتے ہیں لیکن جس طرح فرعون کے بالمقابل حضرت موسیٰ "ید بیضا" سے کام لیتے تھے اسی طرح میرے افکار و عمل اور قدرت خداوندی پر اعتماد کا جذبہ میرے دشمن فراعین کے لئے ید بیضا کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا مہر نے اس شعر میں ید بیضا کو قرآن حکیم سے تشبیہ دی ہے۔ ممکن ہے ان کا نقطہ نظر درست ہو۔

(20) اسی مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے علامہ زیر تشریح شعر میں یوں گویا ہیں کہ میرا فکر و عمل کسی

منفی قوت سے ناکارہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے مشرق کی اقوام میں عزم و ہمت کی ایک نئی لہر اور جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ یہ قوت و صلاحیت مجھے خود ذات باری تعالیٰ نے عطا کی ہے۔

(21) وہ عشق جو مجھے ذات رسول مقبولؐ سے ہے وہ اپنی حقیقت کو پہچاننے میں مددگار ثابت ہوتا ہے لیکن ضروری ہے کہ اس جذبہ عشق پر قائم رہنے اور اسے برقرار رکھنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا جائے کہ یہ عشق تو قیصر و کسریٰ جیسے بادشاہوں کے آستانوں سے حاصل ہونے والی عزت و حرمت سے بھی بے نیاز کر دیتا ہے۔ مراد یہ کہ حضورؐ سے عشق ہی وہ مقتدر جذبہ ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

(22) اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میں ارتقاء کے ان مراحل سے گزر رہا ہوں جن کی بنیاد پر چاند اور ثریا پر اپنا تسلط جمالوں تو کوئی حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ میں تو ذہن اور فطری طور پر اس بلند و بالا ہستی کے خاک پا کی حیثیت رکھتا ہوں جو نبیؐ آخر الزماں ہے اور ازل سے ابد تک پوری کائنات میں اس کا کوئی ہمسر نہیں چنانچہ اس بلند و بالا شخصیت کے طفیل اگر میں کوئی اعلیٰ مرتبہ حاصل کر لوں تو حیرت نہیں ہونی چاہئے!

(23) یہ شعر بھی پہلے دو اشعار کے تسلسل میں تخلیق کیا گیا ہے کہ حضور مقبولؐ کی ذات والا صفات تو عقل و دانش کی کلیت سے ہم آہنگ ہے۔ یہی وہ ذات پاک ہے جو خداوند عزو جل تک رسائی کی ضمانت دے سکتی ہے۔ یہی وہ ذات والا صفات ہے جس پر اس دنیا میں آنے والے انبیاء اور پیغمبروں کا سلسلہ ختم ہوا کہ وہی تو نبیؐ آخر ہیں۔ اور وہی اس پوری کائنات کے آقا و مولا ہیں۔ انہی کی خاطر یہ کائنات وجود میں آئی۔ یہی وہ ذات پاک ہے جو راستے کی گرد کو بھی کوہ طور کی تجلیوں میں ڈھالنے کی قدرت رکھتی ہے۔

(24) پیغمبرؐ آخر الزماں کی عظمت بیان کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں کہ یہی ذات والا صفات ہے جو نگاہ عشق و مستی میں سب سے ارفع و اعلیٰ ہے اور اس کائنات میں جس کی تخلیق سب سے پہلے ہوئی اور جس کی شخصیت دنیا کے آخری مرحلے تک برقرار رہے گی۔ یہی وہ ہستی ہے جو اخلاق قرآنی کا مکمل نمونہ تھی۔ یہی ہستی قرآن بھی تھی اور اسی کو لیسین وطٰہ کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔

(25) اس قصیدہ نما نظم کو تمام کرتے ہوئے آخری شعر میں علامہ فرماتے ہیں کہ حکیم سنائی کا احترام دامن گیر نہ ہوتا تو حضورؐ ختمی مرتبت کی شان میں اس نعتیہ قصیدے میں جو بحر استعمال کی گئی ہے اس میں مزید اشعار تخلیق کرتا کہ حضورؐ تو اتنی صفات کے مالک ہیں جن کا شمار انسانی فہم سے بالاتر ہے۔

(2) 023

یہ کون غزل خواں ہے پر سوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز!

گو فقر بھی رکھتا ہے انداز ملوکانہ
ناپختہ ہے پرویزی بے سلطنت پرویز!

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خون دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز!

اے حلقۂ درویشاں وہ مرد خدا کیسا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز!

جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز!

کرتی ہے ملوکیت آثار جنوں پیدا اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز!
یوں داد سخن مجھ کو دیتے ہیں عراق و پارس یہ کافر ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز!

**معنی:** تیمور: وسط ایشیاء کا سب سے بڑا فاتح مسلمان۔ بابر تیمور کی چھٹی پشت میں تھا۔ جس نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ تیمور نے ایشیا کے اکثر چھوٹے بڑے بادشاہوں کو تباہ کیا اور بے شمار انسانوں کا خون بہایا۔ رستاخیز: قیامت۔ چنگیز: تاتاریوں کے وہ مشہور سپہ سالار جس نے تیرہویں صدی عیسوی میں اپنی خانہ بدوش قوم کو منظم کر کے ایک بے پناہ قوت پیدا کر لی۔ پھر اسلامی ملکوں پر حملہ آور ہوا۔ اور ایشیا کے تاریخی شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی یورش میں کم و بیش ستر لاکھ مسلمان موت کے گھاٹ اترے۔

① اس غزل کے مطلع میں اقبال سوالیہ انداز میں خود اپنے بارے میں یوں گویا ہیں کہ یہ کون سخن ور ہے جس کے کلام میں سوز و گداز بھی ہے اور کیف و سرور بھی! اور جن لوگوں کو اپنی دانشوری پر ناز ہے ان کی عقل پر بھی۔ اس کلام سے ایک طرح کے جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس کلام میں دانشوروں کے لئے عمل کی ترغیب فراہم کی گئی ہے۔ اس شعر میں اقبال اپنی سیرت و کردار کے حوالے سے خود ہی موجود نظر آتے ہیں۔

② یہ درست ہے فقیری اور بادشاہی دونوں میں کچھ باتیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فقیر بھی بادشاہ کی طرح بے نیاز ہوتا ہے تاہم دونوں کے مابین بنیادی فرق یہ ہے کہ فقیر اپنی شان و شوکت کو نمایاں کرنے کے لئے کسی حکومت یا سلطنت کا محتاج نہیں ہوتا جب کہ بادشاہی سلطنت و مملکت کے بغیر نا تمام اور بے معنی شے ہے۔ بالفاظ دیگر فقیر تو اپنی روحانی قوت سے کام لیتا ہے جب کہ بادشاہ کے پاس ہر طرح کے لاؤ لشکر کے علاوہ ہر نوع کے ہتھیاروں کی بہتات ہوتی ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان لوازمات کے بغیر بادشاہت اور اس کے اقتدار کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ فقیر نہ مال و دولت کا آرزو مند ہوتا ہے نا ہی عز و جاہ اور اقتدار کا! وہ تو اپنے معتقدین کے دلوں پر اپنی روحانی قوت کے ذریعے دسترس رکھتا ہے۔

③ اب اگر یہ کہا جائے کہ صوفی میں پہلے جیسی صلاحیت اور روحانی قوت برقرار نہیں رہی تو بے جا نہ ہو گا ورنہ ماضی میں تو صوفی اور درویش میں ایسی روحانی قوت ہوا کرتی تھی جس کے روبرو شیر بھی لرزہ براندام رہتے تھے۔ مراد یہ ہے کہ اس عہد کا صوفی اور درویش تو فقر و غنا سے انحراف کر کے دنیاوی مال و منال کے چکر میں الجھ کر رہ گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں وہ روحانی قوت باقی نہیں رہی جو ہر نوع کی بڑی قوت پر بھاری ہوتی تھی۔

④ اقبال اس شعر میں آج کے صوفیوں اور درویشوں کو مخاطب کر کے ان سے استفسار کرتے ہیں کہ ذرا اس حقیقی او ۔ سچے صوفی کے متعلق تو سوچو جو اپنے سینے میں زبردست روحانی قوت رکھتا ہے۔ ایسی روحانی قوت جو کسی بھی قوم میں انقلاب انگیز صفات پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال کا اس شعر میں بنیادی مقصد یہ ہے کہ اپنے عہد کے ان صوفیوں اور درویشوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ تم لوگ تو بے حسی اور بے عملی کے سبب اپنی روحانی قوت او ۔ قدرت کی بخشی ہوئی صلاحیت کھو چکے ہو لیکن آج بھی ایسے مرد درویش موجود ہیں جو قوموں میں انقلاب کی جوت جگانے کے اہل ہیں۔

⑤ یہ شعر بھی اپنے موضوع اور مفہوم کے تسلسل میں اس سے پہلے شعر کے بنیادی متن سے ہم آہنگ ہے۔ اس شعر میں اقبال اسی انقلابی درویش کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ایسا مرد حق ہوتا ہے کہ جب اس کے روبرو خالق حقیقی کا ذکر کیا جائے تو اس کے دل و دماغ جوش عقیدت میں شعلے کی طرح روشن ہو جاتے ہیں اور جب فکری سطح پر اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کا ذہن اسی سرعت سے کام کرتا ہے جس طرح برقی رو تیزی سے دوڑتی ہے۔

⑥ یہ فطری امر ہے کہ ملوکیت میں ظلم و جبر بالآخر ایک جنون کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے ردعمل کے طور پر تیمور و چنگیز جیسے قاہر و جابر فرمانروا پیدا ہوتے ہیں جو اس جنون کو انتہا پر پہنچا کر اعتدال پر لے آتے ہیں۔

⑦ اقبال کہتے ہیں کہ نہ میرے پاس باطل کی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے کوئی ہتھیار ہے نا ہی کوئی اور وسیلہ! اگر ہے تو شعر کی وہ تخلیقی قوت ہے جو شاید کسی بھی ہتھیار سے زیادہ کارآمد ہے۔ ایران و عراق کے دانشور اسی لئے مجھے داد دینے پر مجبور ہیں کہ میں شاعری کو ہتھیار بنا کر باطل سے نبرد آزما ہوں۔

024

## 3

وہ حرف راز کہ مجھکو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفس جبرئیل دے۔ تو کہوں!

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی!
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناں گوں!

عجب مزا ہے مجھے لذت خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں!

ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستی شوق
نہ مال و دولت قاروں' نہ فکر افلاطوں!

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں!

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں!

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں!

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں!

**معنی: قارون:** قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت موسیٰؑ کی قوم کا ایک فرد تھا۔ جسے خدا نے بکثرت مال و زر عطا کیا تھا۔ وہ راہ حق سے منحرف ہو گیا تھا۔ سمجھانے بجھانے کا بھی اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے قارون اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا ہے۔ اور کوئی بھی اسے خدا کی گرفت سے بچا نہ سکا۔ **افلاطون:** یونان کا مشہور فلسفی۔ **رومی:** اشارہ ہے حضرت مولانا روم کی طرف۔ **کن فیکون:** اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف:- **بدیع السموات والارض واذا قضی الامر فانما یقول لہ کن فیکون:** (خدا ہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا سو ہو جاتا ہے) گویا خدا نے کائنات کو پیدا کرتے وقت کن کہا اور وہ پیدا ہو گئی۔ **جیحوں:** ترکستان کا مشہور دریا۔

① عشق الٰہی کے جنون نے (بقول اقبال) مجھے ایسا شعور بخش دیا ہے جس کے طفیل میں ایسے رازہائے دروں پردہ سے آگاہ ہو گیا ہوں کہ جن کا انکشاف خود اپنی زبان سے کیا جانا ممکن نہیں کہ اس مقصد کے

لئے جبریل امیں جیسی صلاحیت درکار ہے۔ جبریل ہی کو فرشتوں میں یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وحی الٰہی پیغمبر آخرالزماں حضرت محمدؐ کو پہنچایا کرتے تھے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ جو الہامی کیفیت رازوں کی شکل میں میرے پاس محفوظ ہیں ان کے انکشاف اور ترسیل کے لئے جبریل جیسے کسی فرشتے کی ضرورت ہے۔

② اس شعر میں اقبال اپنی ذات کے حوالے سے ان نجومیوں کی کارکردگی پر طنز کرتے ہیں جو ستاروں کے حساب سے لوگوں کی تقدیر اور ان کے احوال کے بارے میں انکشافات کا دعویٰ کر کے محض مادی مفادات حاصل کرتے ہیں۔ اقبال کا کہنا ہے کہ ستارے تو خود آسمانوں کی پہنائیوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ انہیں تو خود ہی اپنے وجود کے بارے میں کسی قسم کا علم نہیں تو پھر دوسروں کے مقدر کا انکشاف ان کے ذریعے کیسے ممکن ہے۔

③ اس شعر میں اقبال فلسفہ حیات پر ایک سوال کے ذریعے استفسار کرتے ہیں اور خود ہی اس کا جواب بھی دیتے ہیں کہ اگر یہ پوچھا جائے کہ زندگی کی اصل حقیقت کیا ہے تو اس کا سادہ سا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ انسانی فکر اور تعقل کے مابین ارتباط ہی زندگی کے فلسفے کا مظہر ہو سکتا ہے اور فکر و تعقل کے مابین اگر یقین واعتماد کا رشتہ موجود نہ ہو تو خود وجود انسانی اور اس کی روحانی قوت منتشر ہو کر رہ جاتی ہے۔ مختصرا یہ کہ زندگی کے لئے فکر و تعقل اور یقین واعتماد ناگزیر حیثیت کے حامل ہیں ان کے بغیر انسان کی تکمیل ممکن نہیں۔ اقبال کے نزدیک زندگی کا بنیادی فلسفہ بھی یہی ہے۔

④ یہ کس قدر دلچسپ معاملہ ہے کہ حق تعالیٰ نے خود ہی مجھے وہ صلاحیت عطا کی ہے کہ اپنی ذات اور اپنے وجود کو شناخت کر سکوں۔ اس کے بعد یہ امر کس قدر عجیب و غریب ہے کہ مجھ سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ اپنی ذات اور اپنے وجود کو فراموش کر بیٹھوں۔ اقبال کے پیش نظر یہ حقیقت ہے کہ خدائے عزو جل نے ہی انہیں یہ اہلیت عطا کی ہے کہ وہ اپنی ذات کی حقیقت سے آگاہ ہوں۔ اس کے ساتھ ہی وہ یعنی خدا اس امر کا بھی خواہاں ہے کہ اپنے وجود سے بے نیاز ہو کر بھی اس کی محبت اور چاہت میں گم ہو جاؤں یعنی اپنی شخصیت کو بھی بھول جاؤں۔

⑤ حالانکہ میرا ضمیر ہر نوع کے لہو ولعب سے پاک ہے اور عشق الٰہی کے علاوہ اپنی فکری سطح کو بھی بلند رکھتا ہوں ان کے علاوہ نہ تو یہ خواہش ہے کہ قارون کی طرح مال و دولت حاصل کروں نا ہی افلاطون کی طرح رعونت کا قائل ہوں۔ میں تو ہر طرح سے ان لوازم سے بے نیاز ہوں۔

⑥ حضورؐ پاک جس طرح شب معراج عالم بالا پر تشریف لے گئے اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عالم افلاک انسانی دسترس سے باہر نہیں ہے بشرطیکہ انسان میں صلاحیت اور ایسی علمیت موجود ہو جو اس مقصد کے لئے ضروری ہے۔ علامہ اقبال نے واقعہ معراج کے پس منظر میں مستقبل کے لئے جو پیش گوئی کی تھی وہ آج پوری ہو چکی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے انسان چاند پر بھی پہنچ چکا ہے اور اس سے اگلی منزلوں تک بھی اس کی رسائی ہو چکی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حضورؐ کے عہد میں تو یہ ٹیکنالوجی نہیں تھی نا ہی سائنسی بنیاد پر انسان اتنی ترقی کر چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ چودہ سو سال قبل پیغمبرؐ اسلام جو عالم بالا پر معراج کے لئے تشریف لے گئے تو اس سے ان کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

⑦ خدائے عزو جل نے ایک لفظ "کن" کے ذریعے کائنات کو تخلیق کیا۔ آج تک کانوں میں یہی لفظ بار بار گونج رہا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کائنات ابھی تک نا تمام ہے اور پایہ تکمیل کو

نہیں پہنچی۔
⑧ آج کے انسان سے مخاطب ہو کر علامہ اقبال کہتے ہیں کہ تیرے مسائل محض اسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں کہ تجھ میں مولانا روم کا سا سوز و ساز پیدا ہو جائے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ تو مغرب کے افسوں کا شکار ہے اور اس سے ہی تیرا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان مغرب کی تہذیب سے اس قدر مسحور ہے کہ مولانا روم کی تعلیمات کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ عملاً یہ خطاب اقبال کا مسلمانوں سے ہے۔
⑨ حالانکہ امر واقع یہ ہے کہ یہ مولانا روم کی تعلیمات کا فیض ہی ہے جس سے میرے (اقبال) دل و دماغ روشن ہیں اور شعور میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ مولانا کے علم و عرفاں کے طفیل ہی میرے علم و دانش میں اضافہ ہوا ہے اور سب چیزوں کو ان کے اصل روپ میں دیکھنے کے قابل ہو سکا ہوں۔

## (4) 025

عالم آب و خاک و باد! سرِ عیاں ہے تو کہ میں؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں؟

وہ شبِ درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے
اس کی سحر ہے تو کہ میں؟ اس کی اذاں ہے تو کہ میں؟

کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرم سیر
شانۂ روزگار پہ بارِ گراں ہے تو کہ میں؟

تو کفِ خاک و بے بصر! میں کفِ خاک و خود نگر!
کشتِ وجود کے لئے آبِ رواں ہے تو کہ میں؟

① چار اشعار کی یہ مربوط و مسلسل نظم فی الواقع کائنات اور انسان کی صفات کے مابین ایک تقابلی جائزے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے ابتدائی شعر میں اقبال نے کائنات کو محض پانی، مٹی اور ہوا کا مرکب قرار دیتے ہوئے انسانی صفات کو خالق حقیقی کے ایک ایسے بھید سے تعبیر کیا ہے جو سب پر عیاں ہے۔ اسی حوالے سے انہوں نے فرمایا ہے کہ اے دنیا یہ تو بتا جو خالق حقیقی ہے وہ میرے دل میں موجود رہتا ہے یا تجھ میں؟ مراد یہ کہ تجھے تو اس کا ادراک بھی نہیں جب کہ انسان کے لئے تو وہ سب کچھ ہے۔
② اس شعر میں اقبال نے ظہور آدم اور اس کے وجود میں آنے کے بعد جو صورت حال پیش آئی اس کے بارے میں بڑے علامتی انداز میں بات کی ہے کہ ظہور آدم سے قبل تو تاریکی ہی تاریکی تھی جب کہ وہ کائنات میں وارد ہوا تو ہر سمت اس کے شعور کی روشنی پھیل گئی سو فی الواقع یہ انسان ہی ہے جو صبح کی اذان کی طرح منظر پر نمودار ہوا اور جس نے کائنات کی تخلیق کا مقصد واضح کر کے ایک ایسے شعور کو جنم دیا جس کے سبب اپنی ذات کے ساتھ کائنات کی شناخت بھی ممکن ہوئی جب کہ انسان کے بغیر تو یہ کائنات ایک تاریک شب کے مانند تھی۔
③ ہر چند کہ انسان نے ارتقاء کا جو عمل شروع کیا ہے وہ ابھی تک تکمیل پذیر نہیں ہو سکا اس لئے کہ کائنات کے جملہ مادی عناصر دیکھا جائے تو اس کی راہ میں حائل ہیں۔ کائنات میں شب و روز کی جو گردش جاری ہے وہ اسی لئے کہ خود انسان بھی ابھی اپنی تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ سطور بالا کے مطابق انسانی ارتقاء کے عمل میں یہی مادی عناصر رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔
④ اس شعر میں بھی اقبال پانی، مٹی اور ہوا جیسے عناصر سے ترتیب پانے والی دنیا سے مخاطب ہو کر کہتے

ہیں کہ تو تو یقیناً ایک مشت خاک کے سوا اور کچھ نہیں کہ جس میں نہ شعور موجود ہے نہ ادراک! جب کہ میں وہ شخصیت ہوں جس میں بصیرت بھی موجود ہے اور بصارت بھی! جو اپنی حقیقتوں سے بھی پوری طرح آشنا ہے اور تیری اصلیت سے بھی آگاہی رکھتا ہے۔ اس صورت میں اگر میں یہ استفسار کروں تو غیر مناسب نہ ہو گا کہ حیات میں جو تازگی اور تراوٹ کے علاوہ ارتقاء کا عمل جاری و ساری ہے اس کی وجہ کون ہے؟ تو یا میں؟ اس سوال کا جواب یقیناً میرے حق میں ہو گا۔

## (5)

### 026 (لندن میں لکھے گئے)

تو ابھی رہگزر میں ہے قید مقام سے گزر!
مصر و حجاز سے گزر' پارس و شام سے گزر!

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر' بادہ و جام سے گزر!

گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار
طائرک بلند بال دانہ و دام سے گزر!

کوہ شگاف تیری ضرب' تجھ سے کشاد شرق و غرب
تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر!

تیرا امام بے حضور' تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر' ایسے امام سے گزر!

**معنی:** خیام: خیمہ کی جمع۔

① پانچ اشعار پر مشتمل یہ نظم علامہ اقبال نے لندن میں قیام کے دوران لکھی تھی۔ آغاز میں انہوں نے اس جانب اشارہ بھی کیا ہے۔ ان اشعار میں انہوں نے اپنے خصوصی انداز میں دنیا بھر کے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم لوگ تو ابھی تک نا آشنائے منزل ہو۔ ابھی تک راستے میں ہی بھٹک رہے ہو۔ لہذا اگر اپنے مقصد کی تکمیل کرتے ہوئے منزل تک پہنچنے کے خواہاں ہو تو پھر یہ مصر و حجاز اور ایران و شام کی حدود سے آگے بڑھنا ہو گا کہ مسلمان کے لئے یہ جغرافیائی حدیں بے معنی شے ہیں۔ عملاً یہ جغرافیائی حدود کا تصور تو یہاں یورپی تہذیب کی درآمدات میں سے ہے جب کہ مسلمان کی تو ایک ہی قومیت ہے وہ خواہ عرب میں بودوباش رکھتا ہو یا عجم میں! بہر حال مسلمان ہے اور اس کی قومیت مشترک ہے۔

② دوسرا شعر بھی پہلے شعر کا تسلسل ہے۔ جس میں علامہ کہتے ہیں کہ جو شخص سیرت و کردار کے حوالے سے بے غرض اور حرص و ہوس سے دور ہو گا خداوند قدوس اس کو خصوصی طور پر اس عمل کی جزا دیتا ہے لہذا ضروری ہے کہ بہشت تک رسائی کے لئے حور و غلماں اور شراب طہورہ کے خیال سے بے نیاز ہو کر نیک نیتی کے ساتھ اپنے عمل میں مصروف رہا جائے کہ اس نوعیت کا عمل تو ہر قسم کی جزاء سے بلند ہے۔

③ ہر چند کہ مغرب کا حسن اور وہاں کی تہذیب ظاہری سطح پر مسرت بخش ہوتی ہے لیکن یہ چیزیں تو عملاً ایک جال کے مانند ہیں جس میں بھولے بھالے انسانوں کو پھانسا جاتا ہے۔ یہاں بھی اقبال مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تمہاری سیرت و کردار تو بڑے بلند مقاصد کے آئینہ دار ہیں لہذا تمہارے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ مغرب کے حسن برہنہ اور تہذیب سے دور رہو۔

④ تیری ضرب لا الہ تو پہاڑوں کو بھی ریزہ ریزہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہے اور تجھ میں ایسی صلاحیت بھی موجود ہے جو مشرق و مغرب کے عقدے کھول دے اور ان کے مسائل حل کر دے۔ اے مسلمان! تیرے لئے لازم ہے کہ جس طرح ہلالی تیغ دشمن کی صفوں کو کاٹتی چلی جاتی ہے اسی طرح اپنے عمل سے تمام معاملات کو سلجھا کر رکھ دے۔

⑤ اس میں شک نہیں کہ اس شعر میں بھی اقبال مسلمان سے مخاطب ہیں لیکن یہاں ان کا لہجہ خاصا تند و تیز ہے۔ فرماتے ہیں کہ تو جس امام کی قیادت میں خدائے عزوجل کے حضور میں سجدہ ریز ہو رہا ہے اس امام کو تو خود بھی حضوری کا درجہ حاصل نہیں کہ اس کی نیت اور عمل منافقانہ ہے۔ اسی سبب تیری نماز بھی بے کیف ہو کر رہ گئی ہے چنانچہ تیرے لئے مناسب یہی ہے کہ ایسے بے کیف سجدوں اور اس طرح کے بے عمل اور منافق امام کی قیادت سے دستبردار ہو جا۔ مراد یہ ہے کہ جب راہ نما خود ہی بے عمل اور بد دیانت ہوں تو ایسے لوگوں کی قیادت کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان سے گریز کرنا چاہیے۔

## (6)

027

امین راز ہے مردان حر کی درویشی — کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبت خویشی!

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے؟ — فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی!

نگاہ گرم کہ شیروں کے جس سے ہوش اڑ جائیں — نہ آہ سرد کہ ہے گوسفندی و میشی!

طبیب عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا — ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی!

وہ شے کچھ اور ہے کہتے ہیں جان پاک جسے — یہ رنگ و نم یہ لہو آب و ناں کی ہے بیشی!

**معنی:** ناخوش اندیشی: ایسی باتیں سوچنا جو بہت بری ہوں۔

① سچے اور آزاد منش انسان حق تعالیٰ کے رازوں کے اپنی درویش طبعی کے باوجود جبرئیل امیں کی طرح امانت دار ہوتے ہیں مراد یہ ہے کہ جس طرح جبرئیل امیں احکامات الٰہی پوری دیانتداری کے ساتھ انبیاء کرام تک پہنچایا کرتے تھے اسی طرح یہ درویش صفت لوگ خدائے عزوجل کے احکامات تمام لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور دیانت داری کے ساتھ ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ان کے اور جبرئیل امیں کے مابین یہی ایک رشتہ ہے۔

② دیکھا جائے تو یہ شعر بھی پہلے شعر کا تسلسل ہے جس میں کہا گیا ہے ایسے فقیہہ، صوفی اور شاعر جو منافقانہ روش کے حامل ہیں انہوں نے نہ جانے اپنی دنیاداری اور غلط روش سے کتنے لوگوں کو گمراہ کیا ہے اور تباہی کے غار میں دھکیلا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ لوگ اپنے علم و فضل اور دانش سے عوام الناس کی رہنمائی کرتے لیکن اپنی بے عملی اور منافقت کے باعث یہ لوگ تو خود ہی گمراہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

③ قوموں کی حقیقی رہنمائی کے لئے تو ایسے سچے جذبوں اور اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کو سرگرم عمل کر کے شیر کی سی توانائی اور قوت عطا کرتے ہیں۔ ایسے جذبوں کی نہیں جو قوموں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بزدل بنا کر رکھ دے۔

④ اس شعر میں بھی اقبال ان لوگوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو جذب و عمل سے محروم ہیں۔ اقبال اس

صورت حال کو ایک مخصوص قسم کے مرض سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس مرض کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں کہ ملت میں عمل اور سربلندی کا جذبہ ہی ایک صحت مند معاشرہ تشکیل دے سکتا ہے۔

⑤ اعلیٰ مقاصد اور ان کے تکمیل کے لئے جس جوش و جذبے کی ضرورت ہے اس کے بغیر انسان سرخرو نہیں ہو سکتا۔ محض بلانوشی سے انسانی جسم کی پرورش نہیں ہوتی بلکہ اس مقصد کے لئے تو وہ خصوصیات درکار ہیں جو جسم کے ساتھ ساتھ روح میں بھی پاکیزگی کا عنصر پیدا کریں مراد یہ ہے کہ ظاہری نمود و نمائش بے معنی چیز ہیں اصل حقیقت تو انسان کے اندر کی پاکیزگی ہے۔

## (7)

028

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھکو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے! آتا ہے دھن جاتا ہے دھن!

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن!

① یہ نظم علامہ اقبال کی دوسری نظموں سے فکری سطح پر قدرے مختلف ہے۔ خاص طور پر اس کے ابتدائی اشعار میں وہ نیچر سے زیادہ قریب ہوتے ہوئے اپنے ماحول کی منظر نگاری کرتے دکھائی دیتے ہیں چنانچہ اولیں شعر میں فرماتے ہیں کہ موسم بہار آگیا ہے اور لالے کے پھول اپنے رنگ و روپ سے پہاڑوں اور ٹیلوں کو تابانی بخش رہے ہیں۔ باغوں میں پرندے مسرت و انبساط سے اس طرح چہک رہے ہیں کہ میں خود جھوم اٹھا ہوں اور اس منظر کے اثرات مجھے نغمہ گری پر اکسانے لگے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ایک تخلیق کار اور شاعر کو جب رنگ و روپ میں ڈھلا ہوا فطری ماحول مل جائے تو ایسا ماحول اس کی تخلیقی قوت پر اثر انداز ہوتا ہے اور پھر وہ اپنے تخلیق سے گزرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

② بہار کا موسم پورے جوبن پر ہے۔ باغات تو الگ رہے جنگل میں بھی رنگ برنگے پھول اس طرح سے کھلے ہوئے ہیں کہ جن کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ پریاں قطار باندھے کھڑی ہیں۔

③ ان اشعار میں علامہ نے جو خوبصورت امیجری پیدا کی ہے اس سے قاری کے ذہن کو آسودگی ملتی ہے۔ چنانچہ اس شعر کے مضمون میں جو حسن اور نزاکت ہے اس سے علامہ کی فنکارانہ چابکدستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ پھولوں کی پتیوں پر شبنم کے قطروں کو رقصاں دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں صبح کی ہوا نے پھولوں پر ایک موتی کی طرح سجا دیا ہے اور سورج کی کرنیں جب اس موتی پر پڑ کر

اس کی آب و تاب میں اضافہ کرتی ہیں تو یہ منظر اور زیادہ خوشنما ہو جاتا ہے۔

④ خدائے عزوجل تو اس امر سے قطعی بے نیاز ہے کہ اس کے مظاہر کس مقام پر زیادہ پذیرائی ہوتی ہے۔ اس کے لئے شہر اور جنگل کی کوئی قید نہیں بس اس کے نزدیک تو یہ حقیقت ہے کہ اپنے مظاہر کی نقاب کشائی کے لئے اگر شہروں کی بجائے صحرا کا انتخاب کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ شہر کے مقابلے میں صحرا کی حیثیت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔

⑤ اس شعر میں اقبال انسان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر تو میری بات تسلیم کرنے پر تیار نہیں تو اپنے باطن میں جھانک کر ہی زندگی کی حقیقتوں کا ادراک کر لے کہ زندگی اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ انسان کے باطن میں پوشیدہ رہتی ہے اور انسان کو اس حقیقت کا مکمل ادراک ہونا چاہئے۔

⑥ اس شعر میں اقبال فلسفہ خودی کو بالکل ایک نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ جذبہ عشق و مستی کے علاوہ انسانی فطرت کے دونوں پہلوؤں نیکی اور بدی کا جائزہ بھی لیتے ہیں چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ ایک جانب تو انسان باطنی سطح پر جذب و مستی اور عشق حقیقی سے ہم آہنگ رہتا ہے جب کہ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ذاتی مفاد کے لئے وہ ہر نوع کے مکر و فن کے مراحل سے گزرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتا۔ اقبال اس شعر میں انسانی کردار کے ان دونوں پہلوؤں کو خیر و شر کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔

⑦ مذکورہ بالا مسئلے کو اس شعر میں زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر سے اقبال نے پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق انسان کو باطنی سطح پر قلبی سکون میسر آجائے تو پھر اس کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے جو ضائع نہیں ہوتی جب کہ مادی اور جسمانی سطح پر حاصل ہونے والی دولت اور قوت تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں کے مانند ہے۔ اس کو کسی طور پر بھی پائیداری حاصل نہیں ہوتی۔

⑧ اقبال من کی دنیا کو ایسی ریاست سے تعبیر کرتے ہیں جہاں مغربی استعمار کا تسلط بھی کسی طور پر ممکن نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں تو شیخ اور برہمن کے تضادات پر مبنی رویوں کی گنجائش نہیں ہے۔ مراد یہ کہ من کی دنیا ایسی پاکیزہ اور شفاف دنیا ہے جہاں مفاد پرستی، منافقت اور ریاکاری کا شائبہ تک نہیں ہے۔ یہ جہاں مغربی استعمار کی مکاری اور فریبی سیاست سے دور ہے وہاں شیخ اور برہمن کے گمراہ کن نظریات بھی نہیں ہیں۔

⑨ اپنی بات کو تمام کرتے ہوئے نظم کے اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اس ضمن میں مجھے تو ایک مرد قلندر کا قول شرمسار کر گیا کہ اپنی خودی کو چھوڑ کر اگر تو کسی کے روبرو جھک گیا تو جان لے کہ تیرے پاس نہ تو روحانی سکون کی دولت باقی رہے گی نا ہی دوسرے مادی فوائد برقرار رہیں گے۔

## (8)

### (کابل میں لکھے گئے)

029

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا مروت حسن عالمگیر ہے مردان غازی کا

شکایت ہے مجھے یا رب! خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا!
بہت مدت کے نخچیروں کا انداز نگہ بدلا
کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا!
قلندر جز دو حرف لا الہٰ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا!
حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا!
کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا!

① اس نظم کے چھ اشعار کے بارے میں اقبال نے خود فرمایا ہے کہ یہ کابل کے دوران قیام تخلیقی سطح پر وجود میں آئے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمان کی یہ فطرت ہے اور یہ خصوصیت اس کے لہو میں شامل ہے کہ ہر شخص کے ساتھ خلوص و محبت کے ساتھ پیش آئے۔ یہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی ہر فرد کے ساتھ مروت سے پیش آنا اس کا نصب العین ہے۔ اور یہی ان لوگوں کا طرز عمل ہوتا ہے جو راہ حق میں جہاد کرتے ہیں۔

② اقبال درس گاہوں کے **معلمین** کے بارے میں خداوند تعالیٰ سے شکوہ کناں ہیں کہ یہ لوگ شہبازوں کو ایسا سبق دے رہے ہیں جو انہیں پستی میں دھکیل رہا ہے۔ بالفاظ دگر اقبال مالک حقیقی سے مخاطب ہوتے ہوئے مروجہ نظام تعلیم اور اس سے متعلق کارپردازاں کی نااہلی کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ عملاً مسلمان بچوں کو پستی کی طرف لے جا رہا ہے۔

③ وہ لوگ جو صدیوں سے ظلم و جبر کا شکار تھے۔ ان میں بیداری کی لہر ابھر رہی ہے اس لئے کہ میں (اقبال) نے اپنی نوائے فکر سے ان کے لہو کو گرما دیا ہے۔

④ مجھ ایسے درویش و قلندر کے پاس تو لفظ لا الہٰ کے سوا اور کچھ بھی نہیں جب کہ فقیہ شہر عربی زبان کی بھاری بھرکم لغت کا حافظ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تقریروں میں انتہائی ثقیل اور ایسے لفظوں کا استعمال کرتا ہے جو کہ عوام الناس کی فہم سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اسکا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ سننے والا اس کی مبہم تقریروں سے مرعوب ہو کر رہ جائیں۔

⑤ اقبال کہتے ہیں کہ عام شعراء کی مانند میں گل و بلبل اور جام و شراب کے ذکر تک محدود نہیں رہتا بلکہ میری شاعری میں تو ایسے افکار ہوتے ہیں جو حقیقت پسندی پر مبنی ہوں اور قوم کی ترقی و تعمیر میں ممد و معاون ہوں۔ اگر ان کے اظہار میں میرا لہجہ تلخ ہو جاتا ہے تو یہ ایک فطری بات ہے۔ عربی زبان کا یہ مقولہ میرے پیش نظر رہتا ہے کہ **"الحق مرہ"** یعنی سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے سو اگر سچائی کے اظہار میں میرا شعری لہجہ بھی تلخ ہو جائے تو اس میں حیرت نہیں ہونی چاہئے! چنانچہ مجھ سے ایسے اشعار کی توقع ہی کیوں کی جائے جن کا مقصد محض ذہنی عیاشی کے علاوہ تصنع اور بناوٹ ہو۔

⑥ نظم کے مقطع میں اقبال کہتے ہیں کہ بادشاہوں کو بھی اس امر پر یقیناً حیرت ہوتی ہے کہ میں نے یہ بے نیازی اور درویشی کہاں سے سیکھی کہ میں اظہار حقیقت کے دوران کسی بادشاہ کی پروا بھی نہیں کرتا اور مجھے سچ کہنے میں کسی لمحے بھی دریغ نہیں ہوتا۔

# (9)

030

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم!

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم!

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ ملا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

① یہ جذبہ عشق ہی ہے جس کے سبب زندگی میں جوش و خروش پیدا ہوتا ہے اور قوت عمل برقرار رہتی ہے حالانکہ انسان تو محض مٹی کا پتلا ہے جب کہ جذبہ عشق نے اس مٹی کے پتلے میں سوز و گداز اور زندہ رہنے کی خواہش کو جنم دیا ہے۔

② عشق ہی وہ جذبہ ہے جو انسان کے دل و دماغ، ضمیر اور روح حتیٰ کہ جسم کے ریشے ریشے میں سما جانے کی اس طرح صلاحیت رکھتا ہے جس طرح صبح کی تازہ اور جاں بخش ہوا سے پیدا شدہ نمی شاخ گل میں سما جاتی ہے۔

③ اقبال کہتے ہیں کہ انسان میں اپنے رزق دینے والے کو شناخت کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ بادشاہوں کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ اس کے رازق دراصل بادشاہ ہی ہیں۔ لیکن جو شخص اپنے پیدا کرنے والے کی ذات سے آگاہی رکھتا ہے تو دارا اور جم جیسے فرمانروا بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے یعنی اصل چیز ذات الٰہی سے رابطہ ہے اور اس رابطے کا عرفان ہے۔

④ اقبال اس شعر میں دل و ضمیر کی آزادی کو شہنشاہی پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر انسان کا دل آزاد ہے تو اس کا مرتبہ شہنشاہوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور غیراز خدا رزق کی طلب اس کے لئے بدترین قسم کی غلامی کے مانند ہے چنانچہ اس ضمن میں خداوند تعالیٰ نے انسان کو اس امر کا اختیار دے دیا ہے کہ وہ اپنی بھلائی کے لئے آزادی کا خواہاں ہے یا غلامی کا! اس شعر میں بھی بات عرفان خداوندی تک جا پہنچی ہے کہ حقیقی رازق تو خدا ہے تا کہ غیراز خدا کوئی انسان کی کفالت کر سکتا ہے۔ اس امر کے باوجود انسان کو قدرت نے یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ طلب رزق کے ضمن میں فیصلہ خود کرے۔

⑤ مسلمان سے خطاب کرتے ہوئے اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ کسی ملا مولوی کی بجائے خود اپنے دل سے اس امر کی آگاہی حاصل کر کہ حرم کعبہ اب قادر مطلق کے سچے بندوں سے کیوں محروم ہو گیا ہے۔ اب تو وہاں اکثریت ایسے لوگوں کی موجود ہوتی ہے جن کا کاروبار منافقت ہے۔ یہ شعر بھی معنوی سطح پر اس سے پہلے کے دو اشعار کا تسلسل ہے یعنی یہ کہ اب حرم کعبہ میں داخل ہونے والوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو عرفان الٰہی سے آگاہی نہیں رکھتے اور خدا کو رازق جاننے کی بجائے رزق کے لئے غیراز خدا کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ لوگ تو عملاً شکم کے بندے ہیں جو اپنے دل و ضمیر کی آزادی سے محروم ہیں پھر اس طرح کے لوگوں کی حرم کعبہ میں موجودگی کیسے ممکن ہے۔

# (10)

031

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے — پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے
ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں — غافل! تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے!
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن — پرکار و سخن ساز ہے! نمناک نہیں ہے!
کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی — ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے!
کب تک رہے محکومیٔ انجم میں مری خاک — یا میں نہیں، یا گردش افلاک نہیں ہے!
بجلی ہوں، نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری — میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے!
عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث! — مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے!

**معنی:** صاحب لولاک: اشارہ ہے ایک مشہور عوام حدیث کی طرف جس میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے ہے لولاک لما خلقت الافلاک (اگر تو نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا)۔ پرکار: ہوشیار، مکار۔

① اس نظم کے پہلے شعر میں اقبال ایک صورت حال کو پیش کرتے ہوئے اس کی وجہ بھی بتاتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں میں اس لئے جراءت اظہار اور ہمت کی کمی ہے کہ وہ سوز عشق سے بھی محروم ہیں اور انکی نظریں بھی شفاف اور حقیقت شناس نہیں! بالفاظ دگر اس مسئلے پر کسی حیرت کی گنجائش نہیں کہ جب انسان عشق حقیقی سے محروم ہو کر مادی آلائشوں میں گھر کر رہ جائے تو یہ فطری امر ہے کہ اس میں جراءت و ہمت باقی نہیں رہتی اور وہ محض ذاتی اغراض اور مصلحتوں کا شکار ہو کر بزدل بن جاتا ہے۔

② یہ درست ہے کہ فہم و ادراک بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں لیکن عشق حقیقی کی تجلی کے بغیر فہم و ادراک کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ یہ ساری حقیقتیں اور جذبے مربوط ہو کر انسان کو انسان بناتے ہیں۔

③ وہ لوگ جو مغربی تہذیب کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں وہ فی الواقع غلط فہمی کا شکار ہیں اس لئے کہ مغربی تہذیب چالاکی، مکاری اور اپنے ذاتی مفادات کی تکمیل کے لئے تو مواقع فراہم کرتی ہے لیکن اس وقت تک انسان کی تکمیل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ عشق حقیقی سے آشنا نہ ہو اور اس کا دل سوز و گداز سے محروم ہو۔

④ اقبال فرماتے ہیں کہ صوفی ملا تو ذات الٰہی کے عرفان اور عشق حقیقی سے یکسر محروم ہو چکے ہیں۔ ملت اسلامیہ کو جو مسائل درپیش ہیں اور جن خطرات میں مسلمان گرفتار ہیں یہ بے حس اور نافہم لوگ اس صورت حال کا ادراک نہیں رکھتے پھر وہ میری قلبی کیفیت سے کس طرح آگاہ ہو سکتے ہیں۔ وہ تو مادی مفادات کے حصول میں مصروف ہیں۔ قوم کو آپس میں چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھانا ان کا کام ہے۔ ملت کی تعمیر و ترقی کے لئے تو قربانی دینے کی ضرورت ہوتی ہے اور جذبۂ قربانی سے ان کا دل یکسر خالی ہے۔

⑤ نجوم اور گردش افلاک کے زیر اثر رہنے کی علامتوں کے حوالے سے اقبال نے اس شعر میں دراصل غیروں کی غلامی اور اس سے آزادی کے مسئلے پر بات کی ہے۔ جن دنوں یہ اشعار کہتے تھے تو ہندوستان انگریز کا غلام تھا اور اس کے جبر و استبداد سے رہائی کے لئے یہاں مختلف حلقوں سے آزادی کی

تحریکوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ علامہ نے اسی پس منظر میں یہ شعر کہا ہے کہ اب تو نوبت اس مرحلے پر آ پہنچی ہے کہ یا تو اہل وطن خود کو ختم کر لیں یا پھر انگریز کو ختم کر دیں۔ صرف یہی ایک راستہ رہ گیا ہے فرنگی کے استحصال اور غلامی سے نجات حاصل کرنے کا!

⑥ اس شعر میں وہ فرماتے ہیں کہ میں تو ایک ایسی برق کے مانند ہوں جو جنگل، چٹانوں اور پہاڑوں پر گر کر ان کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ محض کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو جلانا میرا مسلک نہیں۔ مراد یہ ہے کہ انتقام لینا ہو تو بڑی قوت رکھنے والوں سے لو۔ معمولی اور مسکین لوگوں سے تصادم تو بے معنی سی بات ہے۔ کمزور لوگوں کے خلاف کوئی اقدام، حوصلہ مند لوگوں کا مسلک نہیں۔

⑦ یہ کائنات تو محض ایسے مومن کی میراث ہے جو اپنی جان پر کھیل جانے کا حوصلہ رکھتا ہے اور مومن کی تعریف یہ ہے کہ جو حضورؐ پیغمبر اسلام کے اسوہ حسنہ سے قلب و روح کو منور کرے اور اس طرح وہ مقام لولاک کا فیضان حاصل کر لے۔ وضاحت کے لئے یہاں ایک حدیث قدسی کا ذکر ناگزیر ہے جس کے مطابق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ **"لولاک لما خلقت الافلاک"** یعنی "اے محمدؐ اگر تو نہ ہوتا تو میں یہ آسمان ہی پیدا نہ کرتا"۔

اس شعر میں جو پس منظر ہے وہ عملاً مومن کی تعریف اور اس کے مقام سے مطابقت رکھتا ہے۔ مراد یہ کہ مومن نہ صرف یہ کہ جانباز و حوصلہ مند ہوتا ہے بلکہ رسول مقبولؐ کی تعلیمات سے اس کا سینہ بھی روشن ہوتا ہے۔

## (11)

032

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق!
ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات، کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق!
علاج ضعف یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق!
مرید سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب
خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق!
اسی طلسم کہن میں اسیر ہے آدم
بغل میں اس کی ہیں اب تک بتان عہد عتیق
مرے لئے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت
ہزار شکر، کہ ملا ہیں صاحب تصدیق!
اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو، تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق!

**معنی: رازی:** معروف عالم و امام جن کی تفسیر کبیر (مفاتیح الغیب) بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ "مباحث شرقیہ" "شرح اشارات" وغیرہ ان کی معروف تصانیف ہیں فخر الدین نام۔ رے (ایران کا مشہور شہر) میں پیدا ہوئے۔ سلطان غیاث الدین غوری ان کا بڑا معتقد تھا۔ ہرات میں وفات پائی۔ **عہد عتیق:** پرانا زمانہ۔ **اقرار باللسان:** زبانی اقرار۔ **تصدیق:** لفظی معنی کسی چیز کے صحیح اور سچا ہونے کی تائید کرنا۔ **زندیق:** بے دین ملحد۔

① آغاز کائنات سے خدا کے نیک اور وفا شعار لوگوں کا یہی طرز عمل رہا ہے کہ کتنے بھی نامساعد حالات ہوں ان کا دل عشق حقیقی اور زبان پر ہمیشہ کلمہ حق رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے بے شمار قربانیاں دیں اور سچ کہنے سے گریز نہیں کیا۔

② علامہ اقبال نے اس شعر میں بعض روزمرہ کی تراکیب کا بڑے خوبصورت علامتی انداز میں استعمال کیا ہے۔ بظاہر شعر کا مفہوم اسی قدر ہے کہ شراب خانے میں نسبتاً زیادہ ہجوم محض اس لئے ہے کہ شراب خانے کا مالک انتہائی خلیق شخص ہے تاہم علامہ کی مراد یہ ہے کہ شفقت محبت اور اخلاق ہی ایسے عناصر ہیں جو کسی ایک فرد میں یکجا ہو جائیں تو عام لوگ اس کے گردو پیش جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی باتیں بڑے احترام کے ساتھ سنتے ہیں۔

③ ہرچند کہ امام رازی کی تعلیمات حکمت و دانائی کی آئینہ دار تھیں اس کے باوجود وہ ان لوگوں کے لئے زیادہ مفید اور کار آمد نہیں ہو سکتیں جن کا ایمان کمزور دل یقین و اعتماد سے خالی ہے۔ یقین و اعتماد تو محض عشق حقیقی ہی پیدا کر سکتا ہے۔ علامہ نے اسی مضمون کو راجہ بھرتری ہری کے ایک قول کے حوالے سے اپنے ایک شعر میں باندھا ہے۔ یہ شعر "بال جبریل" کے آغاز میں درج ہے۔ یعنی۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

④ بقول اقبال آج کل کے پیران کرام کا کردار یہ ہے کہ وہ اپنے سادہ دل مریدوں کو حق پرستی کی ترغیب تو دیتے رہتے ہیں لیکن خود تعلیمات پر عمل نہیں کرتے۔ جن پر عمل کے لئے اپنے مریدوں کو اکساتے ہیں۔ مراد یہ ہے ان پیروں کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ مرید تو خیر اپنی سادہ لوحی کی بنا پر اپنے پیروں کے اقوال پر ایمان لے آتے ہیں لیکن خود پیروں کا یہ حال ہے کہ اپنے منافقانہ کردار سے سرمو انحراف کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ دیکھا جائے تو اس شعر کا معنوی سطح پر اس سے پہلے شعر سے بھی تعلق بنتا ہے کہ پیر خواہ کیسا ہی ہو لیکن مرید کا دل چونکہ یقین و اعتماد سے پر ہوتا ہے اس لئے وہ پیر کی متضاد اور منافقانہ باتوں کو بھی اپنی سادگی اور یقین و اعتماد کے سبب سچ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

⑤ اقبال کہتے ہیں کہ اس سے بڑی بد قسمتی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان ابھی تک اس ترقیاتی عہد میں بھی دور جاہلیت کی برائیوں سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔ آج بھی برادری، رنگ و نسل، قبیلے، فرقے اور اسی نوع کی دوسری برائیوں کا وجود برقرار ہے اور آج کا انسان انہی جھگڑوں میں الجھا ہوا ہے۔

⑥ اس شعر میں اقبال نے ملاؤں پر زبردست طنز کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں تو ایک ایسا سیدھا سادا مسلمان ہوں جس کے روبرو اسلام کا زبانی اقرار کر لینا ہی کافی ہے جب کہ ملاؤں نے تو یہ وطیرہ اختیار کیا ہوا ہے کہ وہ ہر امکانی طریق پر ان کے زیر اثر آئے ہوئے مسلمانوں کے عقائد کو کھنگالتے ہیں اور اس کے بعد ہی بہت کم خوش قسمت ایسے ہوتے ہیں جو ان کے معیار پر پورا اترتے ہیں۔ مراد یہ کہ عقائد میں فروعی اختلاف کی بنیاد پر ہی ملا کسی شخص کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ اور اس کا یہی رویہ ملت میں تفریق کا باعث بنا ہوا ہے۔

⑦ دیکھا جائے تو اس شعر میں اقبال نے بڑے فلسفیانہ اور حقیقت پسندانہ انداز میں اسلام کی تعریف کی ہے کہ حقیقی اسلام کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان کے دل میں عشق حقیقی کی تڑپ موجود ہو تو کفر بھی مسلمانی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اگر دل میں عشق حقیقی کی تڑپ نہ ہو تو کسی مسلمان اور کافر و ملحد میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان کے لئے بنیادی شرط عشق حقیقی ہے۔ اسی جذبے کے زیر اثر وہ احکام الٰہی پر کاربند رہتا ہے اور احکام الٰہی پر عمل کئے بغیر کوئی مسلمان، مسلمان نہیں ہے بلکہ اس

میں اور کافر و ملحد میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

## (12)

033

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی
تو صاحب منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی!
کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی!
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!
کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی!
میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرض کور نگاہی!

**معنی:** کور نگاہی: اندھاپن۔

① کسی اور سے استفسار کرنے کی حاجت نہیں۔ خود اپنے دل اور ضمیر سے اس امر کا جواب طلب کر لے کہ اے مسلمان! تو صاحب منزل ہے کہ گم کردہ راہ ہے کہ دل اور ضمیر ہی اس مقصد کے لئے کسوٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

② اگر مسلمان نام کا ہے اور اس نے کافروں جیسی عادتیں اختیار کر رکھی ہیں تو وہ نہ تو بادشاہی میں مطمئن ہو سکتا ہے نہ فقیری میں! اس کے برعکس اگر وہ ایک سچا مومن ہے تو فقیری اور درویشی میں بھی وہ بادشاہوں کے مرتبے سے بلند ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان تو محض اسی صورت میں حقیقی مسلمان اور مومن ہو سکتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں احکام الٰہی کا پیروکار ہو۔ اگر ایسا نہیں تو پھر کافر اور اس نوع کے نام نہاد مسلمان (جو احکام الٰہی سے گریز کرے) اور کافر میں فرق ہی کیا ہے؟ حقیقی اور سچا مسلمان تو فقیری اور درویشی کے عالم میں بادشاہوں کے رتبے سے کہیں اعلیٰ ہوتا ہے۔

③ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے زیر تشریح شعر میں اقبال حقیقی مومن اور کافر کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی کی جدوجہد ہو یا جنگ کا میدان ہو کافر تو ان میں اسلحہ اور جملہ ساز و سامان پر بھروسہ کرتا ہے جب کہ ایک سچا مومن تو محض اپنی قوت ایمان کے بل پر اسلحہ اور دیگر ساز و سامان کے بغیر کافر سے بھی نبرد آزما ہونے پر تیار رہتا ہے۔

④ جو شخص محض نام کا مسلمان ہے اور احکام الٰہی کا پابند نہیں وہ تو خود کو تقدیر کا پابند بنا لیتا ہے اور عملی دنیا سے ہٹ کر تقدیر کو ہی ہر اچھائی برائی کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے جب کہ حقیقی مومن اور سچے مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ ہر کام رضائے خداوندی کے مطابق کر کے خود تقدیر الٰہی بن جاتا ہے۔ علامہ اپنے ایک دوسرے شعر میں اسی مضمون کو یوں پیش کرتے ہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

امر واقع یہ ہے کہ ہر اچھی بری بات کو تقدیر پر ڈال دینا اور یوں اپنی ذات کا دفاع کرنا کسی طور پر بھی درست نہیں۔ عمل اور سچائی کے لئے جدوجہد سے ہی قدرت کا منشاء پورا ہوتا ہے اور اسی کو اقبال نے تقدیر الٰہی کی ترکیب سے تعبیر کیا ہے۔

⑤ اس شعر میں اقبال انسان اور مسلمان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں میں نے تو اپنے باطنی شعور کی بدولت زندگی کے پوشیدہ رازوں کو کھول کر رکھ دیا ہے اس کے باوجود اگر تیری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں تو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا تا کہ تیرا مرض لاعلاج ہو چکا ہے اور اب اس سے شفا حاصل کرنے میں شاید کوئی دوا بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔

034

## (13)

## (قرطبہ میں لکھے گئے)

یہ حوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب!

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب!

جہانِ صوت و صدا میں سما نہیں سکتی
لطیفۂ ازلی ہے فغانِ چنگ و رباب!

سکھا دیے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہِ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب!

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب!

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب!

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب!

① سات اشعار پر مشتمل یہ نظم اقبال نے 1933ء میں قرطبہ کے دوران قیام لکھی۔ قرطبہ جو کبھی اندلس میں اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ رہا۔ اس شہر کی رونق اور حسن میں آج بھی بعض عمارات کے باعث سلاطین اسلامیہ کا حصہ برقرار ہے۔ بہرحال نظم کے اولین شعر میں کہا گیا ہے کہ یورپ کی خوبصورت عورتیں جن کو دیکھ کر لوگوں کے دل تڑپ اٹھتے ہیں امر واقع یہ ہے کہ یہ چہرے انسان کو راہ حق سے گمراہ کرتے ہیں۔ اسی یورپ کے ممالک جو اپنے حسن و زیبائش کے اعتبار سے بہشت کے مانند ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے جلوے عارضی ہیں۔ ان میں پائیداری نام کو نہیں۔ تصنع اور بناوٹ دیکھا جائے تو ان حسین عورتوں اور یورپی ممالک کا بنیادی جوہر ہے۔ ان میں جو جاذبیت ہے وہ بھی تصنع کی حامل ہے۔

② اقبال اس شعر میں بھی مرد مسلماں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنی خوبصورت اور بظاہر کارآمد چیزیں ہیں وہ تیرا مقصود نہیں بلکہ عملاً راہ حق میں رکاوٹ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ تجھ پر لازم ہے کہ ان خوبصورت چیزوں سے گریز کرتے ہوئے سنجیدگی کے ساتھ راہ حق پر گامزن ہو جا۔

③ ہسپانیہ میں چونکہ موسیقی کا بہت زیادہ رواج تھا اس لئے اقبال نے قرطبہ میں قیام کے دوران شعر کہتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ان میں چنگ و رباب کو علامتی حیثیت حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چنگ و رباب میں ابتداء سے ہی ایسی خاصیت موجود ہے جو سمجھ میں نہ آنے کے باوجود آواز و آہنگ کی دنیا میں نہیں سما سکتی بالفاظ دگر مذکورہ سازوں میں جو تاثیر ہے اس کا بیان ممکن نہیں۔

④ اس شعر میں علامہ علمائے شریعت اور پیران طریقت کا ذکر کرتے ہوئے قدرے تلخی اور ترشی سے کام لیتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ پیران طریقت یعنی صوفیوں نے خانقاہی نظام کو مادی سطح پر کامیابی کے ساتھ چلا کر علمائے شریعت کو بھی اس جانب راغب کر لیا ہے اور مو خر الذکر عملاً برباد ہو کر رہ گئے ہیں۔

⑤ اس ضمن میں صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ علمائے شریعت کی بے عملی کے سبب آج محراب و منبران سجدوں کو ترس رہے ہیں جن کے باعث کبھی زمیں لرز اٹھتی تھی۔

⑥ اور تو اور مصر و فلسطین میں بھی اب اس اذان کا دبدبہ نہیں رہا جس نے پہاڑوں کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مسلمان اس وقت باعمل اور صاحب کردار تھے جب کہ آج صورت حال اس کے برعکس ہے۔

⑦ اس آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں میرے لہجہ میں جو شباب کا سوز و سرور ایک بار پھر رونما ہوا ہے سو یہ قرطبہ کے ماحول اور اس کی آب و ہوا کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

## (14)

035

دل بیدار فاروقی، دل بیدار کراری
مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری، نہ میری ضرب ہے کاری!

مشام تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری!

اس اندیشے سے ضبط آہ میں کرتا رہوں کب تک
کہ مغ زادے نہ لے جائیں تری قسمت کی چنگاری

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری!

تو اے مولائے یثربؐ آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری!

**معنی: فاروقی:** حضرت فاروق اعظمؓ کے اوصاف و خصائص۔ **کراری:** حضرت حیدرؓ کے اوصاف و خصائص۔ **مشام تیز:** سونگھنے کی تیز قوت۔ **ظن و تخمیں:** گمان اور اندازہ۔

① اقبال کے نزدیک جس انسان کا دل بیدار ہو جائے اور شعور ذات پیدا ہو جائے اس میں حضرت فاروق اور حضرت علی جیسے اوصاف و خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مزید یہ کہ دل کی بیداری انسان کے لئے ایسی ہی شے ہے جیسی کہ تانبے کے لئے کیمیا! جو تانبے کو سونا بنانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ مراد یہ کہ دل کی بیداری شعور ذات اور مکمل ذات کی حامل ہوتی ہے۔

② اس شعر میں اقبال پہلے شعر کے حوالے سے مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ جب تک دل بیدار نہیں ہوتا اور خوابیدہ ہے یہ سمجھ لے کہ دشمن کے خلاف نہ تیرا وار کارگر ہو گا نہ میرا وار کارگر ہو سکے گا۔ اس کے لئے تو دل کی بیداری شرط اول ہے۔

③ منزل مراد تک پہنچنے کے لئے مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان متوقع صورت حال کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ محض واہموں اور اندازوں سے بات بننا مشکل ہے۔

④ میں اب تک جو اظہار حقیقت نہ کر سکا تو اس کی وجہ محض یہ خدشہ تھا کہ میرے افکار سے کہیں غیر

مسلم استفادہ نہ کرلیں۔ جب کہ اپنے عہد کے مسلمانوں کی بے حسی کا تو پہلے سے ہی مجھے اندازہ ہے تاہم میرے لئے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ اسی خدشے کی بنا پر اظہار حقیقت سے مسلسل گریز کرتا رہوں۔

⑤ اس شعر میں اقبال خداوند عزوجل سے مخاطب ہو کر استفسار کرتے ہیں کہ اے مالک حقیقی آج کے عہد میں تو درویشی بھی عیاری سے پاک نہیں اور بادشاہت بھی عیاری کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس صورت میں ہم جیسے سادہ دل انسانوں کا گزر کیسے ہو۔ مراد یہ ہے کہ درویش بھی اپنے حقیقی فرائض سے غافل ہیں اور بادشاہ بھی اپنے منصب کا احترام نہیں کر رہے۔

⑥ اس ساری صورت حال میں ایک بات واضح ہے کہ تہذیب حاضر نے بے شک انسان کو آزادی تو عطا کر دی ہے لیکن بغور جائزہ لیا جائے تو یہ آزادی عملاً غلامی سے بھی بدتر ہے۔

⑦ اس سارے پس منظر کے حوالے سے اقبال ایک طرح کی مایوسی کی حالت میں خداوند تعالٰی کے روبرو عرض پرداز ہیں کہ میری سوچ تو انگریزی تہذیب و دانش سے مستعار ہے اور جہاں تک عقائد کا تعلق ہے ان پر بھی غیر مسلم کے کلچر کا سایہ ہے۔ اس لئے اے باری تعالٰی تو ہی مدد کر کہ میں سچائی کی راہ پر گامزن ہو سکوں۔

## 036 (15)

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی' تو بے لذت نیاز نہیں

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے!
شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگ صور سرافیل دل نواز نہیں

سوال مے نہ کروں ساقی فرنگ سے میں
کہ یہ طریقہ رندان پاکباز نہیں

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومت عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

اک اضطراب مسلسل غیاب ہو' کہ حضور!
میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم
فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں

**معنی: غیاب:** غائب ہونا۔ غیر حاضر ہونا۔ **زبور عجم:** اقبال کی مشہور فارسی تصنیف۔

① جس انسان کا ضمیر خودی کے جذبے سے مخمور ہوتا ہے اس میں نہ غرور موجود ہوتا ہے نا ہی وہ اپنی ذات پر فخر کرتا ہے۔ بالفرض کسی مرحلے پر فخر بھی عود کر آئے تو اس میں ابھی عملاً نیازمندی کا پہلو شامل ہو گا۔ اس شعر کو آسان اور سہل الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں میں سچائی کو راہ دکھانے کی اہلیت ہوتی ہے۔ وہ کسی مرحلے پر بھی کبر و غرور سے بالاتر رکھتے ہوئے ہمیشہ نیازمندی اور انکساری سے کام لیتے ہیں۔ یہی عمل ان کی عظمت کی دلیل بن جاتا ہے۔

② عشق حقیقی تو ہمیشہ زندہ دل لوگوں کا وطیرہ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شہباز مردہ جانور پر جھپٹنے کی بجائے محو پرواز پرندے کا شکار کرتا ہے۔

③ اس شعر میں اقبال صور اسرافیل کے حوالے سے اپنے نغمہ گری کے ضمن میں ایک اہم بات کہی ہے کہ قیامت کے روز جس طرح حضرت اسرائیل کے صور پھونکنے سے تمام مردے اس خوفناک آواز پر

زندہ ہو اٹھیں گے۔ اسی طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے اشعار کی لے بھی تلخ نوائی کی حامل ہے کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔

④ فرماتے ہیں کہ یورپی استعمار پرستوں سے میں کسی قسم کی بھیک کا طلبگار نہیں ہو سکتا کہ اہل حق اور آزاد لوگوں کے لئے کسی کے روبرو بھی دست سوال کرنا ان لوگوں کے اصولوں کے منافی ہو جو آزادی پر کامل یقین رکھتے ہیں اور موت کو غیروں کی غلامی پر ترجیح دیتے ہیں۔

⑤ اقبال کے بقول عشق حقیقی کا جذبہ ہر دل میں راہ نہیں پا سکتا کہ اس کا زمانہ سازی اور منافقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ عشق حقیقی تو صرف انہی دلوں میں موجزن ہوتا ہے جو اس کی لطافت اور پاکبازی کا شعور رکھتے ہیں اور دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد انتہائی محدود ہے۔

⑥ اس شعر میں اقبال ان لوگوں کے حوالے سے خود پر طاری ہونے اور مسلسل اضطراب و بے قراری کا ذکر کرتے ہیں کہ دنیا والے اس مسئلے پر کتنی ہی مبالغہ آرائی کریں۔ میرا معاملہ تو بس محبوب کی جدائی یا پھر وصال تک محدود ہے۔

⑦ اگر کسی میں ذوق مطالعہ اور حقیقت کو پانے کی تڑپ موجود ہے تو پھر شب کی پر سکون تنہائی میں میرے شعری مجموعے زبور عجم کا مطالعہ کرے کہ اس کے اشعار میں ایک ایسی فریاد پوشیدہ ہے جو انسان خلوص دل کے ساتھ نصف شب کے بعد ہی خدائے پاک کے روبرو کرتا ہے۔ ایسی فریاد رازہائے درون پردہ کی امیں ہوتی ہے۔

## (16)

037

میر سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ! وہ تیر نیم کش، جس کا نہ ہو کوئی ہدف!

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج، دیکھ چکا صدف صدف!

عشق بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگار دیر میں خون جگر نہ کر تلف!

کھول کے کیا بیاں کروں سر مقام مرگ و عشق
عشق ہے مرگ باشرف، مرگ حیات بے شرف!

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب، ایک کلیم سربکف!

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ **لاتخف**

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

**معنی:** **ہدف:** نشانہ۔ **لاتخف:** لفظی معنی نہ ڈرنا۔

① اس نظم کے اشعار میں قریب قریب ہر مقام پر اقبال کی حیثیت ایک دل گرفتہ اور مایوس شاعر کے مانند ہے چنانچہ ابتدائی شعر میں ہی وہ ایک صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے بڑے دردانگیز لہجے میں یوں گویا ہیں کہ میری قوم اپنی بے حسی اور بے عملی کے سبب انتہائی انتشار کا شکار ہے۔ یہ بھی ہے کہ قوم کا جو رہنما ہے وہی بے عمل اور قیادت کی صلاحیت سے عاری ہے چنانچہ نہ تو قوم کے سامنے کوئی جذبہ تعمیر ہے نا ہی اس کے رہنما کے ذہن میں کوئی تعمیری منصوبہ! جو مثبت کیفیت کا حامل ہو۔

② اقبال کہتے ہیں کہ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ معاشرے اور قوم میں کوئی تعمیری جوہر تلاش کر

سکوں لیکن اس سعی میں بری طرح ناکام ہوا۔ عملاً یہ اشعار ملت کے انتشار، بے عملی اور بے راہ روی کا نوحہ ہیں۔ ان حالات میں بھی اقبال کسی مثبت پہلو کے متلاشی نظر آتے ہیں۔

③ اس شعر میں اقبال ملت کو ایک نئی راہ سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غیروں کی مدح سرائی اور خوشامد سے احتراز کرتے ہوئے خود اپنی حقیقت کو پہچاننے اور جاننے کی کوشش کر کہ غیروں کی خوشامد اور کاسہ لیسی میں کسی نوع کی قربانی دینا بے مقصد اور بے فائدہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ صحیح انسان وہی ہے جو دوسروں کی غلامی کو مسترد کرتے ہوئے اپنی آزادی کا تحفظ کرے۔

④ موت اور عشق کے مابین جو فرق ہے اس کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی حاجت نہیں بس اتنا کہہ دینا ہی کافی ہو گا کہ عزت کے ساتھ جان دینے کا نام ہی فی الواقع عشق ہے۔ اس کے برعکس موت بے شرف اور بے وقار عمل کا نام ہے۔ مراد یہ ہے کہ بے عزتی اور بے وقار زندگی ہی موت کے مترادف ہے۔

⑤ اقبال فرماتے ہیں کہ مولانا روم کی تعلیمات نے مجھ پر یہ راز منکشف کیا کہ لاکھوں فلسفی اپنے علوم کو دوسروں تک پہنچانے کے باوجود ایک ایسے شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو عالم با عمل ہے اور عشق حقیقی سے سرشار ہے اور اپنا یہ جذبہ دوسروں میں منتقل کرتا ہے۔

⑥ اس شعر کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح فرعون سے نبرد آزما ہونے کی روایت اگر کوئی آج کے عہد میں بھی زندہ رکھنے کا اہل ہو تو جس طرح فرعون کے خلاف خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی مدد کی تھی اسی طرح آج بھی وہ ایسے شخص کا یقیناً مددگار ہو گا۔ مراد یہ ہے کہ باطل کے خلاف نبرد آزما ہونا ہی حمایت خداوندی کی بنیاد بنتا ہے۔

⑦ اس نظم کے آخری شعر میں اقبال عملاً اپنے ذاتی عقیدے کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب و دانش نے اپنی تمام تر جلوہ طرازی کے مجھے اس لئے متاثر نہیں کیا کہ میرا واسطہ تو مدینہ و نجف سے ہے یعنی حضور سرور کائنات محمدؐ اور خلیفۃ المسلمین حضرت علیؓ کی تعلیمات نے ہی مجھے وہ بصیرت عطا کی جس کے بعد کسی دوسرے کے فرمودات کی ضرورت نہیں رہتی۔

## (17) 038

## (یورپ میں لکھے گئے)

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی!

کہیں سرمایۂ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا!
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی!

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دلآویزی!

① یہ پانچ اشعار جن کی تشریح یہاں پیش کی جا رہی ہے اقبال نے لندن کے دوران قیام لکھے، جن دنوں

وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تو سردی کا زمانہ تھا اور اس امر کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ برطانیہ میں موسم سرما میں سردی شدت کی ہوتی ہے چنانچہ وہاں کے موسم کا حال بیان کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ لندن میں اگرچہ سرد ہوا میں شمشیر کی سی کاٹ تھی اور بستر سے ہاتھ نکالنا بھی مشکل ہوتا تھا اس کے باوجود میں اپنی فطری عادات کے مطابق علی الصبح بیدار ہوتا اور موسم کی پروا کئے بغیر اپنے روزمرہ کے معمولات میں مصروف ہو جاتا۔

② دوسرے شعر میں بیان کرتے تھے کہ احباب کی کسی محفل میں جب میں اظہار خیال کرنے پر آتا تو حاضرین میری گفتگو سے مسحور ہو کر رہ جاتے اور کسی مرحلے پر جب میں حسب عادت خاموشی اختیار کر لیتا تو موجود لوگ میرے سکوت پر پریشان ہو کر رہ جاتے۔ اس شعر میں اقبال اپنی کم آمیزی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ غیر ضروری طور پر گفتگو سے گریز کرتے تھے۔ لیکن جب ان سے کسی مسئلے کے بارے میں استفسار کیا جاتا تو اس کا جواب بڑے مدلل انداز میں تفصیل کے ساتھ دیا کرتے تھے۔

③ اس شعر میں اقبال نے ایک ایسے مسئلے کی جانب اشارہ کیا ہے جس کو بالعموم زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ ان کے نزدیک اگر اقتدار مزدوروں اور محنت کشوں کے سپرد کر دیا جائے تو موجودہ نظام ایسا ہے کہ ان کا رویہ بھی وہی ہو گا جو آج کے آمر حکمرانوں کا ہے۔

④ اس سے پہلے شعر کے حوالے سے اس شعر میں اقبال نے ایک نکتہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں ریاست کا نظام کیسا ہی ہو۔ خواہ وہاں بادشاہت یا آمریت ہو یا پھر جمہوریت! ان کے نزدیک صورت حال یہ ہے کہ سیاست سے اگر دینی اقدار کو نکال دیا جائے تو ظالمانہ آمریت کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ اس مسئلے کی مزید وضاحت کی جائے تو بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ کسی مملکت کا نظام سلطنت خواہ کسی طرز کا بھی ہو دینی اقدار کی شمولیت کے بغیر ناکامی کا مظہر ہوتا ہے اور عوامی مسائل حل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی کہ اقبال بادشاہی اور آمرانہ نظام کے بھی خلاف تھے اور جمہوریت کو بھی بوجوہ ناپسند کرتے تھے۔ ان کے مطابق تو کامیاب طرز حکومت وہی ہو سکتا ہے جو دینی اقدار کا پابند ہو۔

⑤ نظم کے اس آخری شعر میں علامہ روم کے قدیم اور عظیم الشان کھنڈرات کا مشاہدہ کرتے ہوئے دہلی کا تذکرہ کرتے ہیں کہ وہاں بھی بلند و بالا عمارتوں کی اسی طرح کے کھنڈرات ہیں جو شاہان سلف کی عظمتوں کے یادگار ہوتے ہوئے بھی نشان عبرت بنے ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح روم کے قدیم شہر میں ماضی کی پرشکوہ عمارات کے کھنڈر اس عہد کی شان و شوکت کا مظہر ہیں یہی صورتحال دہلی کے عظیم الشان کھنڈرات کی ہے۔

(18)

039

دیر کہن کیا ہے؟ انبار خس و خاشاک! مشکل ہے گذر اس میں بے نالۂ آتشناک!

تخچیر محبت کا قصہ نہیں طولانی لطف خلش پیکاں، آسودگی فتراک!

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بیرنگ نہ ہو ادراک!

اک شرع مسلمانی، اک جذب مسلمانی
ہے جذب مسلمانی سر فلک الافلاک!

اے رہرو فرزانہ بے جذب مسلمانی
نے راہ عمل پیدا نے شاخ یقیں نمناک!

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی
ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بیباک!

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک، یا دامن یزداں چاک!

**معنی: ہفتاد و دو ملت:** لفظی معنی بہتر فرقے مراد بہت سے فرقے۔ **فلک الافلاک:** آسمانوں کا آسمان یعنی عرش۔

① اقبال بعض مراحل پر اظہار میں خاصا انتہاپسندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں جس کا اندازہ زیر تشریح نظم کے قریب قریب تمام اشعار اسی کیفیت کے مظہر ہیں چنانچہ پہلے شعر میں وہ دنیا کے قدیم بت خانے کو خس و خاشاک یعنی گھاس پھونس کے ڈھیر سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں سے نوائے آتش کے بغیر گزر ممکن نہیں۔ مراد یہ ہے کہ دنیاوی اور معاشرتی مسائل کا حل اب محض عام نالہ و فریاد نہیں بلکہ اس مقصد کے لئے عملی جدوجہد کی ضرورت ہے خواہ اس عمل میں آتشیں کردار درکار ہو۔

② محبت کے دام میں گرفتار ہونے والے لوگوں کا معاملہ بس اسی قدر ہے کہ تیر عشق سے گھائل ہوئے پھر محبوب کے ہو کر رہ گئے۔ یہاں اقبال نے عشق و محبت کا معاملہ بڑے سادہ اور مختصر الفاظ میں پیش کیا ہے۔

③ اسلام میں جو فرقہ بندیوں کی لعنت وجود پذیر ہو گئی ہے۔ اس کے ادراک کے لئے ایسے ذہن کی ضرورت ہے جو خود فرقہ بندی اور اس سے جنم لینے والی منافقت سے پاک ہو۔

④ علامہ اس شعر میں ایک نکتے کی توجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک شے تو اسلامی شریعت ہوتی ہے اور ایک اسلامیت سے جذب و عشق کی کیفیت ہے اور آخر الذکر کیفیت ہی فی الاصل افلاک کے پوشیدہ رازوں میں سے ایک ہے۔

⑤ اس شعر میں اقبال پچھلے شعر کی تشریح میں اضافہ کرتے ہوئے خود فرماتے ہیں کہ جذب و عشق کے بغیر نہ راہ عمل کا ادراک ممکن ہے نا ہی یقین و اعتماد میں تازگی اور استحکام آتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جذب و عشق کے بغیر راہ عمل کا تعین ممکن نہیں!۔

⑥ عشق حقیقی کی شدت اور انتہا یہ ہے کہ وہ محبت کرنے والے کو ایک حد تک گستاخ بھی بنا دیتا ہے اور بے خوف بھی! عشق حقیقی تو انسان کو ہر شے سے بے نیاز کر کے اپنے نقطہ نظر پر ڈٹ جانے کی تلقین کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ عشق حقیقی میں وہ جوش و خروش اور جذبہ ہوتا ہے کہ اس کیفیت کو قبول کرنے پر محبوب بھی قید ہو جاتا ہے اور وہ عاشق کے جذبات کی پذیرائی اور آسودگی کے لئے کرم گستری کا حامل ہو جاتا ہے۔ تاہم اس حقیقت کو بھی جان لینا چاہئے کہ عشق کا ہر جذبہ اس نوع کی گستاخی اور بے باکی کا مظہر نہیں ہوتا۔

⑦ ابتدائی شعر کی تشریح کرتے ہوئے اس نظم میں اقبال کے اظہار میں جس نوع کی انتہاپسندی کا اشارہ دیا گیا تھا۔ یہ آخری شعر اس کا واضح اور کھلا ثبوت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرا جذبہ عشق مجھے روز محشر بھی نچلا بیٹھنے نہیں دے گا چنانچہ وہاں اس امر کا خدشہ ہے کہ دیوانگی کے عالم میں یا تو اپنے گریباں کی دھجیاں

اڑا کر رکھ دوں گا یا پھر خدائے لم یزل کا دامن میرے ہاتھ میں ہو گا۔ گذشتہ شعر میں علامہ نے جو بے باکی و گستاخی کو عشق حقیقی کی دو رمزوں سے تعبیر کیا ہے۔ اس آخری شعر میں اقبال اس صورت حال کے عملی پہلو کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ عشق حقیقی کا خوگر جس طرح اس عالم فانی میں محبوب کے ساتھ گستاخی و بے باکی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اس طرح روز محشر بھی وہ جوش جنوں میں یہ سب کچھ کیوں نہ کر گزرے گا۔

## (19)

040

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری!
میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے
وہ قوم جس نے گنوایا متاع تیموری
سنے نہ ساقی مہوش تو اور بھی اچھا
عیار گرمئ صحبت ہے حرف معذوری
حکیم و عارف و صوفی تمام مست ظہور
کسے خبر کہ تجلی ہے عین مستوری!
وہ ملتفت ہوں تو کنج قفس بھی آزادی
نہ ہوں تو صحن چمن بھی مقام مجبوری
برا نہ مان' ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری!

**معنی : مہجوری**: جدائی۔ علیحدگی۔ **ملتفت**: متوجہ' مہربان۔ **اہل حلقہ**: یہ تصوف والوں کی صطلاح ہے۔ اس لئے کہ وہ کسب فیض سے پیرو مرشد کے سامنے حلقہ بنا کر بیٹھتے ہیں۔

① انسان دنیاوی علائق سے گھبرا کر ترک دنیا کر لے اور جنگل بیاباں کی راہ لے۔ یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہے کہ کمال کی بات تو یہ ہے کہ اپنی جراءت و بے باکی اور حوصلے کے ساتھ ہر مادی اور روحانی شے پر تسلط جما کر پھر اسے ترک کر دے پھر صرف اور صرف رب ذوالجلال سے اپنا رشتہ استوار کر لے۔

② اے صوفیان کرام! تم جس شے کو فقر اور درویشی سے تعبیر کرتے ہو۔ میں اس کا سرے سے قائل نہیں کہ تمہارے نزدیک تو یہ فقر و درویشی افلاس اور اس سے پیدا ہونے والے دکھ کا نام ہے جب کہ میرا فقر و حقیقت ہے کہ ہر شے پر دسترس رکھنے کے باوجود اس سے بے نیازی اختیار کر لوں اور تعلق صرف ذات خداوندی سے رہے۔

③ جس قوم نے اپنی نا اہلی سے مغلیہ عہد کی عظیم الشان سلطنت گنوا کر رکھ دی وہ امر واقع یہ ہے کہ نا بادشاہت کی اہل ہے نا ہی فقر و درویشی کی! مراد یہ کہ ایسی بے عمل قوم نہ مادی سلطنت پر اپنا تسلط برقرار رکھ سکتی ہے نا ہی روحانیت اور درویشی کے ضمن میں کامیاب ثابت ہو سکتی ہے۔

④ یہ حقیقت ساقی کے علم میں نہ آئے تو اچھا ہی ہے کہ میں ترک لے کر چکا ہوں۔ ہر چند کہ ایک محل میں اس سے معذوری کا اظہار کر چکا ہوں لیکن یہ تاثر دینا مقدور نہیں کہ شراب چھوڑ چکا ہوں۔ دراصل میں نہیں چاہتا کہ ساقی کی عنایات سے محروم ہو جاؤں۔

⑤ فلسفہ' معرفت اور تصوف پر ایمان رکھنے والے اپنے مابین قدر مشترک یہ رکھتے ہیں کہ خدا کو بے حجاب دیکھیں۔ حضرت موسیٰ کی طرح انہیں اس کا جلوہ نظر آئے تاہم حقیقت یہ ہے کہ ان کی خواہش بے

معنی ہے کہ تجلی بھی عملاً ایک طرح کا پردہ ہی تو ہے۔

⑥ اگر محبوب مہرباں ہو اور التفات کا مظاہرہ کرے تو قید خانہ بھی آزاد فضا کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر محبوب نامہربان ہو تو قید خانہ تو الگ رہا۔ خود صحن چمن بھی قید خانے کا منظر پیش کرنے لگتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ محبوب کا مہربان ہونا عاشق کے لئے متاع بے بہا کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی ناخوشی عاشق کے دل و دماغ کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے۔

⑦ ہر چند کہ مغربی علوم دل و دماغ کو روشن کر دیتے ہیں لیکن ایمان اور عقائد پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ بات میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں کسی کو میری بات کا یقین نہ ہو تو خود تجربہ کر کے دیکھ لے!۔

## 041 (20)

عقل گو آستاں سے دور نہیں     اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب     آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن     یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں     ایک بھی صاحب سرور نہیں
اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے     اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں
ناصبوری ہے زندگی دل کی     آہ! وہ دل کہ ناصبور نہیں!
بے حضوری ہے تیری موت کا راز     زندہ ہو تو تو بے حضور نہیں
ہر گہر نے صدف کو توڑ دیا     تو ہی آمادہ ظہور نہیں
**ارنی** میں بھی کہہ رہا ہوں مگر     یہ حدیث کلیمؑ و طور نہیں!

① "بال جبریل" میں شامل یہ اشعار اجتماعی سطح پر کسی مجرد خیال کے مظہر نہیں بلکہ عملاً سادہ سے اشعار ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہو کہ اقبال کے معیار کے پیش نظر غالباً یہ اشعار قدرے کمزور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انہیں ایک عام سی غزل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال پہلے شعر میں انہوں نے عقل اور عشق کے حوالے سے بات کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ محبوب کا آستانہ ایک عاشق اپنے عقلی شعور کی بنیاد پر پا تو سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کی دانش اس آستاں پر باریابی حاصل کر سکے۔ مراد یہ کہ عشق تو ایک والہانہ جذبے کا نام ہے جب کہ عقل کا مسلک استدلال ہے۔ یہی تضاد عقل اور عشق کے مابین حائل ہے۔

② اس شعر میں کہا گیا ہے کہ لازم ہے کہ حق تعالیٰ سے وہ بصیرت بھی طلب کی جائے جس سے دل روشن ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ صرف بصارت چشم ہی دل کے لئے بصارت نہیں بن سکتی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دل ہی روشن نہ ہو تو محض آنکھ کی روشنی کافی نہیں۔ عملاً بصارت اور بصیرت کے بغیر انسان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

③ علم کی تعریف بیان کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ بے شک اس میں ایک کیف آور جذبہ تو موجود

ہے لیکن اس کیف اور جذبے کی رسائی دل تک نہیں ہوتی بلکہ یہ تو دماغ تک محدود رہتا ہے چنانچہ علم دراصل عملاً ایک ایسی بہشت کی حیثیت رکھتا ہے جس میں حور تو الگ رہی اس کا تصور بھی موجود نہیں۔ علامہ نے اس سے پہلے شعر میں دل اور آنکھ کے مابین فرق کا ذکر کیا تھا جب کہ اس شعر میں وہ علم اور دل کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔

④ یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ بقول اقبال ایک شخص بھی ایسا موجود نہیں جو ذوق و شوق کا مالک ہو یعنی عشق حقیقی سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکے۔

⑤ یہ ایک انتہائی سادہ شعر ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایک جنوں تو ایسا ہے جس میں ہوش و حواس اور شعور قائم رہتے ہیں۔ جب کہ ایک جنون اس کے برعکس ہے۔ اس میں انسان ہوش و حواس اور شعور سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک حقیقی وہی ہے جس میں ہوش و حواس قائم رہ سکیں۔ یہی وہ کیفیت ہے جو عشق حقیقی تک لے جاتی ہے۔

⑥ دل میں اضطراب اور تڑپ کی موجودگی ہی دراصل دل کے زندہ ہونے کا ثبوت ہیں چنانچہ عملاً وہ دل بے حسی کا حامل ہے جس میں تڑپ اور اضطراب موجود نہ ہو۔

⑦ محبوب کی بارگاہ سے محرومی ایک طرح سے موت کے مترادف ہے اور اس کی بارگاہ تک رسائی زندگی کی دلیل ہے۔

⑧ مختلف شارح حضرات نے اس شعر کے مختلف مطالب بیان کئے ہیں لیکن آخری شعر کو پیش نظر رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تمام موتی سیپوں کو توڑ کر باہر نکل آئے لیکن ایک تو ہی ہے جس نے ظہور نہیں کیا اور ابھی تک مستور ہے۔

⑨ میں بھی حضرت موسیٰ کی مانند حق تعالیٰ سے جلوہ نمائی کی استدعا کر رہا ہوں لیکن میں اس امر کا خواہاں نہیں کہ اس کے جلوے کو دیکھ کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں۔ میں تو اسے عالم ہوش میں دیکھنے کا خواہاں ہوں۔

## (21)

042

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں!
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں!

طلسم گنبد گردوں کو توڑ سکتے ہیں
زجاج کی یہ عمارت ہے سنگ خارہ نہیں!

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلہ مرد ہیچ کارہ نہیں

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے!
کہ خاک زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

یہیں بہشت بھی ہے حور و جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخی نظارہ نہیں

مرے جنوں نے زمانے کو خوب پہچانا
وہ پیرہن مجھے بخشا کہ پارہ پارہ نہیں!

غضب ہے عین کرم میں بخیل ہے فطرت
کہ لعل ناب میں آتش تو ہے شرارہ نہیں!

معنی: زجاج: شیشہ۔

① یوں تو شاعر مشرق نے اپنے بیشتر اشعار میں خودی کو اپنا موضوع بنایا ہے لیکن اس سلسلے کی چند

نظموں میں انہوں نے بڑے تسلسل کے ساتھ فلسفہ خودی پر اظہار خیال کیا ہے جس سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک فلسفہ خودی کیا ہے اور وہ اسے انسانی فطرت کے لئے کس لئے ناگزیر سمجھتے ہیں چنانچہ اس نظم کے مطلع میں وہ خودی کی تعریف پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خودی تو ایسا بے پایاں سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ تو نے تو خودی کو ایک معمولی ندی سمجھ لیا ہے۔ یہی تیری کج فہمی اور کم ہمتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خداوند عزوجل نے انسان کو بے پناہ قوتیں عطا کی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے ان قوتوں کا ادراک نہیں ہے۔

② انسان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ آسمان کے طلسم کو توڑ کر رکھ دے۔ علامہ یہاں علامتی انداز میں بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ طلسم تو شیشے کی عمارت کے مانند ہے۔ سنگ خارا یعنی سخت پتھر کی نہیں چنانچہ سنگ خارا کے مقابلے میں شیشے کی عمارت کو توڑنا سہل ہے۔ دیکھا جائے تو اقبال نے اس شعر میں سائنسی ارتقا کے حوالے سے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ عصری سائنسدان اب اس مرحلے پر جا پہنچے کہ جس طرح وہ چاند کو تسخیر کر چکے ہیں اسی طرح آسمان کے طلسم کو بھی توڑ دیں۔

③ ایسے جانباز لوگ جو کچھ کر گزرنے کی ہمت و استطاعت رکھتے ہیں۔ ان کے روبرو اگر خودی ایک سمندر کے مانند ہے تو اس میں غوطہ لگا کر اپنی ہمت و جراءت کے طفیل پھر سے صفحہ آب پر ابھر سکتے ہیں لیکن یہ جان لینا چاہئے کہ یہ نکمے اور ناکارہ لوگوں کا نہیں ہو سکتا بلکہ جواں ہمت لوگوں سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔

④ انسان سے مخاطب ہوتے ہوئے شاعر مشرق کہتے ہیں کہ وہ لوگ جو ستارہ شناسی کے دعویدار ہیں تیرے مقام اور مرتبے کو کس طرح سے جان سکتے ہیں کہ تو تو ایک زندہ وجود ہے اور ستاروں کی تابع تو نہیں ہے اور ستاروں کا محدود علم رکھنے والے تیرے مقام کو کس طرح سے جان سکتا ہے۔

⑤ روایت تو یہی ہے کہ جبرئیل اور حور و غلماں خدائے لایزل کی پیدا کردہ بہشت میں موجود ہیں لیکن اگر تجھ میں بصیرت اور دوربینی کے عنصر موجود ہوں تو اس حقیقت کو جان لے گا کہ حور و غلماں، جبرئیل اور بہشت تو خود تیرے سامنے موجود ہیں لیکن اس کو جاننے کے لئے چشم بصیرت درکار ہے۔ بدقسمتی سے اس خصوصیت سے تو بہرہ ور نہیں ہے۔

⑥ میرا جذبہ عشق تو اس قدر حقیقت شناس ہے کہ اپنے عہد اور اس کے معاشرے سے پوری طرح سے آگاہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے سرچھپانے کے لئے وہ لباس عطا کیا جو پارہ پارہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ غالباً عملی سطح پر وہ لباس عطا کیا جو کسی طور پر بھی شکستہ اور پارہ پارہ نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ آج کے عہد کا مذاق بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔

⑦ یہ امر یقیناً حیرت کا باعث ہے کہ فطرت اپنی کرم گستری میں ان کمال تک پہنچنے کے باوجود بخل اور کنجوسی سے بعض مرحلوں میں کام لیتی ہے۔ جس کی مثال لعل خالص ہے اس کا رنگ تو انتہائی سرخ شعلوں کے مانند ہے تاہم اس میں سے کوئی چنگاری نہیں جھڑتی۔ دیکھا جائے تو یہ غیر فطری سا عمل ہے لیکن اقبال نے فطرت کے بخل کے بارے میں بات اسی حوالے سے کی ہے۔

(22)

043

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی!
تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی!
نہ دیا نشان منزل مجھے اے حکیم تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی!
مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیر تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسم کجکلاہی!
یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو، تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی!
تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہان مرغ و ماہی!
تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا!
لغت غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی!

① ان اشعار میں بھی علامہ نے خودی کے معاملات پر یوں کہا ہے کہ صبح کی خوشگوار ہوا مجھے یہ پیغام دے گئی ہے کہ جو لوگ خودی کے مقام سے آشنا ہیں۔ وہ رتبے میں بادشاہ سے کم نہیں ہوتے!۔

② اس شعر میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ زندگی میں خودی کے حوالے سے اور انسانی آبرو بھی اسی پیمانے سے ماپی جاتی ہے۔ خودی قائم ہے تو یہ جان لے کہ تیرے ہاتھ بادشاہی آگئی اور اگر قائم نہ رہی تو تیرے لئے بربادی یا رسوائی کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔

③ اے فلسفی! تو نے اپنے تمام تر علم و دانش کے باوجود منزل کے نشان سے بھی آگاہ نہیں کیا لیکن اس ضمن میں تجھ سے کسی قسم کا گلہ بے معنی ہے کہ تو خود اپنے آپ میں مگن رہنے والا ہے۔ تجھے اس سے کیا غرض کہ منزل کون سی ہے اور کیسے اس کی رہنمائی کرنی ہے۔

④ اقبال کہتے ہیں کہ میرے گرد و پیش جمع ہونے والوں میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور میں ان کی تربیت کر رہا ہوں۔ یہ درست ہے کہ لوگ ایسے درویش ہیں جو بادشاہوں کے طور طریقوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

⑤ اے صوفی! جہاں تک عقائد کے معاملات کا تعلق ہے۔ ان کی نزاکت سے میں پوری طرح آگاہ ہوں اور سوائے اس کے کہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تو نے جو خانقاہی نظام رائج کیا ہے کم از کم مجھے تو وہ پسند نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جو تیری مرضی ہے تو کر۔ یعنی پند و نصائح کی بجائے میں نے تو تجھے تیرے حال پر چھوڑ دیا ہے۔

⑥ شاعر مشرق کہتے ہیں کہ تو نے ابھی عملی زندگی میں جد و جہد کا آغاز تو کر دیا لیکن اپنے گرد و پیش کے معاملات سے آگاہی کے بغیر اس بلندی پر پہنچنے کی سعی میں مصروف ہو گیا ہے جو دیکھا جائے تو کسی طور پر بھی تیری دسترس میں نہیں لیکن تو ہے کہ اپنے گرد و پیش کو نظر انداز کر کے ایک لایعنی عمل میں مصروف ہے۔

⑨ اقبال نظم کے اس آخری شعر میں مسلمان سے مخاطب ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قطع نظر اس کے کہ تیرا تعلق عرب سے ہے یا عجم سے۔ تیرے لئے لا الٰہ الا ہی حقیقی پیغام ہے لیکن اسے محض زبان سے کہہ دینا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ تیرا دل بھی اس کی گواہی دے تو عملی سطح پر اس کی تصدیق نہ کرے تو پھر جان لینا چاہئے کہ یہ کسی ایسی زبان کا لفظ ہے جسے نہ تو سمجھ سکتا ہے نہ کسی کو سمجھا سکتا ہے۔

044

(23)

تری نگاہ فرو مایہ' ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ نخیل بلند کا ہے گناہ!

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ

حدیث دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ!

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر
یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے کلاہ!

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازی افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوال نعمت و جاہ!

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی' نہ محبت' نہ معرفت' نہ نگاہ!

**معنی: نخیل:** کھجور کا درخت۔

① یہ نظم بھی جیسا کہ پہلے نشاندہی کی گئی تھی۔ گذشتہ دو نظموں کی توسیع ہے لیکن اس میں خودی کی معنوی حیثیت قدرے مختلف ہے۔ یہاں اقبال خودی کے مقابلے میں خدا سے لو لگانے کا درس دیتے ہیں۔ نظم کے اولین شعر میں معمول کے مطابق مسلمان سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ تیری نگاہ دور رس نہیں اور ہاتھ بھی اتنا چھوٹا ہے کہ بلندی تک اس کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اگر تو کھجور کے بلند و بالا درخت سے پھل نہیں توڑ سکتا تو اس میں قصور درخت کا ہے یا تیرا! مراد یہ ہے کہ مقاصد بلند ہوں تو انسان کے حوصلے بھی بلند ہونا چاہئیں۔

② اس شعر میں اقبال نے نظام تعلیم کی خامیوں کی جانب اشارہ کیا ہے جس کے باعث مسلمان اپنی دینی تعلیم و تربیت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ تعلیم تو طلباء کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر کے رکھ دیتی ہے۔ پھر وہ نعرہ حق کیسے بلند کر سکتے ہیں۔

③ تیرے لئے اب فلاح کی راہ یہی ہے کہ خدائی جو خودی میں پوشیدہ ہے اس کو پھر سے ڈھونڈ نکال! کہ اسی میں تیری بہتری ہے۔

④ دل میں جو رازہائے درون پردہ موجود ہیں ان کے بارے میں کسی حقیقی درویش سے استفسار کر! وہی تجھے تیرے صحیح مقام سے آگاہ کر سکتا ہے لیکن اس جعلی درویش سے احتراز کر جس نے ایک نمائشی گدڑی کاندھوں پر ڈال رکھی ہے۔

⑤ اپنے سر پر کامیابی کا تاج رکھنا ہے تو پھر اپنے عزائم اور حوصلے بلند رکھ کہ بلند پروازی شاہین کی روایت ہے۔ تو بھی شاہین کی پیروی کر۔

⑥ تو جو اقتدار اور نعمتوں سے محروم ہو گیا ہے تو تقدیر آسمان و ستاروں کو اسی صورت حال کا ذمہ دار سمجھتا ہے بنیادی طور پر یہ سوچ ہی غلط ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ تو نے خودی سے رشتہ کاٹ دیا ہے اور دل عزم و حوصلے سے خالی ہو گیا ہے۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ ظاہری اور باطنی علوم کے تمام ادارے اپنے حقیقی مسلک سے محروم ہو گئے ہیں۔ نہ ان میں زندگی کی رمق باقی رہی اس کے علاوہ یہاں اب محبت و معرفت کا بھی فقدان ہے۔ یہ

ادارے تو اپنی حقیقی روح سے محروم ہو چکے ہیں۔

## (24)

045

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں!

رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں!

عروس لالہ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں!

جسے کساد سمجھتے ہیں تاجران فرنگ
وہ شے متاع ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

بڑا کریم ہے اقبال بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

**معنی:** کساد: بے رواجی بے رونقی 'اشیاء کی خریداری نہ ہونا۔ مندا پڑ جانا۔

① ہمارے دانشور اور فلسفی مستعار نظریات اور ادھر ادھر سے اکٹھی کی ہوئی باتوں کے علاوہ حقائق کے اظہار سے محروم ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ معاشرتی سطح پر جو خامیاں موجود ہیں ان کا تدارک کسی صاحب دل کی نگاہ دور رس سے ہی ہو سکتا ہے۔

② تیرا مرتبہ ہر مقام سے بلند ہے تاہم اس بھید کو پانا ناگزیر ہے کہ زندگی ایک طرح سے مسلسل جدوجہد اور عمل سے عبارت ہے۔

③ جس طرح سے موتی کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی آب و تاب سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کی قدر و قیمت خودی کے تحفظ سے ہے۔

④ زندگی فی الواقع جگر میں سوز و گداز سے لبریز ہونے کا نام ہے۔ محض رگوں میں خون کی گردش کا نام ہی زندگی نہیں! میرزا اسد اللہ غالب نے اسی مضمون کو اپنے ایک شعر میں زیادہ خوبصورتی کے ساتھ باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

⑤ یہ ایک سیدھا سادا سا رومانوی شعر ہے جس کی تشریح کی بظاہر ضرورت نہیں۔ یہاں اقبال کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب تو تو گل لالہ کی طرح سرخ ہے۔ مجھ سے حجاب کیا کہ میں تو نسیم سحر کے مانند ہوں۔

⑥ مغربی تاجر حقیقی ہنر کی قدر و قیمت کو نظرانداز کر کے نمائشی ہنر کی بدولت روزی کما رہے ہیں۔ جو باتیں عالم انسانیت کے لئے مفید ہیں انہیں پس پشت ڈال رہے ہیں حالانکہ اصل شے ہنر کی متاع ہے۔

⑦ نظم کے اس آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میرا کل اثاثہ تو عشق حقیقی ہے اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں 'میں اسی اثاثہ میں سے حسب استطاعت تقسیم کرتا رہتا ہوں۔

# (25) 046

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے! خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے!
بتوں سے تجھ کو امیدیں' خدا سے نومیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!
فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے!
فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے!
اسی خطا سے عتاب ملوک ہے مجھ پر کہ جانتا ہوں مال سکندری کیا ہے!
کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!
خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے!

**معنی: عتاب:** غصہ۔ ناراضی۔ **مال:** انجام۔ نتیجہ۔

① یہ شعر اقبال کی مخصوص فکر کا حامل ہے۔ فرماتے ہیں جو حقیقی درویش ہوتا ہے وہ اپنی بے نیازی کے طفیل سکندر جیسے شہنشاہ کی شان و شوکت کو خاطر میں نہیں لاتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ رعایا سے خراج حاصل کر کے جو لوگ اپنا خزانہ بھرتے ہیں ان کی بادشاہی کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ مراد یہ کہ ایسا حکمران تو ضرور رعایا کا محتاج ہوتا ہے۔

② کفر کی ایک جامع تعریف علامہ نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے کہ جو شخص خدا کی رحمت سے مایوس ہو کر غیر از خدا کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے حقیقتاً وہی کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔

③ حالات نے بدقسمتی سے ایسے لوگوں کو اقتدار عطا کیا ہے جو اس حقیقت سے بھی آگاہ نہیں' حقوق العباد کس شے کا نام ہے۔

④ دل کا فیصلہ تو بس ایک نگاہ سے ہی ہوتا ہے اور نگاہ میں شوخی نہ ہو تو دلبری کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

⑤ سکندر جیسے بادشاہ کے انجام سے چونکہ میں پوری طرح آگاہ ہوں اور یہی بات شاہی آمروں کو کھٹکتی ہے کہ میں اس راز سے واقف ہوں۔ بجائے اس کے کہ وہ دوسرے بادشاہوں کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔ مجھ سے بلاوجہ کی کد رکھتے ہیں۔

⑥ یہ بھی درست ہے کہ ہر شخص کو دوسروں پر فوقیت اور سرداری کے حصول کی خواہش ہوتی ہے لیکن ایسی سرداری بے معنی شے ہے جو انسان میں خودی کی موت کا سبب بنے۔ مراد یہ ہے کہ خودی کا وجود ہی سرداری کے لئے مناسب ہوتا ہے۔

⑦ اقبال کہتے ہیں میرے شعر اور شاعری کچھ زیادہ اہمیت کے حامل نہیں۔ بس یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھ میں جو درویشانہ روش ہے وہی لوگوں کو غالباً پسند آ گئی ہے اسی وجہ سے وہ میری ذات کے علاوہ میری شاعری کو بھی پسند کرتے ہیں۔

## (26)

047

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لیے ہے یہ نیستاں کے لیے!

مقام پرورش آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیر گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحر بیکراں کے لیے

نشان راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کے لیے!

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیب داستاں کے لیے

مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لیے!

① انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس کے لیے باری تعالیٰ نے دونوں جہانوں کو پیدا کیا۔ ابلیس جیسے فرشتے نے حکم خداوندی کے تحت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اسے راندہ درگاہ کر دیا گیا۔ اقبال کا یہ شعر کم و بیش اسی مفہوم کا آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے انسان! تو نہ زمیں کے لیے ہے نا ہی آسمان کے لیے! اس کے برعکس یہ جہاں تیرے لیے ہے تو جہاں کے لیے نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ قدرت نے انسان کو ہر شے سے افضل قرار دیا ہے۔ عملاً دنیا کی ہر شے انسان ہی کے تابع ہے وہ دنیا کا تابع نہیں ہو سکتا کہ یہ صورت اس کے لیے انتہائی پستی کی حامل ہے۔ اس نے تو اپنی صلاحیتوں سے پوری کائنات کو تسخیر کرنا ہے۔

② اقبال کہتے ہیں کہ عقل اور دل ایک ہی جذبے کے مظہر ہیں لیکن عقل کا دائرہ کار محدود ہے جب کہ دل کا تعلق لامتناہی سلسلے سے ہے۔ شعر کے مطابق عقل اور دل ایک طرح سے محبت کے شعلے کی چنگاریوں کے مانند ہیں لیکن جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے کہ عقل اگر چنگاری کے مانند ہے تو وہ گھاس پھونس کے ڈھیر کو آگ لگا سکتی ہے جب کہ دل کی چنگاریاں تو لامحدود جنگل کو بھسم کرنے کی صلاحیت کی حامل ہیں۔

③ یہ کائنات تو آہ و فریاد سے لبریز ہے۔ ایسی صورت میں نہ تو یہاں سیر گل کا تصور کیا جا سکتا ہے نا ہی مستقل رہائش گاہ کا۔ مراد یہ ہے کہ انسان علائق دنیوی میں مست ہو کر عشق حقیقی سے بے پرواہ ہو جائے تو یہ اس کی سب سے بڑی بھول ہے۔ اصل شے تو عشق حقیقی ہے جو منزل تک رسائی کے لیے ناگزیر ہے۔

④ اس شعر میں علامہ نے فرد کی ذمہ داریوں کو وسیع تر مفاد کے پیش نظر اس امر کی رہنمائی کی ہے کہ چھوٹی چھوٹی خواہشات میں الجھ کر زندگی کے بنیادی مقاصد سے روگردانی کرنا دانشمندی نہیں۔ حقیقی مسئلہ تو منزل تک پہنچنے کا ہے۔

⑤ وہ لوگ جو ساری دنیا کی رہنمائی کے اہل تھے افسوسناک امر یہ ہے کہ آج خود ہی گم کردہ راہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا کوئی حقیقی راہ نما نہیں۔

⑥ یہ شعر بھی اس سے قبل کے شعر کا تسلسل ہے۔ جس میں حقیقی رہنما کی صفات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اقبال کے نزدیک حقیقی رہنما وہ ہوتا ہے جو مسائل پر گہری نظر رکھتا ہو گفتگو دل میں اتر جانے والی ہو اور دل سوز و گداز سے بھرپور ہو۔
⑦ یہ شعر بھی ایک طرح سے گذشتہ دو شعروں کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے کہ یہی وہ نکات تھے جنہیں اہل عجم نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے حالانکہ اہل دانش کے لئے تو یہ باتیں سیدھی سادی سی ہیں۔
⑧ نظم کے اس آخری شعر میں اقبال نے کہا ہے کہ میری آواز میں تو ایک ایسی لے مستور ہے جسے میں نے مستقبل کے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔ اس لے میں ایسی خصوصیت ہے جو پیغمبر آخر الزماںؐ کے لئے وحی لے کر آنے والا فرشتہ جبرئیلؑ بھی سن کر تڑپ اٹھے۔ مراد یہ ہے کہ شاعر کے سخن میں کمال موجود ہو تو وہ فرشتوں کو بھی تڑپا کر رکھ دیتا ہے۔

## (27) 048

تو اے اسیر مکاں! لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں
غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں

یہ ہے خلاصۂ علم قلندری' کہ حیات
خدنگ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں!

فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

کہے نہ راہنما سے کہ چھوڑ دے مجھ کو!
یہ بات راہرو نکتہ داں سے دور نہیں

**معنی:** خدنگ جستہ: کمان سے نکلا ہوا تیر۔
① اس شعر میں اقبال انسان کی محدود سوچ کے حوالے سے بات کرتے ہیں کہ اگر وہ دور رس نگاہ کا حامل ہو تو اس کی رسائی لامکاں تک بھی ممکن ہے۔ لامکاں جو نور مطلق کی خصوصی جلوہ گاہ سے تعبیر کیا جاتا ہے چنانچہ انسان میں یہ صلاحیت موجود ہے تو اسے اس امر کی معرفت ہو سکتی ہے کہ نور مطلق کی خصوصی جلوہ گاہ زمیں سے زیادہ نہیں ہے۔
② پہلے شعر کے موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ نور مطلق کی خصوصی جلوہ گاہ تو ہمیشہ پر بہار رہتی ہے۔ اسے خزاں سے دور کا بھی واسطہ نہیں اس لئے تجھے رنجور ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ تیری دسترس سے بڑی حد تک نزدیک ہے۔ اس تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت تو اے انساں تجھ میں پیدا ہونی چاہئے!۔
③ معاملہ صرف اسی قدر ہے کہ اقبال کے مطابق قلندری کا جو فلسفہ ہے۔ اس کے مطابق کائنات کا تعلق ہر صورت میں نور مطلق کے سرچشمہ سے ضرور رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح کہ جس طرح کماں سے نکلے ہوئے تیر کا رابطہ کسی نہ کسی طور کماں سے برقرار رہتا ہے یعنی یہ کہنا کافی نہیں کہ جو تیر کمان سے برآمد ہوئے اس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ یہ تیر مخصوص کمان نے پھینکا ہے۔ اس مسئلے کو انسان کی تخلیق اور خدائے عزوجل کے حوالے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ہر صورت میں انسان کا کچھ نہ کچھ ربط خالق مطلق سے لازمی ہوتا ہے۔
④ تیرا مقام اور تیری منزل اے انسان! بے شک چاند اور ستاروں سے آگے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔

مسلسل عمل اور جدوجہد سے آگے قدم بڑھایا جائے تو یہ مقام آسمان سے زیادہ دوری پر واقع نہیں ہے اس لئے کہ چاند اور ستارے تو خود آسمان کو آراستہ کرتے ہیں۔

⑤ ایسی صورت حال میں جو رہنمائی کرنے والا منزل کی جانب لے جانے والی صلاحیتوں سے محروم ہو اور یوں منزل کے گم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو وہ رہرو جو عقل و دانش اور صورت حال کا مکمل ادراک رکھتا ہے وہ ایسے رہنما سے یقیناً منحرف ہو جائے گا جس کا تذکرہ اوپر کی سطور میں کیا جا چکا ہے۔ مراد یہ ہے کہ دنیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو مذکورہ قسم کے رہنماؤں کی بھی اندھی تقلید پر آمادہ رہتے ہیں وہ جو صحیح یا غلط بات کہے اس کو تسلیم کر لیتے ہیں لیکن وہ لوگ جو حقیقت سے بہرہ ور ہیں ایسے رہنماؤں سے اجتناب کرتے ہیں۔

## (28)

049

## (یورپ میں لکھے گئے)

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ! سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ!
نہ بادہ ہے، نہ صراحی، نہ دور پیمانہ فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزم جانانہ!
میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ!
کلی کو دیکھ، کہ ہے تشنۂ نسیم سحر اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ!
کوئی بتائے مجھے یہ غیاب ہے کہ حضور سب آشنا ہیں یہاں، ایک میں ہوں بیگانہ!
فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ!
مقام عقل سے آساں گزر گیا اقبال مقام شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ!

① یہ اشعار بھی بقول اقبال انہوں نے یورپ کے دوران قیام لکھے ہیں۔ اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ اپنی عقل سے میں فلسفیانہ انداز نظر کو حاصل کیا جب کہ عشق نے وہ طور طریقے سکھائے جو رندوں کے ہوتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ میں نے عقل اور عشق دونوں سے ہی فیض حاصل کیا ہے۔ یعنی جو شخص صاحب ادراک ہوتا ہے وہ زندگی کے ہر پہلو سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

② ایسا بھی محبوب ہو سکتا ہے جس کی محفل شراب، صراحی اور جام کی گردش کے بغیر محض اس کی نگاہ ناز سے رنگین ہو۔

③ میرے نغمے جن منتشر خیالات سے معمور ہوں انہیں شاعری نہ سمجھو کہ میں تو کائنات کے اکثر رازوں سے واقف ہوں اور وہی راز ان اشعار کے ذریعے آشکار کر رہا ہوں۔

④ میرا دل تو ایک ایسی کلی کے مانند ہے جو پھول بننے کے عمل تک نسیم صبح کی طرح معطر ہو۔ چنانچہ میں بھی اپنی تکمیل اسی صورت میں کر سکتا ہوں جب عشق حقیقی کا ادراک حاصل کر لوں۔ مطلب ہے کہ کلی کی طرح میرا دل بھی محبوب کے التفات کے بغیر شگفتہ نہیں ہو سکتا۔

⑤ اقبال کہتے ہیں کہ کوئی مجھے اس حقیقت سے باخبر کر دے کہ دنیا میں میرے علاوہ سب لوگ ہی

حقیقت شناس ہیں۔ صرف میں ہی حقیقت سے بیگانہ ہوں۔ نہ جانے یہ محبوب کی بارگاہ میں باریابی کا اثر ہے یا وہاں تک رسائی نہ ہونے سے محرومی کا!۔

⑥ یورپ میں شاید چند دن اور قیام کر لیتا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہاں ایسا ماحول موجود نہیں جس میں میرا نقطہ نظر سمجھا جا سکے۔

⑦ نظم کے اس آخری شعر میں علامہ فرماتے ہیں کہ عقل کی منزل سے تو میں با آسانی گزر گیا لیکن مقام عشق سے گزرتے ہوئے بے شمار رکاوٹیں در آئیں۔ مراد یہ ہے عقل و خرد کے مقابلے میں عشق کی منزل بڑی کٹھن ہے۔

## 050 (29)

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

احوال محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز و تب و تاب اول سوز و تب و تاب آخر!

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول' طاؤس و رباب آخر!

میخانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر!

کیا دبدبہ نادر' کیا شوکت تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرق مے ناب آخر!

خلوت کی گھڑی گزری' جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوش سحاب آخر!

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر!

**معنی: امم:** امت کی جمع۔ قومیں۔ **طاؤس و رباب:** دو سازوں کا نام۔ **نادر:** ایران کا مشہور بادشاہ۔ نادر شاہ افشار۔

① آسمانوں سے بالآخر بقول اقبال میری فریاد کا جواب آنے لگا ہے۔ نور مطلق کے حجابات بھی اٹھنے لگے ہیں اور میرا محبوب مجھ سے مخاطب بھی ہونے لگا ہے۔ یہ شعر فی الحقیقت معرفت الٰہی کا مظہر ہے۔

② دراصل اظہار محبت کے معاملات میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ اس کے آغاز میں سوز و گداز اور اضطراب سے عاشق کو واسطہ پڑتا ہے اور اس کا انجام بھی انہی جذبوں پر ہوتا ہے۔

③ میرے لئے یہ بتانا چنداں مشکل نہیں کہ قوموں کی تقدیر کس طرح عروج و زوال کے مراحل سے گزرتی ہیں کہ ان کا عروج اس وقت تک قائم رہتا ہے کہ جب تک وہ ہتھیاروں سے مسلح ہو کر دشمن سے میدان جنگ میں نبرد آزما رہتی ہیں۔ بالفاظ دگر عملی جدوجہد میں مصروف رہتی ہیں اور ان مراحل سے گزرنے کے بعد جب وہ عیش و عشرت اور راگ رنگ میں مصروف ہو جائیں تو یہ سمجھ لو کہ ان کا زوال شروع ہو گیا۔

④ اس شعر میں اقبال نے غیر ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ یورپ کے طرز عمل اور اس کی نفسیات سے آگاہ کیا ہے کہ یہاں کے استعمار پسند طبقے ضرورت مند ممالک کو پہلے ہمدردی اور دولت کی جھلکیاں دکھاتے ہیں اس کے بعد اپنے مفاد کی تکمیل کے لئے کچھ مادی امداد بھی فراہم کر دیتے ہیں تا کہ ان پر تسلط برقرار رہے۔ مراد یہ کہ پہلے تو ترقی پذیر قوموں کو حرص و ہوس کے دام میں پھنساتے ہیں اور اس کے بعد

دکھاوے کے لئے کچھ مدد بھی کر دیتے ہیں۔
⑤ نادر شاہ اور تیمور جیسے حکمرانوں کے دبدبے اور شوکت کو بالآخر شراب و کباب نے تباہ کر کے رکھ دیا مراد یہ کہ جب تک حکمران باعمل اور جدوجہد میں مصروف رہتے ان کے عروج کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن جب عیش و عشرت میں پڑ گئے تو پھر یہ عروج' زوال میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ نادر شاہ اور تیمور دونوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔
⑥ اب وہ مرحلہ آ گیا ہے کہ محبوب حجاب سے نکل کر عام سطح پر جلوہ گر ہو گیا ہے۔ بالکل اسی طرح کہ برق بادلوں میں چھپی رہتی ہے تو اس کا پتہ نہیں چلتا لیکن بادلوں سے نکل کر اس کی چمک ماحول کو خیرہ کر دیتی ہے۔
⑦ نظم کے اس آخری شعر میں اقبال خود کو قلندر سے منسوب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے لئے اب ضبط کرنا مشکل ہو گیا اسی لئے میں نے قرآن پاک کے اسرار و رموز اپنے اشعار میں بیان کر دیئے۔

## (30)

051

ہر شے مسافر ہر چیز راہی! کیا چاند تارے' کیا مرغ و ماہی!
تو مرد میداں تو میر لشکر نوری حضوری تیرے سپاہی!
کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی یہ بے سوادی یہ کم نگاہی!
دنیائے دوں کی کب تک غلامی یا راہبی کر' یا پادشاہی!
پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے کردار بے سوز! گفتار واہی!

**معنی:** بے سوادی: بے عملی۔ واہی: بے سروپا۔
① اس دنیا کی ہر شے مسافرت کے عالم میں ہے اور متحرک ہے۔ ان میں خواہ چاند اور ستارے ہوں یا پھر مچھلیاں اور پرندے! اب کے سب سفر میں ہیں۔
② اے عظیم المرتبت انسان! اس دنیا میں تیری حیثیت سب سے زیادہ بلند اور میر لشکر کی طرح ہے جب کہ فرشتے اور قدسی تیرے لشکر کے سپاہی اور تابع فرمان ہیں۔
③ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ تو اپنے مرتبے سے خود آگاہ نہیں ہے اس کا ثبوت تیری بے عملی اور کج نگاہی ہے جس کے سبب تو اس شعور و ادراک سے محروم ہو کر رہ گیا ہے جو قدرت نے تجھے ودیعت کیا تھا۔
④ تو کب تک اس دنیا کی غلامی کرتا رہے گا اس سے نجات حاصل کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو رہبانیت اختیار کر کے علائق دنیوی سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جا! یا پھر عملی جدوجہد کر اور ہمت و تدبیر سے کام لے کر دنیا کو تسخیر کر لے اور اپنی حکمرانی قائم کر! صرف انہی صورتوں میں تو غلامی سے نجات پا سکتا ہے۔
⑤ میں تو اس شیخ حرم کو بھی دیکھ چکا ہوں جو کعبے کا متولی ہے اور جسے اسلامی دنیا اپنا روحانی رہنما تصور کرتی [illegible] کی حالت یہ ہے کہ بے عمل ہے۔ سیرت و کردار کے اعتبار سے سچائی اور حقیقت سے

بے بہرہ! حد تو یہ ہے کہ اس کی گفتگو تک بے سروپا اور لغو ہوتی ہے۔

052 (31)

ہر چیز ہے محو خود نمائی ہر ذرہ شہید کبریائی!
بے ذوق نمود زندگی موت تعمیر خودی میں ہے خدائی!
رائی زور خودی سے پربت پربت ضعف خودی سے رائی!
تارے آوارہ و کم آمیز تقدیر وجود ہے جدائی!
یہ پچھلے پہر کا زرد رو چاند بے راز و نیاز آشنائی!
تیری قندیل ہے ترا دل تو آپ ہے اپنی روشنائی!
اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں! باقی ہے نمود سیمیائی!
ہیں عقدہ کشا یہ خار صحرا
کم کر گلۂ برہنہ پائی!

**معنی:** نمود سیمیائی: ایسی نمائش جو حقیقت سے خالی ہو۔ لیکن اصل میں کچھ نہ ہو۔

① عجیب بات ہے کہ اس دنیا میں ہر شے خود کو نمایاں کرنے میں مصروف ہے۔ اور ایک معمولی ذرہ بھی خود کو بڑا بنانے کی تگ و دو کر رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے نمائش کا شکار ہے اور اپنی حقیقت سے بے نیاز ہو کر رہ گئی ہے۔

② اس کے برعکس یہ بھی درست ہے کہ زندگی میں ذاتی کمالات کی نمائش کا جذبہ موجود نہ ہو تو پھر ایسی زندگی یقیناً موت کے مانند ہے۔ دیکھا جائے تو خودی کی تعمیر میں ہی خدائی اوصاف پوشیدہ ہوتے ہیں۔

③ ایک معمولی سے انسان میں بھی خودی کا جذبہ پرورش پا رہا ہو تو پہاڑ کی مانند بلند و مستحکم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اس میں خودی نہ ہو تو وہ کسی بھی حیثیت کا حامل نہیں رہتا۔

④ ستاروں کا جائزہ لو تو اندازہ ہو گا کہ وہ آسمان کو درخشاں کرنے کے باوجود ایک دوسرے سے الگ الگ آوارہ و سرگرداں پھر رہے ہیں۔ اس سے یہ مطلب اخذ کرنا مناسب ہو گا کہ کسی بھی شے کا مقدر جدائی کا حامل ہوتا ہے۔

⑤ رات کے پچھلے پہر میں چاند کا چہرہ زرد نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ آشنائی کے راز و نیاز سے واقف ہی نہیں اور ستاروں سے جدائی کا خوف اس پر مسلط ہو گیا ہے۔

⑥ اس شعر میں اقبال انسان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تیرا دل تو قندیل کی طرح سے روشن ہے تو یقیناً کسی قسم کی چاندنی کا محتاج نہیں بلکہ تو تو خود ہی چراغ راہ کی طرح روشنی سے معمور ہے۔

⑦ محض اک تیری ذات ہی ہے جو اس دنیا میں حقیقی وجود کی حامل ہے۔ اس کے سوا اور جو کچھ ہے وہ مصنوعی ہونے کے ساتھ واہمہ اور خیال کی کرشمہ سازی ہے۔ ان تمام اشعار میں علامہ نے موجود اشیاء کے بالمقابل انسانی عظمت کو پیش کیا ہے اور کسی طور پر بھی دوسری اشیاء کے مقابلے پر انسان کے احترام و وقار کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی ہے۔

⑧ اس آخری شعر میں بھی اقبال انسان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو اپنے سامنے کی مشکلات اور مسائل سے نہ گھبرا کہ ان مشکلات و مسائل سے عہدہ بر ہونا ہی تو جہد مسلسل اور عزم و ہمت کی دلیل ہے۔ یہ درست ہے کہ ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے تیرے پاس وسائل محدود ہیں۔ اس کے باوجود تو اس امر کی صلاحیت رکھتا ہے کہ ان محدود وسائل کو ہی عروج کا زینہ بنائے۔

## 053 (32)

اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ! ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ!
تعمیر آشیاں سے میں نے یہ راز پایا اہل نوا کے حق میں بجلی ہے آشیانہ!
یہ بندگی خدائی' وہ بندگی گدائی یا بندہ خدا بن یا بندہ زمانہ
غافل نہ و خودی سے کر اپنی پاسبانی شائد کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ!
اے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں گفتار دلبرانہ' کردار قاہرانہ!
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے! کھویا گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ!
راز حرم سے شاید اقبال باخبر ہے ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ!

① اس نظم کے مطلع میں اقبال اپنے عہد کی عالمی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یورپ کی نئی ایجادات اور عسکری قوت کے باوجود آج پورے ایشیائی ممالک میں اس کے خلاف مزاحمتی تحریکوں کا زور شور سے جاری ہونا جہاں ان ممالک کے لوگوں کی بیداری کی دلیل ہے وہاں یورپی استعمار کی عملاً ناکامی کو یا تو زمانے کی گردش کہا جا سکتا ہے یا پھر معجزے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

② اس شعر میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ جو آزادی اور زندگی کا مکمل شعور اور ادراک رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ غیر ضروری بار خود پر مسلط کرنے کے مقابلے میں بے سروساماں رہنا بھی بہتر ہے۔ یہی ایک سچے انسان کی شان بے نیازی ہے۔

③ ایک بندگی تو خدائے عزوجل کے سایہ عاطفت میں حاصل ہونے والی شے ہے اور دوسری بندگی محض مادی مفادات تک محدود ہوتی ہے۔ یہ بندگی کی دو حقیقتیں ہیں۔ اے انسان! اب یہ تیری صوابدید پر منحصر ہے کہ تو خدا کا بندہ بنتا ہے یا مادی مفادات کے لئے زمانے کا!۔

④ اپنی خودی کا تحفظ کر اور اس سے غافل نہ ہو جا کہ شاید یہی خودی تیرے لئے عزت و وقار کا وسیلہ بن جائے۔

⑤ اے تمام دنیا کو توحید کا پیغام دینے والے شخص! تجھ میں نہ اپنے اور غیروں کے ساتھ مکالمہ کرنے کی صلاحیت رہی ہے نا ہی تو اس کردار کا مالک رہا ہے جو میدان عمل میں تیری بلند سیرت کا مظہر ہو۔

⑥ حالانکہ امر واقع یہ ہے کہ تو جس پر اپنی قاہرانہ نگاہ ڈالتا تھا اس کا سینہ خوف سے دہل جاتا تھا۔ لیکن اب افسوسناک امر یہ ہے کہ درویشی کی یہ صلاحیت بھی تجھ میں ختم ہو کر رہ گئی۔

⑦ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بقول اقبال میں کعبے کے بھیدوں سے پوری طرح واقف ہو چکا ہوں۔ حرم کے تمام راز مجھ پر منکشف ہو چکے ہیں۔ اس لئے کہ لوگوں کے نزدیک میں ان سے جو مکالمہ کرتا ہوں اس

کا ماحصل یہی ہے۔

## (33)

054

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے!
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے!
مقام گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں
یہی سوز نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے!
نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں
نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے وہ چشم سرمہ سا کیا ہے!
اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے!
نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے؟

① اس شعر میں اقبال نے انسان کے وجود میں آنے اور اس کے مقاصد زندگی کے حوالے سے اشارتاً بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حقیقت سے تو ہر شخص آگاہ ہے کہ وہ کس طرح سے تخلیق کیا گیا لیکن میرے نزدیک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کیوں تخلیق کیا گیا اور پیدائش سے موت تک کا جو سفر ہے۔ اس کے مقاصد کیا ہیں۔ اس کا نصب العین کیا ہے؟ یہی وہ بنیادی سوال ہے جس کا صحیح جواب انسان اور معاشرے میں انقلاب کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔

② یہ شعر اقبال کے ان اشعار میں سے ہے جنہیں ضرب الامثال کی حیثیت دی جاتی ہے۔ اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ انسان خودی کو انتہائی بلندی اور عروج پر لے جائے تو خالق دو جہاں اس پر مہرباں ہو کر اپنی رضا اور اس انسان کی سوچ میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے۔ یہ مقام خدا سے انسان کی انتہائی قربت کی دلیل ہے۔

③ میرے اقوال اور اشعار میں جو تاثر اور سوز و گداز موجود ہے اس کے بارے میں استفسار بے معنی سی بات ہے۔ میں انسان سے محبت کرتا ہوں اس کے اور اقوام کے مسائل کا ہمدردی اور سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیتا ہے۔ یہی رویہ بقول اقبال میرے کلام میں وہ تاثر اور سوز و گداز پیدا کرتا ہے جس کو سن کر یا پڑھ کر کوئی بھی شخص اپنے آپ کو حقیقی زندگی میں بدلنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

④ جب میں نے اپنے محبوب کی خوبصورت آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش کی تو مجھے حقیقی صورت حال کے بارے میں کسی حد تک اندازہ ہوا اور میں اسی قدر جان سکا کہ اس کے ذہن میں میری قدر و قیمت کیا ہے؟ مراد یہ ہے کہ حقیقی عشق میں حبیب اور محبوب کے وجود کا ہر جزو ان کے جذبوں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور معمولی سی کوشش سے اس امر کا اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ محبوب کے دل میں کیا ہے اس کی سوچ کیا ہے؟۔

⑤ اس شعر میں اقبال نے نطشے کے فلسفیانہ نقطہ نظر کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر نطشے میرے عہد میں ہوتا تو میں اس کو "مقام کبریا" سے ضرور آشنا کرتا۔ اقبال نے اپنے اشعار اور نثری تحریروں میں نطشے کے فلسفیانہ افکار کا کئی مقام پر ذکر کیا ہے۔ یہ وہ فلسفی تھا جس نے غالباً سب سے پہلے "سپرمین" یعنی فوق البشر کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق دنیا کی سب سے بڑی نیکی قوت ہے اور طاقتور انسان ہی کو یہ

حق حاصل ہے کہ کمزور لوگوں پر حکومت کرے۔ اقبال کے نزدیک نٹشے میں ایمان کا جوہر تو موجود تھا لیکن اس کوئی حقیقی رہنما نہ مل سکا۔ مزید یہ کہ ذاتی فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ میرے عہد میں وہ زندہ ہوتا تو "فوق البشر" کی تعریف اسے بتاتا کہ روحانی سطح پر ہی سیرت و کردار کی تعمیر سب سے بڑی نیکی ہے اور اسی کے ذریعے انسان "فوق البشر" بن سکتا ہے۔ نیز مقام کبریا سے بھی آگاہ ہو سکتا ہے۔

⑥ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ جب میں صبحدم بیدار ہوتا ہوں اور معاشرتی صورت حال کا منظر سامنے آیا بالخصوص مسلمانوں کی پستی اور زوال کے بارے میں سوچتا ہوں تو دل خون ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے لاشعوری طور پر خدا سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ اے پالنے والے! آخر میں نے ایسی کون سی خطا کی تھی جس کی یہ سزا مجھے مل رہی ہے؟

## (34)

055

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی!

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی!

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی!

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

**معنی:** کم کوش: لفظی معنی تھوڑی کوشش کرنے والے یعنی تن آسان۔ طائرِ لاہوتی: علمِ تصوف میں روحانی ترقی کی آخری منزل لاہوت ہے یعنی وہ مقام جہاں ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ گویا لاہوت کا مطلب ہے انتہائی بلند مقام۔ طائرِ لاہوتی وہ پرندہ جو روحانی ترقی کے بلند ترین مقام پر اڑنے والا ہو۔

① عشق ہی وہ حقیقت ہے جو انسان کو معرفتِ ذات سے آشنا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ غلاموں کو بھی اس حقیقت کا ادراک ہو جائے تو شہنشاہی کے رازوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان میں وہ جوہر پیدا ہو جاتا ہے جو غلامی کی نفی کا اہل ہوتا ہے۔

② اس شعر میں اقبال خواجہ فرید الدین عطار، مولانا روم، امام رازی اور امام غزالی جیسے صوفی دانشوروں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تنہا علم زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے انقلابی سوچ اور عمل درکار ہوتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ معرفتِ الٰہی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

③ یہاں اقبال اہلِ دانش راہ نماؤں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ بے شک تمہارے مقلدین تن آسان اور بے عمل ضرور ہیں۔ ان میں پہلے سی جفاکشی بھی باقی نہیں رہی۔ پھر بھی ان سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کہ صحیح رہنمائی پر ان میں عمل کی صلاحیت بہرحال موجود ہے۔

④ اقبال کا یہ شعر بھی عام طور پر زبان زدِ عوام ہے جس میں انہوں نے علامتی حوالے سے خیال ظاہر

کیا ہے کہ اس رزق سے موت بہتر ہے جو عملی جدوجہد کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ یعنی ایسا رزق جو کشکول گدائی کے ذریعے حاصل ہو تو اس کے بجائے تو مرجانا بہتر ہے۔ اس لئے کہ پاکیزہ رزق وہ ہے جو قوت بازو سے حاصل کیا جائے اس میں کسی دوسرے کی عنایات کا شائبہ تک نہ ہو۔ اس شعر میں علامہ نے اپنے نقطہ نظر کو بڑے عالمانہ اور حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

⑤ وہ مرد درویش تو دارا و سکندر جیسے عظیم المرتبت بادشاہوں کے مقابلے پر اعلیٰ مرتبے کا حامل ہے۔ جس درویشی میں شیر خدا حضرت علیؓ کی حاکمانہ بصیرت اور اولالعزمی کی جھلکیاں موجود ہوں۔ مراد یہ ہے کہ وہ مرد درویش جو علی مرتضیٰؓ کی صفات سے استفادہ کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے وہ بڑے بڑے عالی مرتبت بادشاہوں سے بھی بلند مرتبہ رکھتا ہے۔

⑥ یہ شعر بھی اقبال کے ان مشہور اشعار میں سے ہے جو زبان زد خواص و عوام ہی۔ اس شعر کی شرح کچھ اس طرح سے ہے کہ جوانمردوں کا مسلک تو انتہائی جراءت مندانہ انداز میں صداقت کا اظہار کرنا ہے اس لئے کہ ایسے لوگ تو شیروں کی سی فطرت کے حامل ہوتے ہیں جن میں لومڑیوں کے مانند بزدلی اور مکاری کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

## (35)

056

مجھے آہ و فغان نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا!

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغ بے نیام آیا!

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا!

چل اے میری غریبی کا تماشا دیکھنے والے!
وہ محفل اٹھ گئی جس دم تو مجھ تک دور جام آیا!

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا!

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیر دام آیا!

① زندگی میں شاید پھر کوئی ایسا مشکل مقام آ پہنچا ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے میرے لئے نصف شب کے وقت بیدار ہو کر بارگاہ ایزدی میں دعا اور فریاد کا پیغام ملا ہے کہ اس نوع کی مشکلات سے گزرنے کا طریق کار ہی یہی ہے۔

② اقبال کہتے ہیں کہ تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب کر میں اب ایسی تلوار کے مانند برآمد ہوا ہوں جو نیام کی حامل ہی نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ اہل ملت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم بھی اسی طریق پر عمل کر کے مجھ جیسے ہو جاؤ۔

③ اس شعر میں سجدے اور قیام کی علامتوں کے حوالے سے اقبال نے کہا ہے کہ اب صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ جب مسلمانوں کے لئے جدوجہد اور عمل کا وقت آتا ہے تو ان کے ارادے کمزور پڑ جاتے اور عزم و حوصلہ جواب دے جاتے ہیں یعنی بے عملی نے ان پر مایوسی کی فضا طاری کر دی ہے۔

④ حضرت علی مرتضیٰؓ کا قول ہے کہ جس کا کوئی دوست نہیں ہوتا' غریب ہوتا ہے۔ اس شعر میں اقبال نے اپنی غربت کا ذکر غالباً اسی حوالے سے کیا ہے کہ میری غربت کا تماشا دیکھنے والے شاید حقیقت سے آگاہ

نہیں ہیں کہ لوگ تو اب محفل سے رخصت ہو چکے ہیں جو میرا پیغام سننے کے اہل تھے۔

⑤ میں نے اپنا تمام سوز دروں ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں منتقل کر دیا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ اشعار قیام پاکستان کے قبل سے ہیں) چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ میں تو خود ایک کمزور اور بے عمل شخص تھا اور ہندی مسلمانوں کی صفات بھی کچھ اسی نوعیت کی ہیں سو انہیں پیغام پہنچانے والا بھی ایک تن آسان شخص مل گیا۔

⑥ میں برسوں سے اسی اقبال کی تلاش میں تھا میرے باطن سے جس کا تعلق ہے اور جو شاہیں صفت ہے تاہم خوش قسمت ہوں کہ ایک مدت کے بعد اپنے دام میں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں!

## (36)

057

نہ ہو طغیان مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے؟ یہی طغیان مشتاقی!

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے
ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی!

وہ آتش آج بھی تیرا نشیمن پھونک سکتی ہے
طلب صادق نہ ہو تو تیری تو پھر کیا شکوہ ساقی!

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی!

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو انداز آفاقی!

خزاں میں بھی کب آ سکتا تھا میں صیاد کی زد میں
مری غماز تھی شاخ نشیمن کی کم اوراقی!

الٹ جائیں گی تدبیریں، بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!

**معنی:** **طغیان:** طوفان۔ سیل۔ **براقی:** بجلی جیسی چمک دمک۔ **خلاقی:** تخلیق۔ پیداوار۔

① اقبال کہتے ہیں کہ میرا دل میں جذبہ عشق ایک طوفان کے مانند موجزن ہے اس لئے کہ عشق میری فطرت کا بنیادی مسئلہ ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ میرے دل میں اگر عشق موجزن نہ ہو تو اس حالت میں میں زندہ نہیں رہ سکتا کہ عشق کا یہی طوفان تو میری زندگی کو متحرک رکھتا ہے۔

② میری فطرت شاید اسی لئے شعری تخلیق پر مجبور کرتی رہتی ہے کہ ابھی دنیا میں کچھ لوگ ایسے باقی ہیں جو میرے اشعار اور ان میں پوشیدہ پیغام کو سمجھنے کے اہل ہیں۔

③ جس طرح عشق حقیقی نے تیرے اسلاف کے دل میں گھر کر لیا تھا اسی طرح یہ تیرے دل میں گھر کر سکتا ہے لیکن اس کے لئے طلب صادق کی ضرورت ہے۔ طلب صادق ہی موجود نہ ہو تو پھر خدا سے گلہ کیسا؟

④ اس سے بڑی حماقت کیا ہے کہ تو تہذیب مغرب میں خوبیاں اس کی ظاہری چمک دمک سے کر رہا ہے۔ یہ تو سراسر جعلی نمائش ہے اور جس طرح بجلی کا چراغ روشن ہو تو ماحول بھی منور ہو جاتا ہے لیکن بجلی بند ہونے پر بالآخر تاریکی ہی پھیل جاتی ہے۔ تہذیب مغرب کی چمک دمک کی مثال بھی کچھ اسی نوعیت کی ہے۔

⑤ دلوں میں تمام عالم کو تسخیر کرنے کا جذبہ اسی صورت میں بیدار ہوتا ہے کہ نگاہوں میں عالمگیری کا انداز بھی پیدا ہو جائے۔

⑥ انتہائی برے حالات میں بھی میں دشمن کے تیروں کا ہدف نہیں بن سکتا لیکن بدقسمتی سے وسائل بھی ختم ہو گئے یوں میں اس کا نشانہ بن گیا۔

⑦ حالات اس امر کی غمازی کر رہے ہیں کہ جو ہم نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے جو تدبیریں کی ہیں وہ بھی بدل کر رہ جائیں گی اور ایک بار پھر تقدیر بھی پلٹا کھائے۔ یہ نکتہ محض میرے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ سامنے کی حقیقتوں پر مبنی ہے۔ مراد یہ ہے کہ معاشرے میں اس تیزی کے ساتھ تبدیلیاں آ رہی ہیں کہ سب کچھ الٹ پلٹ کر رہ جائے گا۔

## (37)

058

فطرت کو خرد کے روبرو کر تسخیر مقام رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بیکرانہ تو بھی یہ مقام آرزو کر
عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں چاک گل و لالہ کو رفو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت جو اس سے نہ ہو سکا' وہ تو کر!

① دنیا کی تسخیر کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ اپنی فطری صلاحیتوں کے ساتھ عقل سلیم سے بھی کام لے اسی صورت میں تو کامیابی کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔

② یوں محسوس ہوتا ہے کہ تو نے اپنی خودی کو ضائع کر دیا ہے اگر تو کامیابی کے مراحل طے کرنے کا خواہاں ہے تو پھر اس کھوئی ہوئی شے کو پھر سے تلاش کر لے۔ مراد یہ کہ خودی وہ جوہر ہے جس کے بغیر انسان زندگی میں کسی مرحلے پر بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

③ جس طرح آسمان کی وسعتوں میں لامحدود طریق پر ستارے دمک رہے ہیں تو بھی اپنی صلاحیتوں کو اسی نوع کی وسعت سے ہم کنار کر!

④ تیری دنیا کی کتنی دوشیزائیں مکمل لباس سے محروم ہیں۔ تیرے لئے لازم ہے کہ ان کی تن پوشی کا اہتمام کرے۔

⑤ ہر چند کہ فطرت بھی بے ذوق نہیں ہے اس کے باوجود جو کام وہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکی اسے تو اپنی جدوجہد اور عمل سے مکمل کر لے۔

## (38)

059

یہ پیران کلیسا و حرم! اے وائے مجبوری! صلہ ان کی کد و کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری!
یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے وہ درویشی' کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!
کبھی حیرت' کبھی مستی' کبھی آہ سحرگاہی' بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا درد مہجوری!
حد ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی سمجھ میں اس قدر آیا کہ دل کی موت ہے دوری!

وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبور پیدائی
مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسباب مستوری!
کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکان عثمانی سے کم ترکان تیموری!
فقیران حرم کے ہاتھ اقبال آ گیا کیونکر!
میسر میر و سلطاں کو نہیں شاہین کافوری!

**معنی: فغفوری**: فغفور چین کے بادشاہ کا لقب تھا۔ مراد ہے شہنشاہی۔ **پیدائی**: ظہور۔ **شاہین کافوری**: سفید رنگ کا شہباز جو بہت کمیاب ہے۔

① اقبال نے اس شعر میں کلیسا اور حرم کے پیشوا کی بے عملی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا سینہ چونکہ عشق الٰہی سے خالی ہے اس لئے انہوں نے مذہب کے حوالے سے جو بھی کوششیں کیں وہ بیکار گئیں۔ مراد یہ کہ ان لوگوں نے اشاعت دین کا جو طریقہ اختیار کیا وہ رائیگاں گیا۔ اس لئے کہ لوگ خود دین سے مخلص نہ تھے۔

② یقین کامل کے بغیر درویشی بھی ہاتھ نہیں آتی۔ اے بے خبر! یاد رکھ کہ یقین کامل ہی بادشاہی کا حصول ممکن ہے۔

③ محبوب کے عشق میں انسان کے سامنے کیسے کیسے مرحلے آتے ہیں۔ کبھی حیرت اور مایوسی اس کا مقدر بن جاتی ہے؟ کبھی وصال محبوب سے مست ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ساری ساری رات جاگ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل کتنے ہی رنگ بدلتا رہتا ہے۔

④ عشق و مستی کا معاملہ دیکھا جائے تو انسانی فہم سے بالاتر ہے۔ بات جو سمجھ میں آتی ہے محض اسی قدر! کہ محبوب سے دوری کا عمل دل کے لئے موت کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

⑤ محبوب تو اپنے حسن کو ہر نہج پر نمائش کرتا رہتا ہے۔ لیکن میرے پیش نظر یہ ہے کہ وہ کس حد تک حجاب میں رہے۔

⑥ تقدیر کے معاملات کوئی بھی سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کا اندازہ یوں ہوتا ہے کہ ترکان عثمانی سے ترکان تیموری یعنی مغل کسی اعتبار سے بھی کم نہ تھے لیکن اول الاذکر نے اپنی عملی جدوجہد اور اتفاق و اتحاد سے چھینا ہوا اقتدار واپس لے لیا جب کہ مغل اپنی حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

⑦ حرم کے درویشوں کے ہاتھ اقبال آج نہ جانے کیسے آگیا۔ یہ تو سفید رنگ کے شہباز کی مانند ہے جس پر بادشاہوں اور امراء کی دسترس بھی نہیں ہوتی۔ واضح رہے کہ سفید رنگ کا شہباز انتہائی کمیاب پرندہ ہے جو کسی خوش قسمت انسان کے ہاتھ آجاتا ہے۔

## (39)

060

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم!
عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا ہے' نہ زاہد' نہ حکیم!
عیش منزل ہے غریبان محبت پہ حرام
سب مسافر ہیں بظاہر نظر آتے ہیں مقیم!
ہے گراں سیر غم راحلہ و زاد سے تو
کوہ و دریا سے گزر سکتے ہیں مانند نسیم!

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ! ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم

**معنی: دانش حاضر**: موجودہ زمانے کا فلسفہ اور سائنس۔ **چوب کلیم**: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساحروں کا جادو باطل ہوگیا۔ **گراں سیر**: وہ مسافر جو بوجھ کی زیادتی کے باعث تیز نہ چل سکے۔ **راحلہ وزاد**: سواری اور راستے کا خرچ۔ **نصاب**: وہ مقدار مال جس پر زکوٰۃ واجب ہو۔

① عہد جدید کے سائنس اور فلسفے کی بنا پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ دور قدیم پھر سے رونما ہوگیا ہے۔ اس کی مثال حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے دور سے دی جاسکتی ہے کہ اس زمانے میں ساحروں نے اپنے فن میں کمال حاصل کرلیا تھا۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے خلاف ان ساحروں کو استعمال کیا لیکن انہوں نے عصائے موسوی سے فرعون اور اس کے ساحروں کا تمام طلسم بے کار کرکے رکھ دیا۔ آج کے سائنس و فلسفے کی تباہ کاریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بقول اقبال عصائے موسوی کی ضرورت ہے۔

② ملاؔ، زاہد اور اہل دانش اپنی عقل کی عیاری کے سبب حسب ضرورت رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے برعکس عشق کا جذبہ سادگی کا مظہر ہے جسے فریب کاری نہیں آتی۔

③ محبت کرنے والے لوگوں پر تو منزل تک پہنچنے کے لئے کسی مرحلے پر بھی ٹھہرنا حرام ہے۔ اگر کہیں قیام بھی کریں تو بھی متحرک نظر آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ عشق و محبت میں سکون ممکن نہیں!

④ انسان کو مخاطب کرکے اقبال کہتے ہیں کہ تو نے منزل تک رسائی کے لئے سواری اور زادراہ کا بار اٹھا رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیری رفتار سست ہوگئی ہے اور جو زادراہ سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ کسی تاخیر کے بغیر پہاڑوں اور دریاؤں کو بھی پار کرجاتے ہیں۔

⑤ مرد درویش تو آزادانہ زندگی گزارنے کا قائل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انجام تو بالآخر موت ہی ہوتا ہے لیکن جو دنیادار لوگ ہیں وہی مال و دولت اور سونے چاندی جمع کرنے کی ہوس رکھتے ہیں۔ آزاد زندگی کا تصور ان کے لئے ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

## (40)

061

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں!
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں!
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!

① اگر ان اشعار کو باقاعدہ غزل کے اشعار سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اپنے موضوعات اور فورم کے اعتبار سے یہ ایک مکمل غزل ہے۔ مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح ستاروں سے آگے اور بھی دنیاؤں کی نشاندہی کی گئی ہے اس طرح سے عشق میں آزمائشوں کا سلسلہ بھی جاری و ساری رہتا ہے۔ اور

آزمائش کی یہ منزلیں اختتام پذیر نہیں ہوتیں۔

② دوسرے شعر کا مضمون بھی پہلے شعر سے کافی حد تک مشابہت رکھتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بظاہر جو فضائیں زندگی سے خالی نظر آتی ہیں لیکن واقعاتی سطح پر ایسا نہیں ہے۔ ان فضاؤں میں ہزاروں قافلے رواں دواں نظر آتے ہیں اور پوری فضا زندگی سے لبریز ہے۔

③ اس عالم رنگ و بو پر جسے دنیا سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی پر قناعت نہ کر کہ اس سے آگے بھی بہت سی جیتی جاگتی دنیائیں موجود ہیں۔

④ اگر ایک آشیانہ کسی حادثے کے باعث ختم ہو گیا تو اس کا غم کرنا بے سود ہے اس لئے کہ ہجر محبوب میں آہ و زاری کے لئے کوئی ایک مقام تو مخصوص نہیں بلکہ اور بھی مقامات ہیں۔

⑤ اے انسان! تو تو شاہیں صفت ہے جس کا منصب پے بہ پے عروج و ترقی کی منزلیں طے کرنا ہے اور یہ منزل ایک آسماں تک دور نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی آسمان موجود ہیں۔ مراد یہ ہے کہ انسان عروج وارتقاء کے مراحل سے گزرتا ہے تو اس کے لئے محض ایک حد نہیں بلکہ وسیع امکانات موجود ہیں۔

⑥ اقبال کہتے ہیں کہ اے انسان جو حدود تیرے روبرو ہیں انہی میں الجھنے پر اکتفا نہ کر! اس لئے کہ اس کے علاوہ بھی زمان و مکان کی وسعتیں موجود ہیں و تیری جولانگاہ ہیں۔

⑦ وہ دور ختم ہوا جب یہ دنیا اہل ذوق سے خالی ہو گئی تھی اور بقول اقبال میری حکیمانہ باتیں سننے پر کوئی آمادہ نہیں ہوتا تھا لیکن اب تو صورت حال بڑی حد تک مختلف ہے۔ یہاں کچھ ایسے اہل ذوق موجود ہیں جو میری باتوں کو سنتے اور سمجھتے ہیں بلکہ میرے حکیمانہ اقوال کے رازداں بھی ہیں۔

# (41)

## (فرانس میں لکھے گئے) 062

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام!

پیر حرم نے کہا سن کے مری روئداد!
پختہ ہے تیری فغاں اب نہ اسے دل میں تھام

تھا ارنی گو کلیمؑ میں ارنی گو نہیں
اس کو تقاضا روا مجھ پہ تقاضا حرام!

گرچہ ہے افشائے راز اہل نظر کی فغاں
ہو نہیں سکتا کبھی شیوہ رندانہ عام!

حلقہ صوفی میں ذکر' بے نم و بے سوز و ساز
میں بھی رہا تشنہ کام' تو بھی رہا تشنہ کام!

عشق تری انتہا' عشق مری انتہا
تو بھی ابھی ناتمام' میں بھی ابھی ناتمام!

آہ! کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مال فقیر' سلطنت روم و شام!

① ایک روایت کے مطابق اس نظم کے اشعار اقبال نے فرانس کے دوران قیام لکھے۔ مطلع میں کہا گیا ہے کہ یورپی ممالک اس لایعنی اور فضول خواہش میں مبتلا ہیں کہ دنیا میں عیش و عشرت کو ہمیشہ برقرار رکھنے کا نسخہ مل جائے۔ مراد یہ کہ اس دار فانی میں تمام تر ترقی کے باوجود ہمیشہ کے لئے عیش و عشرت کا وجود کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ یورپی ممالک کی یہ خواہش عملی سطح پر ناممکنات سے ہے۔

② میں نے جب اپنی روئیداد پیر حرم کے سامنے بیان کی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ اسے محض اپنی ذات تک محدود نہ رکھ! بلکہ عام لوگوں تک پہنچا دے تاکہ وہ بھی تیرے ہم نوا بن جائیں!

③ حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر جا کر رب ذوالجلال سے جلوہ نمائی کا تقاضا کیا تو اس کا ایک جواز تھا کہ وہ مقربان خداوندی میں سے تھے۔ اس کے برعکس میں تو ایک ادنیٰ انسان ہوں۔ میں خدا سے جلوہ نمائی کا تقاضا کیسے کر سکتا ہوں۔ میں تو کسی طور پر بھی اس کا اہل نہیں!

④ یہ درست ہے کہ بعض اوقات اہل نظر کے کسی عمل سے بھی عشق کا راز افشا ہو جاتا ہے لیکن اجتماعی سطح پر یہ ممکن نہیں کہ عشق کے رازوں کو عام کیا جائے۔ یوں بھی عشق کا حوصلہ ہر کوئی شخص کرنے کا اہل نہیں ہے۔

⑤ اب تو صوفیاء کے حلقے کی بھی یہ کیفیت ہو کر رہ گئی ہے کہ وہاں جو ذکر ہوتا ہے وہ بھی بے رس اور بے سوز و ساز ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں سامعین میں سے کوئی شخص بھی استفادہ نہیں کر سکتا۔

⑥ ہر چند کہ عشق ہر فرد کے جذبے کی انتہا پر محمول ہے اس کے باوجود عشق کی تکمیل کا امکان نہیں ہوتا۔

⑦ اے درویش منش انسان تجھ سے یہ بڑی بھول ہوئی کہ سچی درویشی کا راز کھو دیا ورنہ یہ امر واقع ہے کہ روم و شام کی سلطنت فقیر کی ہی ملکیت تھی۔ اس فقیر سے اقبال کی مراد مولانا رومی ہیں۔

## (42)

063

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل!
عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیلؑ!
فریب خوردہ منزل ہے کارواں ورنہ
زیادہ راحت منزل سے ہے نشاط رحیل!
نظر نہیں تو مرے حلقہ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثال تیغ اصیل!
مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت کہاں حجاب دلیل!
اندھیری شب ہے، جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لئے ہے مرا شعلہ نوا قندیل!
غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسماعیلؑ!

معنی: رحیل: کوچ۔

① خودی کے جذبے کو اگر علم سے استحکام مل جائے تو اس پر جبرئیلؑ جیسا فرشتہ بھی رشک کرے گا اور اگر اس جذبے میں عشق حقیقی بھی شامل ہو جائے تو خودی کی کیفیت وہ انقلاب انگیز تاثر پیدا کرے گی جو رب ذوالجلال نے قیامت کے دن کے لئے "صور اسرافیل" کو عطا کیا ہے۔

② اقبال کہتے ہیں کہ میں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہوں کہ عہد حاضر کے علم و دانش میرے لئے ایک عذاب کے مانند ہیں اور اس عذاب میں میں خود کو اسی طرح سے مبتلا محسوس کرتا ہوں جس طرح حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ نے آتش نمرود میں داخل ہو کر خود کو محسوس کیا تھا۔ مراد یہ ہے کہ عہد حاضر کی دانش بقول اقبال میرے لئے اسی طرح عذاب کے مانند ہے جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے لئے آتش نمرود

تھی۔ اور جس طرح آتش نمرود سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ بحفاظت نکل آئے تھے۔ اسی طرح میں بھی انشاء اللہ اس عذاب سے محفوظ رہوں گا جس میں مبتلا ہوں!

③ میرا قافلہ امرواقع یہ ہے کہ سراب کو منزل سمجھ کر دھوکا کھا بیٹھا ہے ورنہ اگر وہ حقیقت حال کے ادراک رکھتا تو اسے یہ جاننے میں دقت نہ ہوتی کہ ستانے کے لئے قیام سے کہیں زیادہ بہتر مسلسل سفر ہوتا۔ خواہ اس عمل میں کتنی ہی تکلیفوں کا سامنا ہو۔

④ اگر تیرے پاس نگاہ دوررس نہیں تو میری محفل سے دور رہ۔ اس لئے کہ میں تو یہاں فلسفہ خودی کے حوالے سے جو نکتے بیان کرتا ہوں وہ تو دل میں اتر جانے والے ہیں اور ان میں ایسی کاٹ ہے جو تیغ اصیل میں ہوتی ہے۔

⑤ اقبال کا کہنا ہے کہ مجھے اب یورپ میں طالبعلمی کا وہ دور یاد آرہا ہے جہاں ہر مسئلے کے بارے میں استدلال سے کام لیا جاتا تھا لیکن اب میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ مجھے آج جب کہ حضوری قلب حاصل ہوئی ہے تو اس کے مقابلے میں استدلال تو ایک طرح سے بے معنی شے ہے چونکہ دیکھا جائے تو حضوری قلب میں جو لذت موجود ہے وہ استدلال میں نہیں!

⑥ اس شعر میں علامہ نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ نامساعد حالات کی اندھیری رات میں تم لوگ اپنے قافلے سے بھٹک کر رہ گئے البتہ اگر تو اشعار اور ان کی فکر کی گہرائی سے استفادہ کرسکے تو یہ تیرے شب کی تاریکی روشن چراغ کے مانند ہوں گے جن سے تم بھٹکے ہوئے لوگ سفر منزل میں چراغوں سے قدرے روشنی حاصل کرسکو گے!

⑦ حرم کعبہ کی داستان اور پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ یہ بظاہر غریب و سادہ ہونے کے باوجود تاریخی سطح پر ہمہ جہت رنگوں کی حامل ہے اس لئے کہ اس کی عظمت و تعمیر کی انتہا تو اسہ رسول امام حسینؓ کی شہادت عظمیٰ سے ہوئی ہے۔ اور ابتداء پیغمبر خدا حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ کے جذبہ قربانی سے! اقبال کے بعض دوسرے اشعار کی طرح یہ شعر بھی ان کے کلام میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔

(43)

064

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے؟ خانقاہوں میں کہیں لذت اسرار بھی ہے؟
منزل رہرواں دور بھی دشوار بھی ہے کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن اس زمانہ میں کوئی حیدرؓ کرار بھی ہے
علم کی حد سے پرے بندہ مومن کے لئے لذت شوق بھی ہے' نعمت دیدار بھی ہے
پیر میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوان فرنگ سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

① اس نظم کے بیشتر اشعار ایک سوالیہ نشان کے مانند نظر آتے ہیں۔ ان میں اقبال اپنے عہد کی جو صورت حال سے اس کا ذکر بھی اشارتاً کرتے ہیں اور اس سے عہدہ برآ ہونے کا عندیہ بھی دیتے ہیں۔ پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ ان دنوں درس گاہوں میں نہ تو فکر و دانش کے آثار ملتے ہیں اور نہ ہی خانقاہوں میں

وہ جوہر نظر آتا ہے جو روحانی تربیت کا باعث ہوا کرتا تھا۔ مراد یہ ہے کہ یہ دور عملاً منفی اثرات کا حامل ہے اور کسی مرحلے پر بھی اصلاح کی گنجائش نظر نہیں آتی اور یہی اس دور کا المیہ ہے۔

② پہلے شعر کی طرح اس شعر میں بھی کیفیت یہ ہے کہ بے عملی کے سبب اہل قافلہ کی منزل دشوار بھی زیادہ ہو چلی ہے اور اس تک پہنچنے کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔ یعنی زندگی تو حرکت اور عملی جدوجہد سے عبارت ہے۔ انہی کے ذریعے انسان ترقی کر سکتا ہے اور اپنی منزل مراد کو بھی پا لیتا ہے۔ اس کے برعکس زندگی حرکت اور عملی جدوجہد سے خالی ہو تو ناکامی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صورت حال اس وقت مزید خراب ہو جاتی ہے جب کہ ان حالات میں لوگوں کی صحیح رہنمائی کے لئے کوئی موجود نہ ہو۔

③ حضور رسول اکرمؐ کے عہد میں جب مسلمانوں کے سامنے خیبر کے ناقابل تسخیر قلعے کا معرکہ درپیش ہوا تو اس کو فتح کرنے کے لئے اس وقت حضرت علی مرتضیٰ جیسے جری انسان اپنی معروف تلوار ذوالفقار کے ساتھ موجود تھے جنہوں نے اپنے دست و بازو سے کام لے کر خیبر کا در اکھاڑ پھینکا اور قلعہ کو فتح کر لیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ آج بھی دین اور وطن کے مقابل خیبر سے کہیں بڑھ کر معرکہ موجود ہے لیکن اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں نہ تو حیدر کرار جیسے جری اور بہادر انسان موجود ہیں نا ہی ان کی ذوالفقار! سو یہ معرکہ سر ہو تو کیسے ہو؟

④ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ علم بے شک اپنے مقام پر بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن مومن کے لئے علم ہی کافی نہیں بلکہ عشق حقیقی بھی درکار ہے۔

⑤ دانش مند لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یورپی تہذیب ہر چند کہ اپنی حدود میں ترقی یافتہ ہے لیکن اس میں تصنع اور بناوٹ نے ہر نوع کی اخلاقیات سے محروم کر کے رکھ دیا ہے۔ مراد یہ کہ مادی ترقی ہی معاشرے کی تعمیر کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے روحانی اقدار بھی درکار ہیں۔

## (44)

065

حادثہ وہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

نہ ستارے میں ہے، نے گردش افلاک میں ہے
تیری تقدیر مرے نالہ بیباک میں ہے!

یا مری آہ میں کوئی شرر زندہ نہیں!
یا ذرا نم ابھی تیرے خس و خاشاک میں ہے!

کیا عجب میری نوا ہائے سحرگاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے!

توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسم شب و روز
گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے!

**معنی:** پیچاک: پیچ و خم۔

① اقبال کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شعور و ادراک سے مستقبل میں رونما ہونے والی واردات کا اندازہ لگا لیا ہے۔ یہ نتیجہ جادو کے زور سے نہیں بلکہ اپنی دوربینی سے اخذ کرنے کے قابل ہوا ہوں!

② شاعر مشرق نے اپنی متعدد نظموں میں واضح طور پر اس امر کی خبر دی ہے کہ انسانی تقدیر کی تعمیر عملی جدوجہد سے ہوتی ہے۔ نہ تو کوئی ستارہ نا ہی کوئی آسمانی گردش انسانی تقدیر بنانے یا بگاڑنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ یہ بناؤ اور بگاڑ تو خود انسان کے اپنے عمل میں ہے۔

③ اپنے اشعار کے ذریعے میں جو دعوت عمل دے رہا ہوں۔ اس کا تجھ پر اثر کیوں نہیں ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یا تو میری فکر و نوا ہی بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں یا پھر تجھ میں ہی میری دعوت عمل کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

④ اور اگر میرے اشعار تیرے اندر چھپے ہوئے جذبوں کی قبولیت سے ہم کنار کر لیں کہ اس میں کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی۔ اس لئے کہ انسان میں بالآخر اچھی باتوں کے قبول کرنے کی صلاحیت تو بہرحال ہوتی ہے۔

⑤ اور بالآخر مسلمانوں کی صلاحیتیں اپنی قربانی اور جدوجہد کے ذریعے اپنی منزل کو پانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ ان میں بہرحال ایک انقلابی روح تو موجود ہے صرف اس کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کارہائے نمایاں بقول اقبال میرے اشعار اور علی الصبح کی دعائیں سرانجام دے سکیں گی۔

## (45)

066

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوز مشتاقی فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی!
خراب کوشک سلطان و خانقاہ فقیر فغاں کہ تخت و مصلیٰ کمال زراقی!
کرے گی داور محشر کو شرمسار اک روز کتاب صوفی و ملا کی سادہ اوراقی!
نہ چینی و عربی وہ، نہ رومی و شامی سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی!
مے شبانہ کی مستی تو ہو چکی لیکن کھٹک رہا ہے دلوں میں کرشمۂ ساقی!
چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی!
عزیز تر ہے متاع امیر و سلطاں سے وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی!

**معنی:** زراقی: مکروفریب۔

① نظم کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ صوفی اور درویشوں کی خانقاہوں کی صورت حال آج کل بس ایسی ہے کہ عشق و عمل کی جگہ محض جھوٹی کرامتیں دکھا کر اپنے پیرووں کو لوٹنے کی روش باقی رہ گئی ہے۔

② دوسرے شعر میں بھی پہلے شعر کی مانند اقبال نے صوفی اور درویش کے ساتھ بادشاہوں کے کردار کا جائزہ لیا ہے۔ کہ شاہی محلات اور درویشوں کی خانقاہیں دونوں کی کیفیت ان دنوں انتہائی خراب اور ناقص ہے۔ دونوں انتہائی مکاری اور عیاری کے اڈے بن گئے ہیں۔

③ یہ شعر بھی ایک طرح سے ابتدائی دونوں اشعار کے تسلسل میں ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ صوفی اور ملا جو دین مذہب کے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں لیکن ان کی کارکردگی کو دیکھا جائے تو صفر کے برابر ہے۔ ان کے کورے اعمال نامے جب داور محشر کے روبرو پیش کئے جائیں گے تو اسے خود دکھ ہوگا کہ یہی لوگ تھے جو مذہب کے نام پر کیا کیا گل کھلاتے رہے ہیں۔ کہ خداوند عالم نے انہیں مواقع فراہم کئے لیکن وہ اپنی بے عملی اور بدبختی کے سبب کوئی شایان شان کام نہ کر سکے۔

④ اسلام تو رنگ و نسل کی پابندی سے ہٹ کر ایک آزاد مذہب کی حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں شامل بھی شخص خواہ چینی ہو یا عربی، رومی ہو یا شامی بہرحال مسلمان ہے اور اسلام سے وابستہ

ہے۔

⑤ رات پی جانے والی شراب کا خمار تو اب ختم ہو گیا لیکن ساقی کی عنایات کا کرشمہ ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے۔

⑥ عربی کا ایک مقولہ ہے جس کے معانی ہیں کہ سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے اسی حوالے سے اقبال کہتے ہیں بے شک میری باتیں بھی اے مسلمان تجھے کڑوی اور تلخ محسوس ہوں گی لیکن نہ بھول کہ یہ باتیں تلخ سچائی پر مبنی ہیں۔

⑦ جو شعر جو حقائق پر مبنی ہے اور جس میں روح عصر جھلکتی ہو وہ تو یقیناً بادشاہوں اور امراء کے مال و دولت سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس نوعیت کے شعر کی افادیت تو مال و دولت سے بھی زیادہ ہے کہ یہ حقیقی رہنمائی کا حامل ہوتا ہے۔

## 067 (46)

ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک
اگرچہ مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک

مے یقیں سے ضمیر حیات ہے پرسوز
نصیب مدرسہ یا رب یہ آب آتشناک!

عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک!

یہی زمانہ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک!

تو بے بصر ہو تو یہ مانع نگاہ بھی ہے
وگرنہ آگ ہے مومن، جہاں خس و خاشاک!

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک!

جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتہ لولاک!

① اس شعر میں اقبال اہل یورپ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی دانشور سائنس، فلسفہ اور دیگر علوم میں مہارت رکھتے ہیں اور عالمی سطح پر لوگوں پر اثر انداز ہونے کی قوت کے حامل ہیں۔ اس کے باوجود وہ ان کی روح اور ضمیر کو تسخیر نہیں کر سکے۔ کہنے کا مقصد یوں ہے کہ یہ صلاحیت مشرقی رہنماؤں کی ہے جو ظاہر کی بجائے باطن کی پاکیزگی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

② یقین محکم کی بدولت حیات انسانی جن اوصاف کی حامل ہے خدا کرے اسی نوع کا یقین محکم ہمارے تعلیمی اداروں کو بھی نصیب ہو اور وہ اس سے استفادہ بھی کر سکیں۔

③ انسان ہر چند کہ خاک سے پیدا ہوا ہے اس کے باوجود اس کی عظمت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ ستارے، کہکشاں اور یہ نیلی رنگت والے آسمان اس کے عروج اور ترقی کا ہر لمحے مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ ور اس کا انتظار ہی اب ان کے لئے لازم ہے۔

④ اس شعر میں اقبال اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا عصر موجود کے پاس یہی اثاثہ رہ گیا ہے کہ انسانی دماغ تو علم سے روشن اور تابندہ ہے لیکن دل میں عدم اعتماد کی تیرگی چھائی ہوئی ہے اور نگاہوں میں بے باکی تو ہے حیا کا فقدان ہے۔

⑤ مسلمانوں سے مخاطب ہو کر اقبال کہتے ہیں کہ تو اگر بینائی سے محروم ہے تو دنیا کے معاملات تجھ پر

کھل نہیں سکتے ورنہ امر واقع تو یہ ہے کہ مومن تو ایک ایسی آتش فروزاں کی طرح ہے کہ اس کے بالمقابل دنیا دیکھا جائے تو خس و خاشاک کے مانند ہے اور کون نہیں جانتا کہ آگ خس و اشاک کو کس طرح بھسم کر کے رکھ دیتی ہے۔

⑥ دنیا نے تو محض عقل کو حرف آخر سمجھ رکھا ہے حالانکہ انسان میں مردانگی کا جوہر وہ جنوں عطا کرتا ہے جو عقل سے بھی زیادہ قوی ہے۔

⑦ اور امر واقعہ تو یہ ہے کہ تمام دنیا تو مرد مومن کا ورثہ ہے اور اس دعویٰ کی تصدیق "لولاک" سے کی گئی ہے کہ یہ کائنات خدا نے محض حضور اکرمؐ کے لئے پیدا کی ہے۔

## (47) 068

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ! یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ!
یا سنجر و طغرل کا آئین جہانگیری یا مرد قلندر کے انداز ملوکانہ!

یا حیرت فارابی یا تاب و تب رومی
یا فکر حکیمانہ یا جذب کلیمانہ!

یا عقل کی روباہی یا عشق ید اللہی یا حیلہ افرنگی یا حملہ ترکانہ!
یا شرع مسلمانی یا دیر کی دربانی یا نعرہ مستانہ' کعبہ ہو کہ بتخانہ!
میری میں' فقیری میں' شاہی میں' غلامی میں کچھ کام نہیں بنتا بے جراءت رندانہ!

① ان اشعار میں اقبال نے آزادی اور منافقت سے گریز کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ منافقت سے گریز کو وہ یکرنگی کے عمل سے تعبیر کرتے ہیں اور آزادی سے ان کی مراد آزادی اظہار و افکار' آزادی خیر' اور زندگی کے ہر معاملے میں مکمل آزادی ہے چنانچہ مطلع میں کہتے ہیں کہ اے ہمت مردانہ اس حقیقت سے آگاہ رہ کر آزادی اور منافقت سے گریز کا عمل ہی ایسے عناصر ہیں جن کی مدد کے بغیر انسان کو گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا۔

② نظم کے کم و بیش تمام اشعار میں آزادی و یکرنگی کے حوالوں سے علامہ نے ایک تقابلی فضا تخلیق کی ہے۔ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اے ہمت مردانہ! یا تو سنجر اور طغرل جیسے عالی مرتبت حکمرانوں کی طرز جہانگیر اختیار کر لے یا سچے درویشوں کی صفات کو اپنا لے۔

③ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ ان تمام اشعار میں ایک طرح کے تقابلی جائزے کے علاوہ موضوع کے اعتبار سے تسلسل کی فضا موجود ہے چنانچہ شعر میں کہا گیا ہے کہ یا تو حکیم ابو نصر فارابی جیسی دانش و حکمت حاصل کر! یا مولانا روم جیسا سوز و گداز! کہ یہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطمع رہا ہے۔

④ جب بات عقل تک پہنچے تو اس کی حیلہ سازی اور عیاری سیکھ لے! کہ یہی مغرب کے دانشوروں کا وطیرہ ہے۔ یا پھر علیؓ شیر خدا کی جراءت اور عشق حقیقی کے علاوہ ترک عساکر کی جراءت و یلغار اپنا لے!

⑤ یہ بھی نہیں تو پھر اسلامی شریعت اپنا لے یا پھر کفار کی کاسہ لیسی اختیار کر لے۔ یوں بھی کعبہ ہو یا بت خانہ مردوں کا شیوہ یکرنگی پر مبنی ہونا چاہیے۔

⑥ سرداری ہو یا پھر فقیری' بادشاہی ہو یا غلامی! ہر عمل کی تکمیل جراءت رندانہ کے بغیر ممکن نہیں۔ ان اشعار میں علامہ نے مختلف شخصیتوں اور کردار کے حوالوں سے ایسی فضا تخلیق کی ہے جو نوع انسانی کے انتہائی تضادات کی آئینہ دار ہے اور جس کا مقصد آزادی اور یکرنگی کے سوا اور کچھ نہیں!

## (48)

069

نہ تخت و تاج میں' نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے!

صنم کدہ ہے جہاں اور مرد حق ہے خلیلؑ
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الہ میں ہے!

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے!

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشت خاک ابھی آوارگان راہ میں ہے!

خبر ملی ہے خدایان بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذر سیل بے پناہ میں ہے!

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہان تازہ مری آہ صبح گاہ میں ہے!

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادہ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے!

① مطلع میں اقبال نے کہا ہے کہ سچے اور حقیقی درویش کی بارگاہ میں جس دلاویز کیفیت کا اظہار ہوتا ہے وہ نہ تو تخت و تاج کی سربراہی میں ملتی ہے نا ہی لشکروں کی سالاری اتنا لطف دے سکتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مرد قلندر کو ہی وہ مقام حاصل ہے جو انسان کو روح عصر سے آگاہ کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

② حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو قدرت نے یہ شرف بخشا کہ وہ خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیں چنانچہ حضرت ابراہیم نے یہ فریضہ بخوبی سرانجام دے کر یہ ثابت کر دیا کہ خالق حقیقی رب ذوالجلال کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

③ اب اگر یہ کہا جائے کہ خس و خاشاک کا ڈھیر ہی حقیقی دنیا کے مترادف ہے تو اس سے بڑھ کر احمقانہ بات اور کیا ہو گی کہ ایک فعال انسان تو خود ہی اپنی دنیا تخلیق کرتا ہے اور یہ دنیا ہمت و جراءت اور عملی جدوجہد سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

④ اقبال کے نزدیک انسان کا مقام تو چاند ستاروں سے بھی کہیں آگے ہے۔ اس لئے اسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اپنی کم ہمتی اور بے عملی کے سبب منزل مقصود پاتا تو الگ رہا ابھی اس کے راستے میں ہی بھٹک رہا ہے۔

⑤ علامہ نے یہ اور اس طرح کی پیشین گوئیاں اپنے اشعار میں جابجا کی ہیں وہ اسے فکری شعور کے تحت پیش آمدہ حالات کا جائزہ لینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ اس شعر میں انہوں نے ہندوستان اور جنوبی ایشیا کے دوسرے ممالک پر برطانوی تہذیب و استعمار کی یلغار کا ذکر کیا ہے اور متنبہ کیا ہے کہ مغربی تہذیب و استعمار مشرق کو تباہ کرنے کے لئے برسرعمل ہے۔ اس کا تدارک ضروری ہے۔

⑥ میں نے اپنے اشعار میں جو منشور ترتیب دیا ہے وہ مسلمانوں کے لئے جہان تازہ کی تعمیر کا سبب بن سکتا ہے۔

⑦ یہ شعر بھی پہلے شعر کا تسلسل ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ میں نے اپنے اشعار میں جو تعلیم دی ہے وہ

تا تو تعلیمی اداروں میں ملے گی نا ہی مذہبی درسگاہوں میں! لہٰذا اسی سے استفادہ کیا جائے تو مناسب ہے۔

## (49)

070

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک	رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک!
وہ خاک، کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک	وہ خاک، کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک!
وہ خاک، کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی	چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک!
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو	کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک!

① ان چار اشعار میں اقبال نے اپنی ذات کے حوالے سے ملت بیضا کے بعض مسائل کو پیش نظر رکھ کر بات کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ان چاروں اشعار میں قدر مشترک ذات، ملت اور کائنات ہیں۔ اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ فطرت نے اگرچہ مجھ میں وہ خصوصیت روا نہیں رکھی جو چالاکی اور عیاری سے عبارت ہوتی ہے اس کے باوجود مجھ میں وہ صلاحیت موجود ہے جو زندگی کے عروج وارتقاء میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ حیات انسانی منفی حربوں سے اپنی تکمیل کی طرف نہیں بڑھتی بلکہ اس کے لئے مثبت اور بامقصد طرز عمل درکار ہوتا ہے۔

② میری ذات اتنی باصلاحیت ہے کہ اس کی دیوانگی بھی ادراک اور سوجھ بوجھ سے خالی نہیں ہوتی۔ اور جس کے سامنے جبرئیل جیسے فرشتے بھی سر تسلیم خم کر لیتے ہیں۔ اقبال کا اشارہ یہاں خدائے تعالیٰ کے اس حکم کی جانب ہے جس میں اس نے فرشتوں کو آدم کے روبرو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔

③ میری ہستی کو عملاً کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ مجھے ایسا آشیانہ درکار ہے جس کی تعمیر کے لئے ایسے وسائل فراہم کئے جا سکیں جو میری بے نیازی پر اثر انداز ہوں نا ہی مجھے دیگر علائق دنیوی سے کوئی سروکار ہے۔

④ میرا وجود ہر چند کہ ہر طرح کی خواہش سے بے نیاز ہے۔ اس کے باوجود قدرت نے مجھے ایسی روشنی عطا کی ہے جس کا سامنا کرتے ہوئے ستارے بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ انسانی وجود میں قدرت نے وہ تمام صلاحیتیں ودیعت کر دی ہیں جن کے روبرو تمام عناصر احساس کمتری کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

## (50)

071

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد	مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد!
یہ مدرسہ، یہ جواں، یہ سرور و رعنائی	انھیں کے دم سے ہے میخانۂ فرنگ آباد!
نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو	یہ دل کی موت! وہ اندیشہ و نظر کا فساد!
فقیہہِ شہر کی تحقیر! کیا مجال مری،	مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد!
خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرت پرویز	خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد!

کئے ہیں فاش' رموز قلندری میں نے کہ فکر مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد!
رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم عصا نہ ہو تو کلیمؑ ہے کار بے بنیاد!

**معنی**: **رشی**: لفظی معنی خدا پرست۔ عابد' زہد گیانی یہ لفظ ہندو بھگتوں اور عابدوں کے لئے مخصوص ہے۔ اقبال نے یہاں گاندھی جی کے لئے استعمال کیا ہے۔

① اس شعر میں اقبال نے ایک انتہائی حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ لوگ جو دور رس نگاہوں کے مالک ہوتے ہیں اور مستقبل پر نظر رکھتے ہیں وہ ماضی کی شان و شوکت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مستقبل میں ان کا کردار کیا ہونا چاہئے۔ اس کے لئے وہ ماضی کی بجائے حسب ضرورت نئی تعمیرات کے لئے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔

② علامہ کے بیشتر اشعار میں اگرچہ فکر کی یکسانیت پائی جاتی ہے تاہم ان حوالوں سے بھی وہ اظہار میں تازہ خون کی آمیزش کا بہرحال پوری طرح خیال رکھتے ہیں۔ اس شعر میں بھی ہرچند کہ انہوں نے نئی بات نہیں کہی تاہم جو کہا اپنے انداز میں کہا۔ فرماتے ہیں کہ ملت کے جوان' ہماری درس گاہیں اور مروجہ تہذیب و معاشرت' یہ سب مغربی کلچر کا ملغوبہ ہیں اور اس کلچر میں پوری طرح سے دھنسے ہوئے ہیں۔

③ علامہ اس شعر میں بھی عہد کے فلسفیوں اور ملاؤں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اول الذکر اپنی فکر کے ذریعے نہ تو کوئی مثبت طرز عمل فراہم کرتے ہیں نا ہی اہل دل کے لئے ان کی دانش تقویت کا باعث ہو سکتی ہے۔ رہے ملا تو ان کے لئے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ **دین ملا فی سبیل اللہ فساد** یعنی ملا تو دین اور اسلام کے نام پر تفرقہ پھیلاتا ہے۔

④ بے شک میرے نزدیک مفتی شہر کی اہانت اگرچہ مناسب نہیں پھر بھی اس میں جو ظرف ہے بہرحال میں اس سے متفق نہیں!

⑤ بے شک زر و مال پاس ہو تو عیش و طرب کے لئے ہر ممکن سامان کیا جا سکتا ہے لیکن درد کی دولت تو ایسی گراں قدر شے ہے جو مال و زر سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

(51)

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
گستاخ ہے، کرتا ہے فطرت کی حنا بندی!
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی
رومی ہے نہ شامی ہے، کاشی نہ سمرقندی!
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی!

**معنی:** حنا بندی: لفظی معنی مہندی لگانا، محاورے میں بناؤ سنگھار۔ **کاشی:** منسوب بہ کاشان جو ایران کا مشہور مقام ہے۔

جگہ برائے تشریح غزل 51

(52)

073

نے مہرہ باقی، نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی، ہارا ہے رازی!
روشن ہے جامِ جمشید اب تک
شاہی نہیں ہے بے شیشہ بازی!
دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا
تو بھی نمازی، میں بھی نمازی!
میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکے میں مُلّا ہوں غازی!
ترکی بھی شیریں، تازی بھی شیریں
حرفِ محبت ترکی نہ تازی!
آزر کا پیشہ خارا تراشی
کارِ خلیلاں خارا گدازی!
تو زندگی ہے، پائندگی ہے
باقی ہے جو کچھ، سب خاک بازی!

① زندگی کی تکمیل کے لئے محض علم و حکمت اور فلسفہ کافی نہیں بلکہ اس کے لئے بنیادی مسئلہ عشق حقیقی ہے۔ یہ استدلال اس شعر میں علامہ اقبال نے امام رازی اور مولانا روم کے حوالوں سے پیش کیا ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ امام رازی جو حکمت و فلسفہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے لیکن وہ عشق حقیقی کے بغیر منزل تک نہ پہنچ سکے۔ ان کے مقابلے میں مولانا روم نے اس لئے منزل پالی کہ وہ عشق حقیقی کے محرم تھے۔

② اقبال کہتے ہیں کہ بادشاہت عیاری کے بغیر نہیں چل سکتی اس کا ثبوت جامِ جمشید ہے جو اب تک باقی ہے یعنی جمشید نے بلور کا جو مشہور زمانہ جام تیار کرایا تھا وہ بناوٹ اور تصنع کا منبع تھا۔ جمشید کی بادشاہت اور شہرت کا رازیہی حربہ تھا۔ مراد یہ ہے کہ بادشاہی کو قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ کی طرح آج بھی

اسی نوع کے حربے اور مکاری درکار ہے۔

③ مسلمانوں سے مخاطب ہو کر علامہ کہتے ہیں کہ دکھانے کے لئے نماز میں بھی پڑھتا ہوں اور تو بھی! اس کے باوجود نہ باطنی سطح پر میں مسلماں ہوں نہ تو! یعنی میرے اور تیرے دلوں میں اسلام کا جذبہ برائے نام ہے۔

④ اور یہ بھی جان لے کہ جس معرکے میں ملا آپس میں ٹکرا جائیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے ہر طرح کا حربہ استعمال کریں۔ اس معرکے کا انجام جو کچھ بھی ہو گا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

⑤ محبت کسی زبان اور رنگ و نسل کی پابند نہیں۔ اسی موضوع پر گفتگو ترکی زبان میں ہو یا عربی میں! یہ باتیں بہرحال میٹھی لگتی ہیں۔

⑥ آذر بت تراش تھا اور اپنے ہم پیشہ افراد کی طرح پتھروں کو تراش کر بت بنایا کرتا تھا۔ اس کے برعکس پیغمبر خدا حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ تو اپنی شیریں بیانی سے پتھر دل لوگوں کے سینوں میں گداز پیدا کر دیتے تھے۔ مراد یہ کہ آذر اتنا بڑا بت تراش ہونے کے باوجود اس انسانی عظمت سے محروم رہا جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو ان کی شیریں بیانی اور انسانی راہ نمائی کے سبب حاصل ہوئی۔

⑧ علامہ نظم کے اس آخری شعر میں اپنے محبوب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تو ہی میری زندگی ہے اور تجھی سے بہت کچھ حاصل ہوا۔ باقی سب بے معنی بات ہے۔

## (53)

074

گرم فغاں ہے جرس اٹھ کہ گیا قافلہ! وائے وہ رہرو کہ ہے منتظر راحلہ!
تیری طبیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ!
دل ہو غلام خرد یا کہ امام خرد سالک رہ ہوشیار، سخت ہے یہ مرحلہ!
اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر گردش دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ
تیرے نفس سے ہوئی آتش گل تیز تر مرغ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صلہ

① یہاں بھی اقبال مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ قافلہ کو اذن روانگی مل چکا ہے اور وہ اپنی منزل کی جانب آغاز سفر کے لئے تیار ہے۔ لیکن تو جو اس قافلے کا ایک فرد ہے زاد راہ اور سواری کا منتظر یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے کھڑا ہے۔ یہ تو بے عملی کی دلیل ہے۔ یاد رکھ کہ جو لوگ صاحب ہمت اور عزم و حوصلہ کے مالک ہوتے ہیں وہ کسی سہارے کے بغیر بھی جدوجہد میں مصروف ہو جاتے ہیں۔
ان کا مقصود تو منزل تک رسائی ہے۔ خواہ اس کے لئے انہیں پابرہنہ بھی جانا پڑے۔

② اس شعر میں بھی اس عہد کے حوالے سے بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ زمانہ گیا جب ہمیں خانقاہوں تک ہی محدود رہنا پڑتا تھا۔ اب تو انسان اس قدر ترقی یافتہ ہو چکا ہے کہ اس کے لئے ان خانقاہوں کا فرسودہ نظام بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

③ اب تیرے پیش نظر مقصد کے حصول میں دو راستے ہیں کہ یا تو دل کو عقل کا تابع کر لے یا پھر دل کو

ی سب کچھ مان کر اس کے مطابق عمل کر! لیکن یہ بھی جان لے کہ دل کی رہنمائی میں ہی تو حصول مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

④ جو شخص بھی خودی کا قائل ہو وہ نہ تو شام و سحر کی گردش میں اسیر ہو سکتا ہے نا ہی زمانے کا شاکی ہوتا ہے۔ اس میں تو خودی کے سبب وہ اعتماد پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر کسی سے گلہ مند ہونے کی حاجت نہیں رہتی۔

⑤ اس شعر میں اقبال کا کہنا ہے کہ میرے اشعار میں جو نظام فکر موجود ہے اس کے سبب قوم میں زندہ رہنے کا جذبہ بیدار ہو گیا اور وہ عمل کی طرف مائل ہو گئی۔ یہی میرا مقصد تھا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اسی صورت حال کے پیش نظر مجھے اپنی فکری کارکردگی کا صلہ مل گیا ہے۔

## (54) 075

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی! دیا ہے میں نے انہیں ذوق آتش آشامی!
حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی!
حقیقت ابدی ہے مقام شبیریؓ بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی!
مجھے یہ ڈر ہے مقامر ہیں پختہ کار بہت نہ رنگ لائے کہیں تیرے ہاتھ کی خامی!
عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں شکوہ سنجر و فقر جنیدؒ و بسطامیؒ!
قبائے علم و ہنر لطف خاص ہے ورنہ تیری نگاہ میں تھی میری ناخوش اندامی!

**معنی: آتش آشامی**: لفظی معنی آگ پینا۔ محاورے میں تیز شراب پینا ہے۔ **اعجمی**: نادان اور عامی۔ **احرام**: وہ خاص لباس جو حج کے موقع پر پہنا جاتا ہے چونکہ یہ لباس پہن لینے کے بعد مقررہ وقت کے لئے حاجی اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر لیتا ہے اس لئے لباس کا نام احرام (اپنے اوپر کچھ چیزیں حرام کر لینا ہے) اسے جامئہ احرام یا جامئہ احرامی بھی کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ اقبال نے استعمال کیا۔ **مقامر**: قمار باز۔ جواری۔ **بسطامی**: اشارہ ہے بایزید بسطامیؒ کی طرف۔ **ناخوش اندامی**: جسم کا غیر موزوں ہونا جس پر کوئی لباس زیبا معلوم نہ ہو۔

① میرے اشعار میں جو زور ہے اس کے سبب نہ صرف یہ کہ اہل معرفت بلکہ عام لوگوں میں بھی زندگی کی لہر پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے اپنے نغموں کے ذریعے ان میں وہ روح پھونک دی ہے جس نے انہیں جوش عمل سے سرشار کر دیا ہے۔

② اب تو ملت کی بے عملی کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ حرم کعبہ کے نزدیک جا کر بھی لوگ مسلمانوں پر طنز کرنے لگے ہیں کہ ان میں فرض کی ادائیگی کا جذبہ مفقود ہو کر رہ گیا ہے۔

③ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو حقائق سے بے بہرہ ہیں ان کا طرز عمل تو ہر لمحے تبدیل ہوتا رہتا ہے لیکن نواسہ رسولؐ مقبول حضرت امام حسینؓ کی سچ کو زندہ رکھنے کے لئے قربانی ایک ہمیشہ زندہ رہنے والی حقیقت کی علامت بن گئی ہے۔ چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود نواسہ رسولؐ اور ان کے رفقاء نے میدان کربلا میں اپنی جان و مال قربان کر کے اسلام کو جس طرح نئی زندگی عطا کی ہے اس کے سبب یہ قربانی لازوال حیثیت اختیار کر گئی لیکن ان کے دشمنوں کے قاتلوں کا نام و نشان تک باقی

نہیں رہا۔

④ مجھے اس امر کا خدشہ ہے کہ تو سیدھا سادا اور ناتجربہ کار شخص ہے جب کہ تیرے حریف انتہائی عیار اور چالاک واقع ہوئے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ فی زمانہ لوگ اس قدر عیار ہو چکے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

⑤ رب ذوالجلال اس قدر رحیم و کریم ہے کہ ملت اسلامیہ کی تمام تر خامیوں کے باوجود دینے پر آئے تو اسے ایک بار پھر سلطان سنجر جیسا جاہ و جلال اور حضرت جنیدؒ و حضرت بایزیدؒ جیسا فقر اور روحانی عظمت عطا کر دے۔

⑥ میں تو جو کچھ بھی تھا اس کا اگرچہ تجھے اے رب ذوالجلال پوری طرح سے علم تھا اس کے باوجود یہ تیری رحمت اور کرم ہے کہ تو نے مجھے علم و ہنر کے اعزاز سے بہرہ ور کیا۔

## (55) 076

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہ نو　　کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا　　جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو

نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی　　کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو

پنپ سکا نہ خیاباں میں لالۂ دل سوز　　کہ سازگار نہیں یہ جہان گندم و جو

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی　　ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو!

① اقبال نے اپنے کم و بیش تمام اشعار میں انسان بالخصوص مسلمانوں کو عملی جدوجہد کی ترغیب دی ہے۔ اس نظم کے اشعار میں بھی انہوں نے مختلف حوالوں سے یہی بات دہرائی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ عملی جدوجہد کے بغیر آج تک کوئی فرد کمال حاصل نہیں کر سکا۔ اس کی مثال چاند کی ہے کہ اول اول ہلال کی صورت میں نمودار ہوا اور پھر کسی مقام پر ٹھہرے بغیر آخر کار بدر کامل کا روپ اختیار کر گیا۔ مراد یہ ہے کہ یہ حرکت کا عمل ہی تھا جس نے ہلال کو بدر کامل بننے میں مدد دی۔

② سورج کی حدت کے بغیر غنچہ، پھول بن کر شگفتگی اور تازگی حاصل نہیں کر سکتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انسان پھونکیں مار مار کر غنچہ کو نہ پھول بنا سکتا ہے نہ اس میں رنگ و روپ پیدا کر سکتا ہے۔

③ دل اسی صورت میں پاک و پاکیزہ رہ سکتا ہے کہ یہ پاکیزگی انسان کی نگاہ میں بھی موجود ہو۔ کہ قدرت نے عملاً دل کو نگاہ کا تابع پیدا کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان کی نظروں میں پاکیزگی اور لطافت ہو گی تو اس کے اثرات دل تک بھی پہنچیں گے۔

④ لالے کا پھول باغوں میں نہیں کھلتا وہ تو ایک طرح کا خودرو پھول ہے۔ جو صحرا و کوہسار میں ہی اپنی بہار دکھاتا ہے۔ باغوں کی محدود فضاء اس کے لئے سازگار نہیں۔ اقبال کی مراد دراصل اس حوالے سے ان مسلمانوں کی جانب ہے جو کوہ و صحرا کی فضاء میں پرورش پاتے ہیں اور دنیا بھر سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیتے ہیں۔

⑤ امیر خسرو نے جو نغمے تخلیق کئے تھے ان کی گونج آج بھی برقرار ہے۔ آج بھی فضا میں یہ نغمے اپنی

آب و تاب کے ساتھ زندہ ہیں۔ ان کے برعکس سلطان قطب الدین ایبک اور شہاب الدین غوری کے معرکے محض تاریخ تک محدود ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تخلیق فن لازوال ہوتا ہے اور ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

## (56)

077

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش!

کس کو معلوم ہے ہنگامہ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و مے خانہ ہیں مدت سے خموش!

میں نے پایا ہے اسے اشک سحرگاہی میں!
جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش!

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش!

① دانشوروں سے مخاطب ہوتے ہوئے اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ عہد کی صبح اور شام میں گم ہو کر نہ رہ جاؤ! کہ یہ سارا عمل محض اسی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ ایک اور دنیا بھی ہے جس میں صبح اور شام کا کوئی وجود نہیں! میرے نزدیک اس دنیا کا اشارہ قیامت کی جانب ہے یا پھر ایک ایسی خیالی دنیا جو سحر و شام کے تصور سے ہی بے نیاز ہے۔

② دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ مستقبل کے بارے میں وجود پذیر ہونے والے واقعات کا ادراک کس کو ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے عہد کی مساجد' درس گاہیں اور مے خانے تو شعور سے بیگانے ہیں اور وہاں کبھی لوگوں کی جو تربیت ہوتی تھی وہ سلسلہ بھی قریب قریب ناپید ہو چکا ہے جب صورت حال یہ ہو تو مستقبل کے معاملات کا اندازہ آخر کون کر سکے گا؟

③ صبح کی عبادت و دعا کے دوران میں جو عرفان خداوندی حاصل کرتا ہوں وہ ایک ایسے گوہر نایاب کی مانند ہے جس کا وجود صدف کی آغوش میں بھی ممکن نہیں۔

④ اقبال اپنے ہم عصر دانشوروں کی مانند عہد کی تہذیب سے ہمیشہ بدظن نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تہذیب ایک طرح کی ملمع سازی کے سوا اور کچھ نہیں چنانچہ ان کے نزدیک جب انسانی چہرہ صاف و شفاف ہو تو پھر اس کے لئے غازہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

⑤ اس شعر کے مطابق اگرچہ ہر دانشور ہمیشہ اپنی رائے کو صحیح جانتے ہوئے حرف آخر سمجھ لیتا ہے تاہم اس حقیقت کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے کہ کبھی کبھی غلطی کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔

## (57)

078

تھا جہاں مدرسہ شیری و شاہنشاہی
آج ان خانقہوں میں ہے فقط روباہی!

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم اللہی!

لذت نغمہ کہاں مرغ خوش الحاں کے لئے
آہ! اس باغ میں کرتا ہے نفس کوتاہی!

ایک سرمستی و حیرت ہے سراپا تاریک! ایک سرمستی و حیرت ہے تمام آگاہی!
صفت برق چمکتا ہے مرا فکر بلند کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمت شب میں راہی!

معنی: شبانی: گلہ بانی۔ گڈریا پن۔

① ماضی کے حوالے سے اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ جن تربیت گاہوں میں شیر شاہ سوری جیسے عظیم المرتبت اور جہاں باہمت حکمرانوں کا دور دورہ تھا وہ آج اپنی بے عملی کے سبب بزدل اور ناکارہ لوگوں کی آماجگاہ ہیں۔

② ہمارے عہد کے قائدین میں وہ تربیت اور جوہر مفقود ہے جو کہ حضرت موسیٰؑ جیسے باوقار پیغمبر میں موجود تھا۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ نے سالہاسال تک حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرا کر اپنا مقصود حاصل کیا اور بنی اسرائیل کی رہنمائی کا شرف پایا۔ وہ سخت جانی اور کڑی تربیت ہمارے عہد کے رہنماؤں کے لئے تو ایک طرح سے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

③ جس ناسازگار ماحول میں حبس کا ساسماں ہو وہاں کسی بھی آزاد منش انسان کے سانس لینے کی گنجائش کہاں ہوتی ہے؟

④ جو شخص معرفت الٰہی سے آگاہ ہوتا ہے۔ ایک سرمستی و حیرت تو اس کے لئے ہر ممکن سطح پر آگاہی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جب کہ اسی حوالے سے دوسرا عمل فلسفیوں سے تعلق رکھتا ہے جہاں سرمستی و حیرت کے باوجود وہ کسی منزل پر نہیں پہنچ سکتا!

⑤ اقبال کہتے ہیں کہ میری فکر اس قدر بلند اور روشن ہے کہ اس کو برق تابناک سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو شب کی تاریکی میں مسافروں کی رہنمائی کرتی ہے چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ میری فکر اور میری شاعری بھی اسی طرح سے انسانوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہے تو کسی طور پر یہ بات غلط نہ ہو گی۔ اقبال کے نزدیک ان کی فکر اور شاعری روشن چراغ کے مانند ہے جو لوگوں کو راہ دکھاتا ہے۔

## (58)

079

ہے یاد مجھے نکتہ سلمان خوش آہنگ دنیا نہیں مردان جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہئے شاہیں کا تجسس جی سکتے ہیں بے روشنی دانش و فرہنگ!
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ!

معنی: سلمان: اشارہ ہے غزنوی دور کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان کی طرف جو لاہور میں مدت تک حاکم بھی رہے اور قید بھی۔

① تین اشعار پر مشتمل اس مختصر سی مگر خوبصورت نظم میں اقبال نے عہد غزنوی کے ممتاز فارسی شاعر مسعود سعد سلماں کے ایک نکتے کو پیش نظر رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص لاہور میں ہی پیدا ہوا پھر عہد غزنوی میں ایک عرصے تک لاہور کا حاکم رہا اور کسی فروگذاشت کی بنیاد پر بعد میں زیر عتاب آیا اور قید کر دیا گیا۔ چنانچہ سلمان کے حوالے سے اقبال کہتے ہیں کہ یہ دنیا جوانمردوں اور سخت کوش لوگوں کے لئے تنگ نہیں ہو سکتی۔ وہ تو جہاں بھی جائیں گے اپنی ہمت، سخت کوشی اور جراءت کے سبب اطمینان کی

زندگی بسر کریں گے۔ ان کی راہ میں کوئی مشکل بھی حائل نہیں ہو سکتی۔

② اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ انسان کے لئے علم و دانش کی روشنی بھی بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے باوجود ان خصوصیات کے بغیر انسان زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس میں اگر جراءت و حوصلہ مندی اور عملی جدوجہد کا جذبہ نہ ہو تو اس کی ہستی ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

③ یوں تو بلبل اور مور جیسے خوش گلو اور خوش نما پرندے بھی نظر کے سامنے رہتے ہیں لیکن ان کے بارے میں سوچنا تو بے معنی سی بات ہے اس لئے کہ بلبل تو محض خوب صورت آواز اور مور محض خوب صورت رنگوں کا استعارہ ہیں۔

## 080 (59)

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ

علم فقیہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ

فقر مقام نظر، علم مقام خبر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ!

علم کا 'موجود' اور، فقر کا 'موجود' اور
**اشھد ان لا الہ، اشھد ان لا الہ**

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ!

دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئنہ مہر و ماہ!

**معنی: اعراف:** اس کا اطلاق ہر ایسی چیز پر ہوتا ہے جو زمین سے بلند ہو۔ قرآن مجید میں جنت و دوزخ کے درمیان کی بلندی کو اعراف کہا گیا ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ **صاحب کشاف:** جار اللہ محمود زمخشری جس کی تفسیر کا نام کشاف ہے اور عربیت کے لحاظ سے وہ مستند تفسیر مانی جاتی ہے۔

① فقیر محض درویشی سے عبارت نہیں ہے بلکہ اس میں استغنا کا وہ پہلو بھی شامل ہے جو معجزوں کا سبب ہوتا ہے اور انہی معجزات کے تحت انسان تاج و تخت، بادشاہی اور لشکر کا مالک بن جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو فقر محض درویشی ہی نہیں بلکہ سرداروں کا سردار اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ یہ سب مناصب فقر کے کرشمے ہیں۔

② اس شعر میں اقبال ایک ایسے نکتے پر روشنی ڈالتے ہیں جو اہل دانش کے لئے توجہ طلب ہے ان کے نزدیک عقل و خرد کی پاکیزگی ہی علم کا ماحصل ہے۔ جب کہ فقر دل و نگاہ کو پاکیزگی اور جلا بخشتا ہے۔ مراد یہ کہ علم اور فقر دونوں کے ارتباط سے ہی انسان تکمیل کے مراحل سے گزر سکتا ہے۔

③ یوں تو اس نظم کے کم و بیش تمام اشعار علم اور فقر کے حوالوں سے تخلیق کیے گئے ہیں چنانچہ یہ شعر بھی پہلے دو اشعار کا تسلسل ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ علم فی الواقع فلسفی اور عالم کی متاع ہے جب کہ فقر حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کے علاوہ تمام پیغمبروں کا ورثہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر دو خصوصیات کی تعریف کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے۔ علم راستے کی تلاش کرتا ہے جب کہ فقر راستہ جانتا ہے اور اس کا عرفان رکھتا ہے۔

④ فقر انسان کو ایسی معراج عطا کرتا ہے جہاں وہ سب کچھ اپنی نگاہوں سے دیکھنے کا اہل ہوتا ہے جب کہ علم سب کچھ دیکھنے دکھانے سے محروم ہے البتہ ان کے بارے میں تفصیلات ضرور فراہم کر سکتا ہے۔ ان دونوں کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ فقر میں مست و بیخود ہو جانا عین ثواب ہے کہ اس کا تعلق عشق حقیقی سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس علم کے لئے مست و بے خود ہو جانا گناہ کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ یہ صورت حال علم کی افادیت کو زائل کر دیتی ہے۔

⑤ علم اور فقر دونوں ہی اگرچہ اپنے اپنے طور پر خدا کے وجود کی گواہی دیتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا معبود حقیقی نہیں تاہم علم خالق حقیقی کو ظاہری سطح پر دیکھتا ہے لیکن فقر اپنے موجود کو باطنی سطح پر دیکھنے کا ادراک رکھتا ہے۔ معرفت خداوندی سے دونوں ہی بہرہ ور ہیں لیکن اس تک رسائی کے لئے راہیں الگ الگ ہیں۔

⑥ فقر کے ساتھ جب خودی کا جذبہ بھی شامل ہو جائے تو یہ ارتباط اتنی بڑی قوت بن جاتا ہے کہ دونوں اوصاف اگر ایک ہی سپاہی میں یک جا ہو جائیں تو وہ پورے لشکر سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کا مالک بن جاتا ہے۔

⑦ نظم کے آخری شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ اگر اس کرہ ارض کے کسی باشندے کا دل بیدار عشق حقیقی سے معمور ہو تو وہ چاند اور سورج کے آئینے کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ علامہ نے ان اشعار میں علم، فقر اور دل کی جو مثلث وضع کی ہے اس سے ان تینوں کے اوصاف واضح ہوتے ہیں اور سب سے بلند مرتبہ دل کے حصے میں آتا ہے۔

## (60) 081

کمال جوش جنوں میں رہا میں گرم طواف
خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لئے
کہ یک زباں ہیں فقیہان شہر میرے خلاف!

تڑپ رہا ہے فلاطوں میان غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف!

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

سرور و سوز میں ناپائدار ہے ورنہ
مئے فرنگ کا تہ جرعہ بھی نہیں ناصاف!

① علامہ فرماتے ہیں کہ جب میں کعبے کے گرد طواف میں مصروف تھا تو عشق میں وہ کیفیت پیدا ہوئی جسے دیوانگی کی انتہائی شکل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کیفیت میں حرم کا غلاف صحیح و سلامت رہ گیا تو اس میں شکر خداوندی ادا کرنا چاہئے ورنہ عالم دیوانگی میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا؟

② اقبال نے اہل ایمان کو بڑے طنزیہ انداز میں یوں مبارک باد سے نوازا ہے کہ شہر کے سارے قاضی و ملا اپنی فطرت کے خلاف کسی بات پر متفق تو ہوئے اور اس اتفاق رائے کی تحریک میرے فکر و نظر سے اختلاف کی بنیاد ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ طبقہ تو خدا اور رسول کو بھی اختلافی مسئلہ بنائے بیٹھے ہیں۔ کم از کم میری ذات کی حد تک ایک معاملے میں اس نوعیت کی ذہنی ہم آہنگی معجزے سے کم نہیں!

③ ابتدائے آفرینش سے اہل خرد کا مقام جنت اور دوزخ کے مابین (اعراف) ہی رہا ہے۔ اس کی ایک

مثال یونان کے مشہور فلسفی افلاطون کی ہے جو ایک روایت کے مطابق بقول اقبال اعراف میں تڑپ رہا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ تجلی ذات خداوندی سے آسودہ ہوا یا نہیں؟! ابھی تک یہ معاملہ ایک سوالیہ نشان کے مانند ہے۔

④ اے مردِ مومن جب تک تیرا ضمیر صحیفہ آسمانی کے عرفان سے آشنا نہیں ہوتا اور تو خود اس کے بین السطور کا ادراک حاصل نہ کر لے تو خواہ امام رازی ہوں یا علامہ زمخشری کی مشہور زمانہ تفسیر قرآن "کشاف" بھی تجھ پر یہ عقدہ نہیں کھول سکتے کہ قرآن کی تفہیم محض تفاسیر کی مدد سے ممکن نہیں۔ اس کے لیے تو قلب و روح کو اس کا جزو بنانا ناگزیر ہوتا ہے۔

⑤ مغرب کے علوم کی افادیت مسلم! لیکن بدقسمتی سے ان میں پائیداری کا فقدان ہوتا ہے۔

## (61)

082

شعور و ہوش و خرد کا معاملہ ہے عجیب
مقامِ شوق میں ہیں سب دل و نظر کے رقیب!

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہو گا
مسائلِ نظری میں الجھ گیا ہے خطیب!

اگرچہ میرے نشیمن کا کر رہا ہے طواف
مری نوا میں نہیں طائرِ چمن کا نصیب!

سنا ہے میں نے سخن رس ہے ترکِ عثمانی
سنائے کون اسے اقبال کا یہ شعرِ غریب!

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب!

① عشق میں تو انسان ہر شے سے بیگانہ ہو کر نفع نقصان کی تمیز کے بغیر سرگرم عمل رہتا ہے جب کہ انسانی شعور، ہوشمندی اور عقل کسی بھی عمل سے قبل اس سے حاصل ہونے والے نفع نقصان کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عناصر اور عشق کے مابین ایک طرح کی رقابت پائی جاتی ہے۔ اقبال نے ایک دوسرے مشہور شعر میں کم و بیش اسی مضمون کو ایک نئے انداز سے باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

② اقبال کہتے ہیں کہ آج صورت احوال یہ ہے کہ جن لوگوں نے قوم کی صحیح بنیاد پر رہنمائی کرنا تھی وہ تو اپنے منصب سے لاتعلق ہو کر فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ایسی صورت میں قوم کا حشر کیا ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں!

③ اس شعر میں اقبال نے واضح طور پر اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ وہ لوگ میری شاعری میں سے کسی طور پر بھی استفادہ نہیں کر سکتے جو اس کے حقیقی مفاہیم اور اس میں موجود فکر سے آگاہ نہیں۔ نیز اس پر عمل کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے۔

④ یہ شعر علامہ نے ترکی کے نجات دہندہ کمال اتاترک کے حوالے سے کہا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہرچند یہ مردِ مجاہد دور رس نگاہ کا حامل ہے لیکن کوئی اگر اسے میرا یہ پیغام پہنچا دے تو مناسب ہو گا۔ یہ پیغام اگلے شعر میں موجود ہے۔

⑤ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ مصطفیٰ کمال پاشا کے نام اقبال کے پیغام حوالے سے یہ شعر بھی اوپر والے

شعر کا تسلسل ہے کہ اے ترکی کے مجاہدو! تم جو یورپ کی تقلید کر رہے ہو اور اس کی ہمسائگی پر نازاں ہو اس حقیقت کو کیوں فراموش کر بیٹھے ہو کہ مرتبہ و عظمت کے حوالے سے یورپ کے مقابلے میں تمہارا ستارہ ہمیشہ بلند رہا ہے۔



## رباعیات و قطعات




پیشکش:مجلس اقبال
نشر و توزیع:محمد اسلم باقر

(1)

084

رہ و رسم حرم نامحرمانہ! کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہن چاک نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ!

① اس رباعی میں اقبال نے مذہبی اداروں کے منفی کردار کا جائزہ لیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ہرچند یہ عہد اہل جنوں کے لئے سازگار نہیں پھر بھی میری فکر اور نقطہ نظر کو پیش نظر رکھا جائے تو آج کا انسان اس سے کچھ استفادہ کر سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ حرم اور کلیسا (مسلمانوں اور عیسائیوں) میں جو لوگ برسر اقتدار اور مسلط ہیں وہ قطعی طور پر اس کے اہل نہیں۔ اس صورت حال کا ادراک میری شاعری کے مطالعے سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

(2)

085

ظلام بحر میں کھو کر سنبھل جا تڑپ جا پیچ کھا کھا کر بدل جا
نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج! ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا!

**معنی:** ظلام: ظلمت کی جمع۔ اندھیرے۔

② انسانی زندگی تو ایک بحر بے کنار کے مانند ہے جس میں ایسے پیچیدہ مسائل موجود ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انتہائی جدوجہد اور عمل کی ضرورت ہے۔ اس کے باوجود اگر قسمت یاوری نہ کرے تو خود کو اس مخمصے سے علیحدہ کر لے۔ مراد یہ ہے کہ زندگی بے شک انتہائی کٹھن اور مشکل معاملات سے دوچار ہے اس کے باوجود جواں ہمت لوگوں کی ذمے داری یہ ہے کہ اس پیچیدہ صورت حال سے نمٹنے کے لئے راہ خود ہموار کریں اور پھر بھی ناکامی کا خدشہ ہو تو راہ بدل لیں۔ اور کوئی مناسب طرز عمل اختیار کریں۔

(3)

086

مکانی ہوں کہ آزاد مکاں ہوں؟ جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں؟
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں!

③ مجھے ابھی تک اس حقیقت کا ادراک نہیں ہوا کہ اس جہان ارضی میں میری اپنی حقیقت کیا ہے۔ قدرت نے ... وسائل ضرور فراہم کئے اس کے باوجود خود کو بے وسیلہ محسوس کر رہا ہوں اور یہ پتہ نہیں چل رہا کہ میں جس معاشرے میں زندگی گزار رہا ہوں۔ اس کی حدود کیا ہیں؟ یہ حدود ہیں بھی یا نہیں ہیں۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ ... و تنہا ایک ویرانے میں کھڑا ہوں اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ پوری کائنات میں ہی تو ہوں۔ زندگی کا یہ تضاد میری سمجھ سے بالاتر ہے۔
بے شک رب ذوالجلال کی لامکانی مسلمہ ہے لیکن مجھے کم از کم یہ تو بتایا جائے کہ میرا اپنا مقام اور

حدود اربعہ کیا ہے؟

087 (4)

خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں!
نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوہ دوست قیامت میں تماشا بن گیا میں!

④ اس رباعی میں اقبال نے اپنی ذات کے حوالے سے ایک تصوراتی منظر نامہ پیش کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ روز قیامت جب میدان حشر میں سب لوگ جمع تھے اور خالق حقیقی کا جلوہ دیکھنے میں مگن تھے تو میں اس وقت بھی اپنی خودی میں مگن تھا اور اس مرحلے پر بھی خالق حقیقی کا جلوہ دیکھنے سے بے نیاز رہا جس کے نتیجے میں وہاں موجود لوگوں کے درمیان تماشا بن کر رہ گیا۔

088 (5)

پریشاں کاروبار آشنائی! پریشاں تر مری رنگیں نوائی!
کبھی میں ڈھونڈتا ہوں لذت وصل خوش آتا ہے کبھی سوز جدائی

⑤ یہاں اقبال نے عاشقی کے حوالے سے اپنی ذاتی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ عشق کے عمل میں انسان بے شک اضطراب و انتشار کا شکار تو ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ میری نغمہ سرائی کا عمل بھی انتہائی اضطراب و انتشار کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اس اضطراب و انتشار کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ کسی مرحلے پر تو مجھے لذت وصل کی طلب ہوتی ہے۔ اور کبھی محبوب کے ہجر سے پیدا ہونے والی کیفیت اپنی تمام تر سوزش کے باوجود دل پسند محسوس ہوتی ہے۔

089 (6)

یقیں مثل خلیل آتش نشینی! یقیں اللہ مستی خود گزینی!
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی!

معنی: خود گزینی: اپنے آپ کو چننا' اختیار کرنا اپنی ذات کی حقیقت سمجھ کر اس پر پختہ ہو جانا۔ خودی۔

⑥ اس رباعی میں علامہ نے یقین کامل کی ماہیت بیان کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ چند سوال اٹھائے ہیں بلکہ ساتھ ہی ان کے جوابات مختصر اور جامع انداز میں پیش کیے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جب ہم سوچتے ہیں کہ یقین کامل کیا ہے؟ تو اس کا بڑا آسان اور مثبت جواب پیغمبر برحق حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے عمل میں مل جاتا ہے کہ بے دھڑک انجام کی پروا کیے بغیر آتش نمرود میں کود پڑے تھے۔ اقبال نے خود ایک دوسرے مقام پر اسی مضمون کے حوالے سے کہا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق!

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ یقین عشق خداوندی اور اس کی مستی میں چور ہونے کا نام بھی ہے۔ چنانچہ اے تہذیب حاضر کے سحر میں گرفتار شخص سن! کہ بے یقینی کو دیکھا جائے تو وہ غلامی سے زیادہ بر تر شے ہے۔

(7)

090

عرب کے سوز میں ساز عجم ہے حرم کا راز توحید امم ہے!
تہی وحدت سے ہے اندیشہ غرب کہ تہذیب فرنگی بے حرم ہے!

⑦ حضور سرورؐ دو عالم کی ذات والا صفات نے دنیائے عرب کو اس سوز عشق سے بہرہ ور کیا جس میں عجم کی نغمگی بھی شامل تھی یہی سوز عشق ساری کائنات کے لئے بہبودی اور بہتری کے ساتھ مینارہ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ کعبتہ اللہ بھی قوموں میں وحدت کی علامت بن گیا۔ تہذیب مغرب کے پاس چونکہ کعبہ جیسا کوئی مرکزی ادارہ نہیں۔ اس لئے وہاں وحدت کا تصور ہی بے معنی شے ہے۔

(8)

091

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی نفس ہندی، مقام نغمہ تازی!
نگہ آلودہ انداز افرنگ! طبیعت غزنوی، قسمت ایازی!

⑧ یہ رباعی انتہائی مختصر انداز میں اقبال کی سیرت و کردار کا تجزیہ کرتی ہے۔ امر واقع یہ ہے کہ اپنی ذاتی خصوصیات کا بیان عام طور پر خودستائی سے محمول کیا جاتا ہے۔ کہیں علامہ نے انتہائی بے نیازی کے ساتھ اس پورے عمل کو ان چار مصرعوں میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر میری نغمہ سرائی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ نفس ہندی کے ساتھ نغمے میں عرب کی حلاوت شامل ہے۔ اسی مضمون کو علامہ نے ایک اور مقام پر یوں کہا ہے کہ

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

چنانچہ آگے چل کر کہتے ہیں کہ مغرب کے جلووں سے آلودہ ہے۔ ہرچند کہ قسمت میں ایاز کے مانند غلامی لکھی ہے۔ اس کے برعکس فطرت سلطان محمود غزنوی سے ملتی جلتی ہے۔

(9)

092

ہر اک ذرہ میں ہے شاید مکیں دل اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل
اسیر دوش و فردا ہے ولیکن غلام گردش دوراں نہیں دل!

⑨ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ہر ذرے کے پہلو میں بھی دل موجود ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ہر نوع

کی جلوت میں ہی وہ خلوت کے مزے لے رہا ہے۔ اگرچہ دل ماضی اور مستقبل کی حدود کا پابند ہے۔ اس کے باوجود وہ زمانے کی گردش کا غلام نہیں بلکہ عملاً آزادی اس کا محور ہے۔

093
(10)

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے!

⑩ فرماتے ہیں کہ اے مسلماں! تیرے خیالات میں بلندی اور پاکیزگی نہیں۔ نا ہی تجھ میں وہ رفعت ہے جو حضورؐ اکرم سے محبت کرنے والے میں ہونی چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ تو بظاہر شاہین صفت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں وہ بیباکی اور تڑپ نہیں جو شہباز میں ہوتی ہے۔

094
(11)

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ نہیں ممکن امیری بے فقیری!

(11) اب صورت احوال یہ ہے کہ مرد مومن میں بھی وہ صلاحیتیں باقی نہیں رہیں جو اس کا طرہ امتیاز تھیں۔ یہی کیفیت صوفی اور درویش کی ہے کہ اس میں اور تو سب کچھ ہے۔ روشن ضمیری کا فقدان ہے۔ ان حالات کے پیش نظر رب ذوالجلال سے اسی قلب و نظر کی استدعا کر جو ذاتی صلاحیتوں کے منبع ہوتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ درویش صفتی ہی حقیقی امارت اور قیادت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

095
(12)

خودی کی جلوتوں میں مصطفائیؐ خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

(12) خودی وہ جذبہ ہے جس کا عرفان حاصل ہو جائے تو انسان کو آقائے دوجہاں حضرت محمد مصطفیٰؐ کے اوصاف حسنہ کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ داخلی اور باطنی سطح پر رب ذوالجلال کے جلوے اس پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ زمیں' آسماں 'کرسی اور عرش غرض تمام عناصر خودی کی زد میں ہیں اور کوئی شے بھی اس سے باہر نہیں!

096
(13)

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں! خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں!

نہ چھوڑ اے دل فغان صبحگاہی اماں شاید ملے اللہ ھو میں!

(13) معاملہ یہ ہے کہ اس دنیا کے رنگین نظاموں سے انسان مسحور ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح اس کی عقل و دانش بھی انتشار کا شکار ہو چکی ہے۔ اس کیفیت میں تیرے لئے یہ بات لازم ہو گئی ہے۔ کہ علی الصبح بیدار ہو کر خدا سے دعا مانگ اور "اللہ ھو" کا ورد کر! شاید اسی طرح تجھے سکون قلب حاصل ہو جائے۔

(14)

097

جمال عشق و مستی نے نوازی جلال عشق و مستی بے نیازی

کمال عشق و مستی ظرف حیدرؓ زوال عشق و مستی حرف رازی!

(14) کی وساطت سے لوگوں تک پیغام خداوندی کی ترسیل کو عشق و مستی کے جمالی شان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اسی طرح عشق و مستی میں دنیا اور اس کے جملہ مسائل سے بے نیازی کو اس کی جلالی شان کہہ سکتے ہیں۔ اب رہا عشق و مستی کا کمال تو یہ مولائے کائنات علی مرتضیٰؓ کی ذات والا صفات اور کردار میں نظر آ جائے گا۔ جب کہ عشق و مستی کا زوال امام رازی کے اقوال میں موجود ہے۔

(15)

098

وہ میرا رونق محفل کہاں ہے مری بجلی مرا حاصل کہاں ہے

مقام اس کا ہے دل کی خلوتوں میں خدا جانے مقام دل کہاں ہے!

(15) اس رباعی میں اقبال نے سوالیہ انداز میں اپنے محبوب حقیقی کو رونق محفل کی طرح پیش کیا ہے۔ یہاں محبوب سے مراد رب ذوالجلال ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ مفروضہ اپنی جگہ درست کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ اس کا وجود بجلی کی رو کے مانند ہے جو نظر نہیں آتی لیکن اپنے وجود کا احساس ضرور دلاتی ہے۔ وہ یقیناً خدا ہے لیکن اب تک اس کے بارے میں یہ علم نہ ہو سکا کہ اس کا مسکن کونسا ہے۔ یہ تو کہا جاتا ہے کہ وہ دل کی خلوتوں میں رہتا ہے تاہم آج تک یہ راز آشکار نہیں ہو سکا کہ دل کے جس مقام پر خدا کا مسکن ہے۔ وہ مقام کہاں ہے؟ ابھی تک یہ معاملہ سوالیہ نشان کے مانند ہے؟

(16)

099

سوار ناقہ و محمل نہیں میں نشان جادہ ہوں منزل نہیں میں

مری تقدیر ہے خاشاک سوزی فقط بجلی ہوں میں، حاصل نہیں میں!

(16) جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نہ کوئی والا جاہ ہوں جو ناقہ محمل سے ہٹ کر قدم نہیں

رکھتا نا ہی میری حیثیت کسی منزل کی سی ہے۔ اس کے برعکس میں تو ایک نشان راہ کے مانند ہوں۔ میں تو برق رخشندہ کے مانند ہوں جو خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

100 (17)

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے ترا دم گرمیِ محفل نہیں ہے
گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے!

(17) اس رباعی میں انسان کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تیرے سینے میں سانس تو موجود ہے مگر دل نہیں ہے اور سانس بھی ایسا ہے کہ اس سے کسی محفل میں گرمی اور ہنگامہ پیدا نہیں ہوتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تو عقل و دانش کا پجاری ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر قدم نہیں رکھ سکتا چنانچہ اگر تو نے اپنے مقصد کو پانا ہے تو عقل کے مراحل سے آگے گزر کر سوچ! کہ عقل تو محض راہ دکھانے والے ایک معمولی چراغ کے مانند ہے۔ یہ کوئی منزل کی حیثیت تو نہیں رکھتی جب کہ ناداں لوگ عقل کو ہی حرف آخر سمجھ لیتے ہیں۔

101 (18)

ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تو فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو!

(18) تجھ میں جو جوہر پوشیدہ ہے۔ وہ پاک و پاکیزہ ہے اور نور خداوندی سے کشید کیا ہوا ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جس کے نور سے آسمانوں کی درخشانی اور تابناکی میں اضافہ ہوتا ہے۔ تو تو خدائے عزوجل کا ایسا شاہین ہے حور اور فرشتے بھی جس کے شکار ہوتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ خدا نے انسان کو تمام مخلوقات سے افضل و برتر پیدا کیا ہے۔

102 (19)

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

(19) اس رباعی میں اقبال مسلمانوں کی صورت حال پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان میں نہ جذبہ رہا نہ غیرت! نا ہی کچھ کر گزرنے کا جنوں برقرار ہے۔ آج کے مسلماں کی کیفیت تو یہ ہے کہ ان کی صفوں میں نفاق نے بیج بوئے ہوئے ہیں جس کے سبب پریشاں حالی ان کا مقدر بن کر رہ گئی ہے۔ حد تو یہ ہے خالق حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ان سجدوں میں ذوق اور خلوص ناپید ہوتا ہے۔ اس ساری صورت حال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل عشق حقیقی کے جذبے سے خالی ہو چکے ہیں۔

103 (20)

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا مقام رنگ و بو کا راز پا جا
برنگ بحر ساحل آشنا رہ! کف ساحل سے دامن کھینچتا جا

(20) اس رباعی میں اقبال مسلمانوں کو دعوت عمل دیتے ہوئے ایک لائحہ عمل بھی تجویز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیرے پاس خودی کا جو حربہ ہے وہ اس قدر کارآمد اور طاقتور ہے کہ اس کی مدد سے تو پوری دنیا پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی کے ذریعے ظاہر و باطن کے سارے بھیدوں سے آگہی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ سمندر کے مانند کناروں سے تیرا رابطہ تو بے شک برقرار رہنا چاہئے۔ لیکن ساحل پر لہریں جو جھاگ اڑاتی ہیں ان سے اپنے دامن کو بچا کے رکھ! مراد یہ ہے کہ ایک مکمل انسان کی تعریف یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا فانی ہے وہ تا زندگی اس میں عملی جدوجہد سے کام لے لیکن خود کو علائق دنیوی سے محفوظ رکھے!

104 (21)

چمن میں رخت گل شبنم سے تر ہے سمن ہے، سبزہ ہے، باد سحر ہے
مگر ہنگامہ ہو سکتا نہیں گرم یہاں کا لالہ بے سوز جگر ہے

(21) کائنات میں اگرچہ وہ تمام عناصر موجود ہیں جن کی مدد اور تعاون سے ارتقاء کی منزلیں طے کی جا سکتی ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمانوں میں نہ وہ قوت عمل موجود ہے نا ہی وہ عزم و حوصلہ جو کسی انقلاب کے لئے ممد و مددگار ثابت ہو سکے اور اس کا پیش خیمہ بن سکے۔

105 (22)

خرد سے راہرو روشن بصر ہے خرد کیا ہے چراغ رہگذر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے!

(22) عقل و دانش کے طفیل انسان کی بصیرت مل جاتی ہے جب کہ عقل و دانش تو ایک ایسے چراغ کی مانند ہے جو راستے کو دکھاتا ہے اور اس کو منور کر دیتا ہے۔ لیکن عقل و دانش جس کو "چراغ رہگذر" سے تعبیر کیا گیا ہے انسان کی باطنی اور داخلی کیفیت سے بہرہ ور نہیں ہوتی اسی لئے وہ اس کی تکمیل کا باعث نہیں بن سکتی۔

106 (23)

جوانوں کو مری آہ سحر دے پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نور بصیرت عام کر دے!

(23) اس رباعی میں اقبال خدائے ذوالجلال کی بارگاہ میں دعاگو ہیں کہ نوجوانان ملت کو وہ آہ سحر عطا کر جس سے میں خود بہرہ ور ہوں۔ ہرچند کہ اپنی فطرت میں یہ بلند پرواز شاہین کے مانند ہیں تاہم ان کا المیہ یہ ہے کہ اپنی بے عملی کے سبب ان میں آگے بڑھنے کی قوت باقی نہیں رہی چنانچہ میری آرزو اور تمنا یہی ہے کہ تو نے مجھے جو بصیرت کا نور بخشا ہے وہ عام لوگوں خصوصاً نوجوانوں تک پہنچا دے۔

107 (24)

تری دنیا جہان مرغ و ماہی مری دنیا فغان **صبحگاہی**!
تری دنیا میں ہیں محکوم و مجبور مری دنیا میں تیری پادشاہی!

(24) اے رب دو جہاں تیری دنیا تو چرند پرند اور ہر نوع کی زندہ اشیاء سے عبارت ہے جب کہ میری دنیا میں تو آہ و زاری کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ ایک سادہ سی رباعی ہے۔ جس میں خالق حقیقی سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہمارے لئے ترقی کے وسائل پیدا کر دے اس لئے کہ تو نے تو ہمیں اس دنیا میں جس کو خود تو نے تخلیق کیا ہے میں ایک محکوم و مجبور انسان کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہوں جب کہ میری اپنی دنیا پر تیرا مکمل تسلط ہے۔

108 (25)

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

(25) اے مولا! یہ تیرا کرم ہے کہ مجھ کو تمام صلاحیتوں سے نوازا ہے اور صاحب اقتدار لوگوں کی محکومی اور غلامی سے بچالیا ہے۔ ہرچند کہ اپنی فطرت کے مطابق میں دنیا کے جملہ مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اس کے باوجود جام جمشید کی طرح کسی کا آلہ کار نہیں ہوں۔

(26)

وہی اصل مکان و لامکاں ہے مکاں کیا شے ہے؟ انداز بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے کیا بتائے اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

(26) یہ ذات خداوندی ہے جو کسی ایک مقام تک محدود نہیں بلکہ ہر مقام پر اس کی موجودگی برحق

ہے۔ ویسے بھی یہ محض انداز بیاں کی بات ہے کہ کسی مقام کا تعین کر سکے۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ اگر کوئی مچھلی جو پانی میں مستقل بود و باش رکھنے پر مجبور ہے وہ ہی اس امر کا کسی سے استفسار کرے کہ دریا کہاں ہے؟ تو اس پر محض حیرت اور تعجب کا اظہار ہی کیا جا سکتا ہے اور بس!

## (27)

110

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق کبھی شاہ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش کبھی عریان و بے تیغ و سناں عشق!

(27) اس رباعی کا موضوع بھی عشق ہے اور یہاں علامہ نے اس کی مختلف جہتیں بیان کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جذبہ عشق ابھی تک آوارگی کے علاوہ بے خانماں ہونے کے مراحل سے گزرتا ہے۔ کبھی نوشیروان عادل کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے۔ یہی نہیں کہ ایک مرحلہ تو ایسا بھی آتا ہے کہ میدان جنگ میں زرہ پہن کر برآمد ہوتا ہے لیکن جب یہ جذبہ اپنی انتہا پر پہنچتا ہے تو نہ زرہ پوشی کی ضرورت رہتی ہے نہ مدمقابل کے سامنے اسلحہ کی ا کہ عشق حقیقی کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

## (28)

111

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق کبھی سوز و سرور و انجمن عشق!
کبھی سرمایہ محراب و منبر کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق!

(28) اس رباعی میں اقبال نے عشق کے جذبے کی لامحدودیت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کے نزدیک ابھی تک عشق کی آماجگاہ پہاڑوں اور صحراؤں کی وسعت بلندی اور تنہائی ہے۔ کبھی کسی محفل کا سوز اور سرخوشی عشق کے مظہر ہیں۔ کبھی یہ عشق جب حقیقت الٰہی سے روشناس ہوتا ہے تو پھر محراب و منبر یعنی مسجد کی محراب اور اس کے منبر کا سرمایہ بن جاتا ہے اور جب عشق حقیقی کا جذبہ انتہا پر پہنچ جاتا ہے تو مولائے کائنات حضرت علی مرتضیٰؓ کے سیرت و کردار میں ڈھل جاتا ہے اور قلعہ خیبر کے ناقابل تسخیر دروازے کو اکھاڑ کر لشکر اسلامی کی کفار پر فتح کا سبب بن جاتا ہے۔

## (29)

112

عطا اسلاف کا جذب دروں کر شریک زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر!

(29) اس رباعی میں اقبال مالک حقیقی سے استدعا کرتے ہیں کہ اب میں تو ان صلاحیتوں سے محروم ہو چکا ہوں جو میرے اسلاف میں موجود تھیں۔ خداوندا! مجھ کو بھی عشق حقیقی کا وہ جذبہ عطا کر دے جو میرے بزرگوں کا سرمایہ افتخار تھا اور جس کی بدولت وہ اپنے حریفوں پر سبقت حاصل کرتے تھے۔ مولا! مجھے بھی ہر

نوعیت کے غم واندوہ سے نجات دلا دے۔ اس لئے کہ عقل و دانش کے جو معمے تھے ان کو تو میں حل کر چکا ہوں۔ اب تو بس مجھے وہ جنون عطا کر دے جو عشق حقیقی کا سرمایہ ہے۔

113

(30)

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی اگر بیزار ہو اپنی کرن سے!

(30) اقبال کہتے ہیں کہ نکتہ میں نے بوالحسن سے سیکھا ہے کہ انسان بے شک جسمانی سطح پر وفات پا جاتا ہے لیکن اس کی روح زندہ و برقرار رہتی ہے بالفاظ دگر اگر کرنیں سورج سے رابطہ ختم کر لیں تو سورج میں وہ تابندگی کیسے برقرار رہے گی جو اس کی پہچان ہے۔ مراد یہ ہے کہ روح کے بغیر انسان محض ایک تودہ خاک ہے۔ اس رباعی کے مطالب بیان کرتے ہوئے مولانا غلام رسول مہر کے الفاظ یہ ہیں کہ بوالحسن سے مراد غالباً ابو الحسن خرقانیؒ ہیں! میرے نزدیک یہ مفروضہ غلط ہے۔ بوالحسنؓ سے یہاں مراد حضرت علی مرتضیٰؓ ہیں چونکہ وہ امام حسنؓ کے والد محترم بھی تھے اس لئے ان کی کنیت ابو الحسنؓ تھی۔ رباعی میں جو نکتہ بیان کیا گیا ہے اس کے اشارے قرآن پاک کی ایک آیت کے حوالے سے نہج البلاغہ کے بعض اشعار میں بھی ملتے ہیں کہ خدا نور ہے اور روح اس نور کی کرن یعنی پرتو ہے!

114

(31)

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے خرد بیزار دل سے دل خرد سے!

(31) عقل نہ جانے کیوں اپنی حدود سے آگے نکل جاتی ہے جب کہ بقول اقبال اس میں تو نیک و بد کی تمیز بھی نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس رباعی میں اقبال کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کا اندازہ اس شعر سے ہوتا ہے جس میں کہتے ہیں کہ نہ معلوم میں کس صورت حال میں گم ہو کر رہ گیا ہوں کہ میری عقل دل سے بیزار ہے اور دل عقل سے بیزار لگتا ہے۔

115

(32)

خدائی اہتمام خشک و تر ہے خداوندا خدائی درد سر ہے
ولیکن بندگی! استغفر اللہ یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

(32) اے مالک دو جہاں! بے شک یہ حقیقت اپنی جگہ درست سہی کہ پوری کائنات میں خشک و تر کا اہتمام تیرے لئے درد سری کی حیثیت رکھتا ہو گا لیکن میں جو تیرا حقیر بندہ ہوں اس کے لئے بندگی کی جو ذمے داریاں ہیں ان کو بروئے کار لانا تو درد جگر سے کم نہیں جو درد سر سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔

(33)

116

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا؟ کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا!
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا؟

(33) عشق الٰہی کی یہ منزل جب انسان اپنے رب کی معرفت حاصل کرلیتا ہے ہر کسی کے مقدر میں نہیں ہوتی۔ اقبال کے بیشتر عارفانہ کلام بالخصوص زیر شرح رباعی کے متن سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عشق الٰہی کی اس منزل تک رسائی حاصل کر چکے تھے۔ اس رباعی میں وہ جس بے تکلفانہ انداز میں اپنے پالنے والے سے مخاطب ہیں۔ دیکھا جائے تو یہی بے تکلفی ایک لطیف طنز کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ چنانچہ وہ مالک حقیقی سے استفسار کرتے ہیں کہ اس انسان کو تو نے خشکی اور تری کا حکمران بنا دیا ہے۔ کیا یہی تیرے تخلیقی ہنر کا شہ کار ہے؟ کہ اگر اس کی حقیقت کا تیرے روبرو انکشاف کروں تو بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اس کی بے بصیرتی کا یہ عالم ہے کہ نہ اسے اپنی حقیقت کا کچھ علم ہے نہ تیری معرفت کا ادراک ہے اور نا ہی وہ کائنات کے سربستہ رازوں سے آگاہ ہے۔ اس صورت حال میں اس کو تو نے جو مرتبہ بخشا ہے اس پر حیرت کے سوا اور کس جذبے کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

(34)

117

دم عارف نسیم صبحدم ہے اسی سے ریشہ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیبؑ آئے میسر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے!

**معانی:** شعیب: شعیب سے یہاں مراد ہے مرشد' ہادی' مربی اور رہنما۔

(34) اس رباعی میں کہا گیا ہے کہ جو شخص صاحب عرفان ہوتا ہے اس کا سانس بھی نسیم سحری کے مانند لطافت کی حامل ہوتی ہے اور اسی کے سبب انسان حقیقت ابدی سے آشنا ہوتا ہے۔ اس کی بے حد اہم مثال رب ذوالجلال کے دو پیغمبروں حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کی ہے کہ آخر الذکر نے اول اول حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں پھر ان کے اتنے محبوب ہو گئے کہ حضرت شعیبؑ نے انہیں اپنا داماد بنا لیا اور بیٹی سونپ دی مراد یہ ہے کہ صاحب عرفان کسی بھی معمولی شخص کو انتہائی رفعتوں سے دوچار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(35)

118

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے! وہ دل' وہ آرزو باقی نہیں ہے!
نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

(35) اقبال کے بقول ملت کی رگوں میں ماضی کی طرح خون کی وہ گردش نہیں رہی جو جوش عمل سے

دوچار کرتی تھی۔ پھر یہ بھی ہے کہ نہ تو دل میں خلوص باقی رہا ہے نہ ایسی خواہش جو عروج انسانی کی مظہر ہوتی ہے۔ ہر چند کہ آج بھی ظاہری سطح پر نماز' روزہ' قربانی اور حج کی روایات تو باقی رہ گئیں لیکن افسوسناک امر یہ ہے وہ مسلمان باقی نہیں رہا جس کی شخصیت اور کردار ان خصوصیات کے اہل گردانے جاتے تھے۔

## (36)

119

کھلے جاتے ہیں اسرار نہانی! گیا دور حدیث لن ترانی!
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار وہی مہدی' وہی آخر زمانی!

**(36) معانی:** مہدی: لفظی معنی ہدایت کرنے والا۔ **آخر زمانی:** لفظی معنی آخری زمانے میں آنے والا۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے۔ جب دنیا فسق و فجر سے بھر جائے گی تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ایک ایسا مہدی بھیجے گا جو باطل کی قوتوں کو مٹا کر رکھ دے گا۔ اسلام کا ڈنکا نئے سرے سے بجے گا۔ اس آنے والے کو وہ آخری زمانے کا مجدد سمجھتے ہیں۔ اس کو اقبال نے مہدی اور آخر زمانی کے لقبوں سے یاد کیا ہے۔

اس رباعی کے مطابق اب وہ دور آ گیا ہے جب کائنات کے تمام رازہائے سربستہ کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ اب وہ زمانہ بھی نہیں رہا کہ حضرت موسیٰ کی طرح جواب ملے "لن ترانی" یعنی تم ہمارا جلوہ نہیں دیکھ سکتے!

غالب نے اس سے بڑی حد تک ملتا جلتا مضمون اپنے ایک شعر میں باندھا ہے کہ

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی!

چنانچہ بقول اقبال اب تک تو صورت حال اس مرحلے تک آ پہنچی ہے کہ جو شخص بھی اول اول خودی کی معرفت حاصل کر سکا وہی مہدی آخر الزماں ٹھہرے گا۔ مراد یہ کہ خودی کے بغیر انسان بلند درجات حاصل نہیں کر سکتا۔

## (37)

120

زمانے کی یہ گردش جاودانہ حقیقت ایک تو' باقی فسانہ!
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا فقط امروز ہے تیرا زمانہ!

(37) اقبال کہتے ہیں کہ زمانے کی گردش تو ماضی میں بھی جاری رہی۔ حال میں بھی جاری ہے اور مستقبل میں بھی جاری رہے گی۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ اصل شے وجود انسانی ہے باقی عناصر کو افسانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جو انسان عملی جدوجہد کا قائل ہے وہ گزرے زمانے کی تلخیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور مستقبل کی نامعلوم جہتیں بھی اس کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں کہ ان کا علم تو شاید کسی کو بھی نہ ہو گا۔ اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کا حقیقی مقصود تو دور حاضر ہے کہ یہ وقت

اس کا اپنا ہے اور اس پر ہی ایک فرد بڑے اعتماد کے ساتھ بات کر سکتا ہے۔

## 121 (38)

حکیمی نامسلمانی خودی کی کلیمی رمز پنہانی خودی کی
تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں غریبی میں نگہبانی خودی کی!

(38) عقل و دانش اور خودی کے بارے میں علامہ اقبال کے جو تصورات ہیں وہ ان کے بیشتر اشعار اور نظموں کے حوالے سے سامنے آچکے ہیں زیر تشریح رباعی بھی انہی تصورات کی آئینہ دار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو انسان حکمت و دانش اور فلسفے کی گتھیوں میں الجھا رہتا ہے اس کا یہ عمل خودی کی نفی ہے اس لئے کہ حکمت و دانش اور فلسفہ اپنے اپنے انداز میں مسائل کا تجزیہ تو کرتے ہیں لیکن ان مباحث اور جائزوں میں نہ تو یقین و اعتماد ہوتا ہے نا ہی وہ عرفان جو ایمان کا جوہر ہے۔

خودی کے اسرار و رموز کو جاننے کے لئے تو حضرت موسیٰؑ جیسے اولالعزم پیغمبروں کا کردار پیش نظر رکھنا ہو گا کہ جابروں سے مظلوموں کو نجات دلانا جذبہ خودی کا ہی کارنامہ ہے۔ ایسے ہی کردار میں خودی کے راز مضمر ہوتے ہیں۔

رباعی کے دوسرے شعر میں اقبال ایک اور نکتہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فقیری اور درویشی میں بھی بادشاہوں جیسی عظمت اور وقار کا حصول اس صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنی خودی کو حرص و آز اور ہر نوع کی غلاظت سے بچائے رکھے! یہی وہ گر ہیں جن کے ذریعے خودی کا حقیقی نقشہ سامنے آتا ہے۔

## 122 (39)

ترا تن روح سے نا آشنا ہے عجب کیا آہ تیری نا رسا ہے
تن بے روح سے بیزار ہے حق خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے!

(39) اس رباعی میں بے عمل انسان سے خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح روح کے بغیر جسم ایک تودہ خاک کے مانند ہوتا ہے یہی صورت ایک بے عمل شخص کی ہے حتیٰ کہ خدائے عزوجل جو رحیم و کریم ہے وہ بھی ایسے بے عمل اور بے روح لوگوں کی دعائیں نہیں سنتا اس لئے کہ فی الواقع وہ اس نوع کے افراد سے بیزار رہتا ہے اور وہ تو چونکہ خود زندہ ہے لہٰذا خدا بھی زندہ لوگوں کا ہے۔ زندہ لوگ وہی ہوتے ہیں جن کے جسم میں روح زندہ ہے اور اپنی بقاء کے لئے عملی جدوجہد کے قائل ہیں۔

# قطعات

123

## (40)

اقبال نے کل اہل خیاباں کو سنایا
یہ شعر نشاط آور و پر سوز و طربناک
میں صورت گل دست صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے مرا جوش جنوں میری قبا چاک!

(40) یہ چار مصرعے ایک دلچسپ صورت حال کی جانب اشارہ کرتے ہیں اس صورت حال کو اقبال نے زیر تشریح قطعہ میں منکشف کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ کائنات کی ہر شے عملاً ایک دوسرے کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کی مثال غنچے کی ہے کہ باد صبا کے جھونکوں کے بغیر وہ پھول بننے کی استطاعت نہیں رکھتا تاہم صرف انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ کسی کی پروا کیے بغیر اپنی منزل مقصود تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کہ انسان تو خودی کے جذبے کی بدولت اپنی پہچان اور معرفت الٰہی سے بہرہ ور ہو جاتا ہے جب کہ دوسری اشیاء کے لیے یہ ممکن نہیں!

# نظمیں

## دعا

### (مسجد قرطبہ میں لکھی گئی)

124

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو!
صحبت اہل صفا، نور و حضور و سرور
سرخوش و پرسوز ہے لالہ لب آبجو!
راہ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو!
میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر!
میرا نشیمن بھی تو، شاخ نشیمن بھی تو!
تجھ سے گریباں مرا مطلع صبح نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتش اللہ ہو!
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو!
پاس اگر تو نہیں، شہر ہے ویراں تمام
تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو!
پھر وہ شراب کہن مجھ کو عطا کر، کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو!
چشم کرم ساقیا! دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو!
تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لیے لامکاں، میرے لیے چار سو!
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا، جسے کہہ نہ سکیں روبرو!

معانی: صبح نشور: قیامت کی صبح۔ کاخ و کو: کوچے اور محل۔ جلوتی اور خلوتی: جلوتی کے لفظی معنی ہیں وہ میں رہتے ہیں۔ اور خلوتیوں سے مراد ہے گوشہ نشین لوگ ان دونوں اصطلاحوں سے مختلف مفہوم

لئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً امیر اور فقیر' اہل سیاست اور اہل تصوف' علماء اور اولیا۔ دنیا دار اور دین دار۔ حال ہی کی مناسبت سے دونوں کے لئے الگ الگ لفظ استعمال کئے۔ جلوتیوں کے لئے سیو جس سے محفل آرائی کا سرو سامان اور اہتمام ظاہر ہوتا ہے۔ خلوتیوں کے لئے کدو جو درویشی اور قلعت سامان کی دلیل ہے۔ لامکاں: وہ مکان جس کی حدود نہ ہو۔ چار سو: وہ مقام جو چار طرفوں سے گھرا ہوا ہو یعنی دنیا۔

① اقبال جب 32ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تو وہاں سے فراغت کے بعد انہوں نے ہسپانیہ کا دورہ بھی کیا۔ تاریخی اعتبار سے ہسپانیہ جن دنوں مسلمان سلاطین کے زیر نگیں رہا تو اس کی عظمت انتہائی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ مسلمان سلاطین نے قرطبہ کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تھا۔ زیر شرح نظم علامہ نے قرطبہ کی جامع مسجد میں بیٹھ کر تخلیق کی۔ یہ مسجد مسلمانوں کے زوال کے بعد عیسائی حکمرانوں نے گرجا میں تبدیل کر دی تھی۔ اس المیے کے اثرات اقبال کی اس نظم میں جابجا موجود ہیں۔

چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ عشق حقیقی جب اپنی انتہا پر پہنچتا ہے تو جگر کا لہو بھی آہ و فریاد میں ڈھل جاتا ہے۔ یہی آہ و فریاد میری نماز اور وضو کا روپ دھار گئی ہے۔

② اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ صاف و پاکیزہ محبت سے قلب انسان جلا پاتا ہے۔ محبوب کی حضوری کے ساتھ کیف و سرور کی وہ صورت ملتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے نہر کے کنارے لالے کا پھول لہراتا رہتا ہے اور ندی کی لہریں اس کو ہمیشہ تازگی' سرخوشی اور سوز بخشتی رہتی ہیں۔

③ محبت کی راہیں اس قدر سنگلاخ ہوتی ہیں کہ اس میں انتہائی قربت رکھنے والے عزیز و اقربا بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایک اور شاعر نے اسی مضمون کو ایک مصرعہ میں یوں پیش کیا ہے۔

تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

چنانچہ اقبال کے مطابق کہ محبت میں کوئی بھی کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ محض عشق کا جذبہ ہی آرزو میں ڈھل کر انسان کو اس کی منزل تک پہنچانے کا اہل ہوتا ہے۔

④ خدائے عزوجل سے مخاطب ہو کر اس شعر میں علامہ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں امیروں اور وزیروں کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ میرے لئے تو تو ہی سب کچھ ہے۔ منزل بھی اور راہ منزل بھی!

⑤ اے خدا تو نے میرے سینے میں عشق حقیقی کی جو آگ روشن کی ہے وہ قیامت کے روز بھڑکنے والی آگ سے کم نہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے دل "اللہ ہو" کی حرارت کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔

⑥ مولائے کائنات تیرے ہی دم سے میری زندگی سوز و درد اور داغ کے علاوہ روشنی کا مظہر بنی ہوئی ہے۔ تو ہی ہے جو میرے عشق میں آرزو بن کر بسا ہوا ہے اور یہی جذبہ جستجو کا حامل بن جاتا ہے۔

⑦ اے آقا! یہ تیری یاد ہی ہے جس کے بغیر ہر سو ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے اور جب مجھے تیری قربت کا احساس ہوتا ہے تو اجڑے ہوئے محلات اور سنسان گلی کوچے بھی آباد و درخشاں نظر آتے ہیں۔ مراد یہ کہ قرب الٰہی سے انسان کو عظمت و بلندی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عشق الٰہی اور اس کی معرفت نہ ہو تو پورا ماحول اجاڑ و سنسان بن کر رہ جاتا ہے۔

⑧ اے مالک دو سرا میں نے جدید تہذیب کے تمام لوازمات سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ مجھے وہی جذبہ عشق سے نواز دے جو میرے اسلاف کا ورثہ ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر میں تو عشق الٰہی میں جذب ہو چکا ہوں۔ اور محض تیری تلاش میں مصروف ہوں!

⑨ یہ شعر بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے پچھلے شعر کا تسلسل ہے. جس میں خدا سے دعا کی گئی ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ سب تیری نظر کرم کے محتاج ہیں۔

⑩ اس شعر میں علامہ کا لہجہ قدرے تبدیل ہو گیا ہے۔ یہاں وہ مالک حقیقی سے گلہ مند نظر آتے ہیں کہ وہ خود تو لامکاں ہے اور افلاک و کائنات پر اس کی اجارہ داری ہے جب کہ انسان کو اپنا نائب بنا کر بھیجنے کے باوجود زمین کے ایک مختصر علاقے تک محدود کر دیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ خدا کے لامحدود اختیارات کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں جب کہ انسان تو محض بے اختیار ہے۔

(11) فلسفہ اور شعر کی تعریف مختصراً اتنی ہی ہے کہ ان کی وساطت سے اپنی دلی تمنا کا اظہار کھل کر نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہاں بھی علامتوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔

125

# مسجد قرطبہ

## (ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات!
سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفی کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات!
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات! کار جہاں بے ثبات!
اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام!
عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام!
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام!
عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات!
عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود!
قطرہ خون جگر سل کو بناتا ہے دل — خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!
تیری فضا دل فروز' میری نوا سینہ سوز — تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود
عرش معلیٰ سے کم سینہ آدم نہیں — گرچہ کف خاک کی حد ہے سپہر کبود
پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا — اس کو میسر نہیں سوز و گداز سجود!
کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق — دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود

شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمہ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے!

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار — شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل!
تیرے در و بام پر وادی ایمن کا نور — تیرا منار بلند جلوہ گہ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں' کہ ہے — اس کی اذانوں سے فاش سر کلیمؑ و خلیلؑ
اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور — اس کے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل!
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب — عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل!
ساقی ارباب ذوق' فارس میدان شوق — بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل!

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الہ
سایہ شمشیر میں اس کی پنہ لا الہ

تجھ سے ہوا آشکار بندہ مومن کا راز — اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم — اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کار کشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو' گرم دم جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطہ پرکار حق مرد خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

کعبہ ارباب فن! سطوت دین مبیں — تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر — قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!
آہ وہ مردان حق! وہ عربی شہسوار — حامل "خلق عظیم" صاحب صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب — سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں!

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب | ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی | خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال | اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے!
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے!

دیدہ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں | آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے | عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں!
دیکھ چکا المنی شورش اصلاح دیں | جس نے نہ چھوڑے کہیں نقش کہن کے نشاں
حرف غلط بن گئی عصمت پیر کنشت | اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں
چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب | جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر | لذت تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب | راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

وادی کہسار میں غرق شفق ہے سحاب | لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب!
سادہ و پرسوز ہے دختر دہقاں کا گیت | کشتی دل کے لیے سیل ہے عہد شباب!
آب روان کبیر! تیرے کنارے کوئی | دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب!
عالم نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں | میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرہ افکار سے | لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی | روح امم کی حیات کشمکش انقلاب!
صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم | کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر!

**معنی: حادثات**: حادثہ کی جمع یعنی پیدا ہونے اور مرنے والی چیزیں۔ **صیرفی**: صراف۔ پرکھنے والا۔ **تقویم**: جنتری۔ کیلنڈر۔ وہ کتاب جس میں سال بھر کی تاریخوں وغیرہ کا نقشہ درج ہو۔ **عصر رواں**: وہ زمانہ جو جاری ہے۔ **پیکر گل**: مٹی کا جسم یعنی انسان۔ **صہبائے خام**: وہ شراب جس میں کوئی چیز نہ ملائی گئی ہو اور بالکل خالص ہو۔ **کاس الکرام**: کاس معنی پیالہ۔ کرام بمعنے سخی کریم کاس الکرام سے اہل کرم کا وہ پیالہ مراد ہے جس سے دوسروں کو بھی حصہ ملے۔ **جنود**: جند کی جمع۔ فوجیں۔ لشکر۔ **ابن السبیل**: مسافر۔ **رفت و بود**: لفظی معنی گیا اور تھا یعنی فنا۔ **چنگ**: ایک قسم کا باجا جو منہ سے بجایا جاتا ہے۔ **کشود**: کھلنا۔ **کف خاک**: خاک کی مٹھی یعنی انسان۔ **سپہر کبود**: نیلا آسمان۔ **پیکر نوری**: نورانی وجود یعنی فرشتے اور قدوسی۔

علامہ اقبال کی شاعری کے بیشتر حصے میں مسلم عہد کے سپین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اس عہد میں مسلمانوں کے عروج و زوال سے بری طرح متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ 1934ء میں تیسری گول میز کانفرنس

میں شرکت کے لئے یورپ گئے تو بعد میں ہسپانیہ کا دورہ بھی کیا اور اموی عہد کے آثار قدیم بھی دیکھے۔ "دعا" کی طرح زیر شرح نظم بھی انہوں نے ہسپانیہ ہی میں لکھی۔ مسلمانوں کے عہد میں ہسپانیہ نے ہر شعبہ زندگی میں جو ترقی کی وہ محض اب تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ بے شمار محلات' مساجد' درسگاہیں اور دوسری شاندار عمارتیں جو اس عہد میں تعمیر ہوئیں مسلمان حکمرانوں کے زوال کے بعد عیسائیوں کی بربریت اور تشدد کا شکار ہو گئیں۔ لے دے کے محض مسجد قرطبہ باقی رہی ہے جس کو عیسائیوں نے گرجے میں تبدیل کر لیا تھا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کے مطابق مسجد قرطبہ دنیا کی عظیم الشان اور نادر روزگار عبادت گاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس مسجد کی بنیاد ہسپانیہ میں اموی سلطنت کے بانی عبدالرحمٰن اول نے رکھی تھی۔ بعد میں متعدد حکمرانوں نے اس میں قابل قدر اضافے کئے۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد قرطبہ کا عرض چار سو چالیس فٹ اور طول چھ سو بیس فٹ تھا۔ اس میں ایک ہزار چار سو سترہ ستون تھے جو اس قدر مجلا اور تابدار تھے کہ ان میں انسانی عکس نظر آتا تھا۔ دیواروں میں اکیس دروازے تھے جن پر پیتل منڈھا ہوا تھا۔ ان پر بے حد خوبصورت ملمع کاری کی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں کسی مسجد کا حصہ اتنا بڑا اور وسیع نہیں ہے۔

مسجد میں روشنی کے لئے دو سو اسی بلوریں جھاڑ آویزاں تھے۔ سب سے بڑی اور مرکزی جھاڑ میں ہر وقت چودہ سو موم بتیاں جلتی رہتی تھیں۔ دیواروں میں کم و بیش سات ہزار چار سو پچیس پیالے آویزاں تھے و تیل بتی سے روشن رہتے تھے۔ اذان کے لئے جو مینار تعمیر کیا گیا تھا ایک سو ساٹھ فٹ بلند تھا۔ اس کی چوٹی پر سونے اور چاندی کے سیب نما گولے نصب تھے جو سورج کی شعاعوں کی بدولت میلوں دور سے چمکتے تھے۔ شاہی خانوادے کے لئے جو حصہ مسجد میں مخصوص تھا اس کے دروازوں پر سونے چاندی کا منقش کام تھا اور تمام ستون لاجورد کے تھے۔ مسجد کا نادر روزگار منبر ہاتھی دانت' آبنوس اور صندل کے کم و بیش چھتیس ہزار ٹکڑوں سے تیار کیا گیا تھا اور سنہری کیلوں سے جوڑا گیا تھا۔ اس عجوبہ روزگار مسجد کی تکمیل میں کم و بیش سات سال لگے تھے۔ بہت سے جید علماء نے بھی یہیں تعلیم حاصل کی۔ اقبال نے اگرچہ صدیوں کے بعد اس مسجد کو دیکھا لیکن ان کے ذہن پر جو نقوش مرتسم ہوئے اس کا اندازہ اس نظم سے کیا جا سکتا ہے۔

"مسجد قرطبہ" علامہ اقبال کی نسبتاً طویل نظموں میں سے ایک نظم ہے جو آٹھ بند پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں انہوں نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا اشارتاً ذکر کرتے ہوئے مسجد قرطبہ سمیت ان عظیم الشان تعمیرات کے شکستہ آثار کے بارے میں انتہائی کرب کا اظہار کیا ہے۔ متذکرہ عمارات مسلمان سلاطین کے عہد میں تعمیر کی گئیں تھیں۔ بعد میں ان کے زوال کے بعد جو نامساعد حالات پیش آئے یہ آثار قدیم ان کی منہ بولتی تصویر ہیں چنانچہ نظم کے اولیں بند کا آغاز علامہ اس طرح کرتے ہیں۔

*

(1) روز و شب کی داستان عہد کے حوالے سے یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ اس میں فناء و بقا کے بنیادی سلسلے کے حوالے سے ہی صورت حال کی تفہیم ممکن ہے۔ یعنی دن اور رات کے عرصے میں کتنے ہی بچے جنم لیتے ہیں اور کتنے ہی لوگ وفات پا جاتے ہیں۔ یہی عمل قدرت کے نظام کا حقیقی روپ ہے چنانچہ اس

پس منظر میں دیکھا جائے تو ہمارے روز و شب یعنی زمانہ ہی زندگی اور موت کا حقیقی سرچشمہ ہیں۔

(2) یہ شعر بھی عملاً پہلے شعر کا تسلسل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رات اور دن کی شناخت ریشم کے دو متضاد رنگوں میں علامتوں سے ممکن ہے۔ ریشم کے ان متضاد رنگ کے تاروں میں سیاہ رنگ رات کا مظہر ہے جب کہ سفید رنگ دن کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کو ذات خداوندی اور اس کی صفات سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ وہ خود تو نظر نہیں آتا لیکن بعض اشیا میں اس کے پرتو کی جھلک ملتی ہے۔ ان اشیاء میں ذات باری کی صفات جزوی طور پر نمایاں ہوتی ہیں۔ یہ تصورات اور علامتیں زمانے کے وجود سے ہی پیدا ہوئی ہیں۔

(3) کائنات کے آغاز کے ساتھ ہی زمانے کی تخلیق ممکن ہوئی ہے جس سے باری تعالیٰ کا مقصد انسان کو اس اتار چڑھاؤ سے آگاہ کرنا تھا جو اس راہ میں موجود ہوتے ہیں۔ اس شعر میں بھی علامہ نے زمانے کو" ساز ازل کی فغاں" سے تعبیر کیا ہے کہ ساز کی طرح زمانے میں بھی اتار چڑھاؤ کا عمل جاری رہتا ہے جس کے ذریعہ قدرت متوقع امکانات کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ انسان ان حوالوں کی روشنی میں حقیقت کو پا سکے!

(4) زمانہ ہر شے کا احتساب ہی نہیں کرتا بلکہ ایک ایسی کسوٹی کے مانند ہے جو نیک و بد کی تمیز پیدا کرتی ہے اور کھرے کھوٹے کو الگ کر دیتی ہے۔ یہ احتسابی عمل اور کسوٹی ایسی حقیقتیں ہیں جو خواہ سب ہوں یا اور کوئی سب کے لئے ہیں اور کوئی اس سے ماورا نہیں ہے۔

(5) کمزور اور بے حقیقت انسان کو خواہ وہ کوئی بھی ہو زمانہ مٹا کر رکھ دیتا ہے اس کا مقدر موت کے سوا اور کچھ نہیں مراد یہ کہ وقت و استحکام زندگی کی دلیل ہیں جب کہ انتشار اور کمزوری موت کی علامتیں ہیں۔

(6) اس سارے پس منظر اور صورت حال کے باوجود شب و روز کی حقیقت زمانے کی ایک رو کے سوا اور کچھ نہیں اور یہ ایسی رو ہے جس میں دن اور رات کا تصور باقی نہیں رہتا۔ اس صورت میں دن اور رات کے مابین تمیز بالکل بے حقیقت شے ہے۔

(7) ہر چند کہ اس دنیا میں انسان کی ہنرمندی بے پناہ ترقی کی حامل ہے لیکن یہ ترقی عارضی ہے اور اس میں کوئی شے پائیدار نہیں ہے اور حتمی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس جہان کو ثبات نہیں۔

(8) ان تمام اشعار کے پس منظر میں اقبال یہ کہتے ہیں کہ اس جہان کا اول و آخر غرض ہر شے کا مقصد فنا کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ شعر عملاً قرآن پاک کی اس آیت کی تعبیر ہے۔

**کل نفس ذائقۃ الموت**۔ یعنی ہر ذی روح نے موت کا مزا ضرور چکھنا ہے یعنی کہ موت ہر شے کا مقدر ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ آغاز ہو یا انجام ظاہر ہو یا باطن! کوئی تخلیق نئی ہو یا پرانی! بالآخر اس کی منزل فنا کے سوا اور کچھ نہیں!

## دوسرا بند

(1) پہلے بند کے اشعار کے بعد اقبال زندگی اور موت کے مسئلے کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں کہ

اس حقیقت کے باوجود کو ہر شے فنا ہونے والی ہے تاہم اگر ایک مرد حق پرست نے کسی نقش کی تکمیل کی ہو تو اس میں پائیداری اور استحکام کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مرد حق پرست کا ہر عمل رضائے الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔

(2) اور جو مرد حق پرست ہوتا ہے۔ اس کا ہر عمل جیسا کہ پہلے شعر میں کہا گیا ہے رضائے الٰہی اور عشق حقیقی کے دم سے ہی پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ اس لئے کہ عشق حقیقی تو زندگی کا وہ جوہر ہے جو موت کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ موت اس پر حرام ہوتی ہے اور یہ جذبہ عملاً زندگی کی حقیقت اور روح ہے۔

(3) ہر چند کہ زمانے کی رو انتہائی تند و تیز ہے جس کے سامنے کوئی شے ٹھہر نہیں سکتی لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ عشق تو خود ایک تند و تیز سیلاب کے مانند ہوتا ہے جو ہر زمانے کے مقابل سیلاب کو روکنے کی صلاحیت کا حامل ہے یعنی عشق کا جذبہ ہر حال میں بالادست رہتا ہے۔

(4) عشق کا جذبہ اپنے دامن میں اتنی وسعت ہے جو زمانی سطح پر عصر موجود ہی نہیں ایسے زمانوں پر بھی محیط ہے جن کو بادی النظر میں کوئی نام نہیں دیا جا سکتا اور یہ زمانے رات اور دن تک محدود نہیں!

(5) اس شعر میں اقبال اپنے مخصوص انداز میں عشق حقیقی کو مختلف زاویوں اور کرداروں کے حوالے سے دیکھتے ہوئے اس کی ہمہ گیر جہتوں کو حضرت جبرئیل امین، حضور سرور کائنات کے علاوہ پیغمبروں اور کتاب خدا کے حوالوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق حقیقی محض ایک پاکیزہ جذبہ ہی نہیں بلکہ اس کی کسی فرشتے تک رسائی ہو تو جبرئیل امین کی سانس اور آواز بن جاتا ہے، پیغمبر تک پہنچ ہو تو حضرت محمد مصطفیؐ کے دل کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی اس کا انتہائے عروج یہ ہے کہ کبھی خدا کا رسول اور کبھی اس کے کلام کا مظہر بن جاتا ہے۔

(6) عشق حقیقی کی توصیف میں اقبال اس سطح تک آ جاتے ہیں کہ ایک پھول یا پھول سے نازک بدن میں جو تازگی، شگفتگی اور رخشندگی ہے وہ بھی اسی جذبے کا ایک پرتو ہے۔ اس کے علاوہ عشق حقیقی تو خالص شراب کی مانند ہے جس کی مستی اور نشہ انتہائی تند و تیز ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ عشق اہل کرم کا عطا کردہ ایسا کاسہ ہے جس سے ہر ضرورت مند فیض یاب ہو سکتا ہے۔

(7) آگے چل کر علامہ فرماتے ہیں کہ عشق تو حرم کعبہ کا وہ جید اور پاکباز عالم ہے جو انتہائی خلوص و دیانتداری کے ساتھ ضرورت مندوں کو فقہ اور شریعت کے نکتے سمجھاتا ہے اور میدان حرب میں جہاد کرنے والے عساکر کے لئے سپہ سالاری کے فرائض انجام دیتا ہے۔ غرض حقیقت یہ ہے کہ حقیقی عشق کے ظہور کی لاتعداد شکلیں ہیں۔ وہ تو ایسا مسافر ہے جس کے ایسے ہزاروں مقام ہیں جن کا شمار ممکنات نے نہیں! عشق حقیقی کی ایک شکل بقول اقبال یہ بھی ہے کہ

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی!

(8) اگر زندگی کو ایک ساز تصور کر لیا جائے تو عشق حقیقی کا جذبہ اس ساز کے لئے ایک مضراب کی حیثیت رکھتا ہے جس کے بغیر ساز کا وجود ایک ناکارہ شے ہے اسی طرح اگر یہ جذبہ زندگی کو منور کرتا ہے تو اس میں جوش و خروش بھی پیدا کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ عشق حقیقی عملاً حیات انسانی کو عملی جد و جہد کے لئے مہمیز کا کام دیتا ہے اور اسی کے سبب زندگی میں جلالی و جمالی شان پیدا ہوتی ہیں۔

# تیسرا بند

(1) سابقہ دو بند علامہ نے اس نظم میں تمہید اور پس منظر کے طور پر استعمال کئے ہیں۔ زیر تشریح بند میں وہ اپنے موضوع کی جانب آتے ہوئے "مسجد قرطبہ" کو مخاطب کرتے ہیں تاہم یہ ضرور ہے کہ یہاں بھی انہوں نے سابقہ دونوں بند کے مندرجات اور نقطہ نظر سے بڑی کامیابی سے تسلسل قائم رکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے مسجد قرطبہ! یہ عشق حقیقی کا جذبہ ہی تھا جس کے سبب تیری تعمیر ممکن ہوئی اور عشق تو وہ جذبہ ہے جو ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے۔ فنا اس کی تقدیر میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں کے نامساعد حالات اور آفات کے باوجود تیرا وجود ابھی تک برقرار ہے۔

(2) اے مسجد قرطبہ! تیرے وجود میں مصوری' فن تعمیر اور اسی نوعیت کے فنون اور ہنر جس مہارت اور چابکدستی سے ہم آہنگ ہوئے ہیں وہ اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ جب تک تخلیق کے لئے خون جگر صرف نہ کیا جائے کوئی فن معجزے کی شکل اختیار نہیں کرتا۔

(3) اور وہ معجزہ خون جگر صرف کرنے سے ہی نمودار ہوتا ہے کہ حقیقی فنکار پتھر کو بھی تراشے تو اس میں جاں ڈال دیتا ہے اور یہی کیفیت اس کے قول و الفاظ میں ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اے مسجد قرطبہ! تیری تعمیر کو دیکھ کر ہوتا ہے۔

(4) اے مسجد قرطبہ! تیرا ماحول پر کشش۔ ور دل میں عبادت حق تعالیٰ کی تڑپ پیدا کرنے والا ہے جب کہ میرے اشعار سے سینوں میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ تیری زیارت دیکھنے والوں کو قربت الٰہی کا احساس دلاتی۔ ہے جب کہ میرا کلام لطافت اور بیداری کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

(5) ایسے فنکارانہ معجزے دیکھنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان کا سینہ عرش معلی سے کم نہیں ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنے جسم خاکی کی بدولت آسمان تو کیا خلاء کو بھی چھونے کی صلاحیت نہیں رکھتا پھر بھی اسے فرشتوں سے برتر قرار دیا گیا ہے۔

(6) بے شک فرشتوں کی تخلیق حق تعالیٰ نے نور سے کی ہے اور انہیں یہ بھی شرف حاصل ہے کہ وہ ہر لمحے معبود حقیقی کی تسبیح و تقدیس میں لگے رہتے ہیں تاہم انسان کا مرتبہ فرشتوں اور قدسیوں سے اس لئے زیادہ بلند ہے کہ اس کا دل سوز و گداز اور عشق حقیقی کے جذبے سے مالامال ہوتا ہے۔

(7) ہر چند کہ مجھے ہند کا رہنے والا کافر تصور کیا جاتا ہے لیکن اے "مسجد قرطبہ" تو نے میرے ذوق و شوق کا نظارہ یقیناً کر لیا ہو گا کہ دل سے بھی صلوٰۃ و درود کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور میرے لبوں پر بھی صلوٰۃ و درود کا نغمہ ہے۔

(8) یہ شوق جو عشق حقیقی سے عبارت ہے اس امر کا گواہ ہے کہ میرا لب و لہجہ بھی اسی جذبے سے لبریز ہے اور میرے نغموں میں بھی اسی کا لحن شامل ہے۔ غرض کہ میرے جسم کا ریشہ ریشہ "اللہ ہو" کے نعروں سے سرشار ہے!

# چوتھا بند

**معنی: نخیل:** کھجور کا درخت۔ **دجلہ:** عراق کا مشہور دریا جس کے کنارے بغداد واقع ہے۔ **ڈنیوب:** وسطی یورپ کا مشہور دریا۔ **ثغور:** ثغر کی جمع سرحدیں۔ **رحیل:** کوچ۔ **فارس:** شہسوار۔ **رحیق:** خالص اور صاف شراب۔ **ڈینیوب:** جو جنوبی جرمنی سے نکلتا ہے۔ آسٹریا' ہنگری' یورٹ اور رومانیہ میں گزرتا ہے یورپ کے بعض مشہور شہر مثلاً وی آنا۔ بوڈاپسٹ اسی کے کنارے واقع ہیں۔

(1) اقبال گزشتہ اشعار کے پس منظر کے حوالے سے اس بند کے اشعار میں انہوں نے براہ راست "مسجد قرطبہ" تجھ میں بھی وہی جمال و جلال موجود ہے جو معبود حقیقی کے نزدیک ایک پسندیدہ 'نڈر' بے باک اور سالک شخص میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جس طرح وہ شان و شوکت والا اور صاحب حسن و جمال ہوتا ہے تیرے پیکر میں بھی یہی خصوصیات موجود ہیں۔

(2) اے مسجد قرطبہ! تیری بنیادیں مستحکم ہیں اور تیرے ستونوں کا بھی کوئی شمار نہیں۔ یہ ستون اس طرح سے ایستادہ ہیں جیسے کہ صحرائے شام میں کھجوروں کے درخت کھڑے ہوں۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود وہ اسی طرح قائم و دائم ہے۔ یہ ان ماہرین تعمیرات کا کمال ہے جنھوں نے تیری نادر روزگار عمارت کی تکمیل میں اپنی تمام ترفنی صلاحیتوں اور مہارت سے کام لیا۔

(3) نظم کے آغاز سے قبل انسائیکلوپیڈیا کے حوالے سے مسجد قرطبہ کے بارے میں ایک اجمالی صورت حال اور "مسجد قرطبہ" کی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس کی تکنیکی اور فنی مہارت کے بارے میں کچھ باتیں بتائی گئی ہیں۔ زیر تشریح بند کے اس شعر میں بھی مسجد سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ تیرے دروازوں اور چھتوں پر وادی سینا میں جو نور چمکا تھا یہاں بھی وہ اپنا جلوہ دکھا رہا ہے اور تیرا وہ بلند و بالا مینار جو اذان کے لئے وقف تھا اس پر حضرت جبرئیل "سایہ فگن ہیں۔

(4) اقبال اس شعر میں ایک نئے جذبے اور جوش کے ساتھ اعلان کرتے ہیں۔ ملت اسلامیہ کتنے ہی مراحل سے گزرے اسے کوئی طوفان فنا نہیں کر سکتا اس لئے کہ اس کے جاں نثاروں نے تو اپنی اذانوں کے ذریعے ان رازوں کو بے نقاب کر دیا تھا جن کا تعلق حضرت موسیٰ کلیم اللہ اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبروں سے تھا۔ مراد یہ ہے کہ مسلمانوں نے حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم کی تعلیمات کو سمجھا اور اسے عالمی سطح پر وسعت دینے میں بے حد کار نمایاں انجام دیئے!

(5) مسلمانوں میں اپنے عہد اقتدار میں اپنی زیر نگیں سلطنت کو جو وسعت دی اس کی حدود کا تعین مشکل ہے۔ حتیٰ کہ اس کا افق بھی اس نوع کی حد بندیوں سے آزاد ہے اور دجلہ 'ڈینوب اور نیل جیسے دریا تو اس کے سمندر کی لہریں ہیں مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے وطن کی کوئی حدود نہیں بلکہ دیکھا جائے تو زمین کا ہر گوشہ ہر خطہ اس کا وطن ہے۔

(6) ماضی میں بھی یہ ملت اسلامیہ کے جیالے ہی تھے جنھوں نے نامساعد حالات کے پیش نظر عہد کو کوچ کرنے کا عملی پیغام دیا۔ اس عہد کے حوالے سے مسلمانوں کی عظمت و کارکردگی کے افسانے زباں زد خلق ہیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ اہل ذوق کی رہنمائی کی اور بڑے خلوص و محبت کے ساتھ انہیں منزل آشنا کیا۔ ان کے قول و فعل میں کسی قسم کے تضاد کی گنجائش نہ تھی بلکہ تلوار کی مانند ان کے لہجے میں بھی

کاٹ تھی!
(7) اپنے عزم و عمل کے سبب مسلماں ایسے جاں نثار مرد میدان ہیں جن کا جنگی ساز و سامان بھی کلمہ توحید سے عبارت ہے اور جب دشمنوں کے لشکران کے مقابل تلوار اٹھاتے ہیں تو یہی کلمہ توحید ان کی سپر بن جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ سچا مسلمان خواہ امن ہو یا حالت جنگ وہ کلمہ توحید کو ہی اپنا کل ایمان تصور کرتے ہیں۔

# پانچواں بند

معنی: :نوری نہاد: جس کی طرف نوری ہو۔
(1) اے مسجد قرطبہ! تیری نادر روزگار تعمیر اور اس کی ہیئت و عظمت ان خاصان خدا کی صلاحیتوں اور جذبہ ایمانی کا اظہار بھی ہو تا جو تیری تعمیر و تکمیل کا سبب بنے۔ اس منصوبے میں ان کی شب و روز کی محنت شاقہ اور اس سے لگن کے عمل کا دخل موجود ہے۔
(2) تیری عظمت سے انہی صاحب ایمان و یقین کے بلند مراتب کا اندازہ بھی ہو تا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ان کے خیالات کتنے بلند تھے۔ مزید یہ کہ تیرے وجود سے اس امر کا پتہ بھی چلتا ہے کہ متعلقہ افراد میں ذوق و شوق کی پاکیزگی اور لطافت کا معیار کیا تھا؟ وہ تیرے وسیع صحن میں سجدہ نیاز کے متمنی بھی تھے اور اس نیازمندی میں نیاز کی شان بھی موجود تھی۔
(3) اے مسجد قرطبہ! یہی وہ صاحب ایمان و یقین لوگ تھے جو رضائے خدا کے بغیر اپنی مرضی سے کوئی کام نہ کرتے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس عمل کے عوض کہ ان کی مرضی بھی رضائے خدا میں ڈھل جاتی ہے ان کا کوئی عمل ذاتی اغراض سے وابستہ نہیں ہو تا یہی وجہ ہے کہ خدائے عزوجل نے ان میں وہ صلاحیتیں پیدا کر دی ہیں جن کے سبب وہ اپنے حریفوں پر غالب ہو جاتے ہیں۔ حاجت مندوں کی مشکلات کو رفع کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی حسن عمل کی راہ دکھاتے ہیں۔ بے شک ایسے ہی لوگ تھے جن کے ذہنوں میں تیری تعمیر کا جذبہ پیدا ہوا اور انتہائی جدوجہد اور اپنی قوت عمل سے انہوں نے اس جذبے کو عملی جامہ پہنایا۔
(4) مذکورہ قسم کے لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ ان کی تخلیق ہرچند کہ مٹی سے ہوئی ہے لیکن ان میں فرشتوں کے اوصاف در آئے ہیں اور ان کے دل نور خدا سے تابندہ رہتے ہیں۔ ان کے اندر اپنے آقا و مولا کی سی صفات پیدا ہو جاتی ہیں جن کے سبب ان کے دل دونوں جہانوں کی نعمتوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور پھر وہ ذات باری تعالیٰ کی خوشنودی کے سوا اور کسی کے بارے میں نہیں سوچتے!
(5) ایسے صاحب ایمان لوگوں کے دلوں میں دنیاوی خواہشات کے لئے کم سے کم گنجائش ہوتی ہے جب کہ ان کے مقاصد بہت بلند ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کی بجائے دوسروں کی بہتری کے لئے عملی اقدام کرتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ انتہائی محبت والا اور نرم ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہرن کی خوبصورت اور روایتی طور پر دلفریب آنکھوں میں ایک دل نواز چمک ہوتی ہے اسی طرح ان کی

نگاہوں میں بھی یہی کیفیت محسوس کی جاسکتی ہے۔
(6) یہ صاحب ایمان و یقین جب کسی سے مکالمہ کرتے ہیں تو ان کا لہجہ انتہائی نرم اور شفقت و محبت کا مظہر ہوتا ہے جب کہ تلاش حق میں انتہائی طور پر سرگرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہی نہیں کوئی میدان جنگ ہو یا نجی محفل ہر دو مقامات پر وہ پاک دلی اور پاک طینتی سے کام لیتے ہیں۔
(7) اقبال کے نزدیک اہل ایمان کے نزدیک خدائے برتر کا وجود ہی مرکزی حیثیت کا حامل ہوتا ہے یعنی ذات باری کا عرفان ہی سب کچھ ہے اس کے برعکس یہ جو عالم رنگ و بو ہے وہ وہم' سحر اور ناپائیداری کا مظہر ہے۔ مراد یہ کہ صاحب ایمان لوگوں کا خدا کی ذات پر یقین ہی پائیداری کی علامت ہے۔
(8) اس ضمن میں آخری بات تو یہ ہے کہ یہی صاحب ایمان لوگ فی الواقع عقل سلیم کا سرچشمہ ہیں اور عشق حقیقی کا حامل بھی انہی کا جذبہ ہے۔ چنانچہ کائنات میں جو رونق اور چہل پہل نظر آتی ہے فی الواقع انہی کے دم سے ہے۔

# چھٹا بند

**معنی: دین مبین**: روشن یعنی اسلام۔ **حرم مرتبت**: لفظی معنی کے ہم رتبہ۔ مراد ہے انتہائی عزت و حرمت والی۔ **اندلسی**: اندلس کے رہنے والے۔ اندلس واندالوشیا کا عربی تلفظ ہے یہ ہسپانیہ کے ایک صوبے کا نام ہے۔ مسلمانوں کے زمانے میں یہ لفظ پورے اسلامی ہسپانیہ کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ **خلق عظیم**: اقبال نے ان دو لفظوں کو وارپن میں لکھا ہے۔ گویا اس آیت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ انک لعلی خلق عظیم (یعنی اے رسولؐ: آپؐ پیدا ہوئے ہیں بڑے خلق پر) اس آیت میں حضرت رسولؐ کے اخلاق حسنہ کا ذکر ہے جو اس کائنات میں اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ اقبال سے مراد یہ ہے کہ اندلس کے مسلمان پاکیزہ اخلاق کے حامل تھے۔ جو رسولؐ اللہ لے کر دنیا میں آئے۔ **رمز غریب**: نادر بھید۔ عجیب نکتہ۔ **شرق و غرب**: مشرق اور مغرب یعنی ساری دنیا۔ **گرم اختلاط**: میل جول میں پرتپاک۔
(1) اے مسجد قرطبہ! تیری سطوت و شان کے پیش نظر یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ ماہرین فن کے نزدیک تیری حیثیت حرم کعبہ سے کم نہیں! تو ہی ہے جس سے ملت اسلامیہ کی شان و شوکت میں اضافہ ہوا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اندلس کی سرزمین کو بھی تیرے سبب دوسروں کے لئے انتہائی عزت و احترام کی حقدار بن گئی ہے۔
(2) اس آسمان کے تلے' زمیں پر تیری خوبصورت اور باکمال تعمیر کی دوسری مثال تلاش کی جائے تو اس کا ملنا خارج از امکانات ہے۔ ہاں اگر کہیں اس کا وجود ممکن ہے تو وہ تیرے معمار مسلمانوں کے دلوں میں ہی ہو سکتا ہے کہ یہی لوگ تیری عظمت و احترام کا ادراک رکھتے تھے۔
(3) اور یہ لوگ کون تھے! بعد کے اشعار میں اقبال ان مسلم حکمرانوں کے اوصاف بیان کرتے ہیں جن کے عہد میں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ وہ عربی شہسوار اور مردان حق جو اپنے جملہ کارناموں کی بدولت ہسپانیہ میں اپنے عہد کو مثالی بنا گئے۔ انتہائی خلیق ہونے کے ساتھ پاکیزگی اور سچائی پر یقین رکھتے تھے۔ اور اپنی راستبازی کے طفیل اعلیٰ مراتب حاصل کر سکے۔

(4) یہی وہ مردان حق تھے جن کی حکومت کے ادوار میں یہ راز کھلا کہ اہل دل کی سلطنت تو فی الواقع بادشاہی نہیں بلکہ فقر اور درویشی ہے۔ یہی پیغام حضور سرورِ دو عالم نے دنیا کو دیا تھا۔
(5) یہی لوگ تھے جنہوں نے اپنے بلند کردار اور سیرت کے پس منظر میں مشرق و مغرب میں مقیم باشندوں کی تربیت کی یہی نہیں بلکہ اپنی دانش سے انہوں نے یورپ کو جہل و تعصب کی تاریکیوں سے نجات دلائی اور ہر طرح ان کی رہنمائی کی۔
(6) یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے اندلس کو اپنے علم و اخلاق سے آراستہ کیا اور آج بھی وہاں کے لوگ یہ سبق نہیں بھولے ہیں۔
(7) اندلس میں عربی خون کی آمیزش سے آج بھی حسن و جمال عام ہے اور آج بھی محبت کے راگ الاپے جاتے ہیں۔
(8) جو عرب ابتداء میں اندلس میں آکر آباد ہوئے ان میں سے اکثریت کا تعلق یمن سے تھا چنانچہ یمن کی تہذیب و ثقافت اور معاشرت کے اثرات نے اندلس کے مقامی باشندوں کو پوری طرح متاثر کیا۔

## ساتواں بند

**معنی: المنی**: جرمنی۔ **اصلاح دین**: مراد ریفریشن (Reformation) سے یعنی مذہبی اصلاح کی وہ تحریک جو مارٹن لوتھر باشندہ جرمنی نے یورپ کے خلاف اٹھائی۔ جس کی بنا پر عیسائیت دو بڑے حصوں میں بٹ گئی۔ **پیر کنشت**: لفظی معنی کلیسا کا سب سے بڑا بزرگ یعنی پوپ۔ **انقلاب فرانس**: یہ انقلاب فرانس کی شہنشاہی کے خلاف تھا۔ **ملت رومی نژاد**: مراد ہے اہل اٹلی سے۔ **لذت تجدید**: لفظی معنی تازہ کرنے کی لذت۔ **گنبد نیلو فری**: آسمان۔
(1) ہرچند کے اے مسجد قرطبہ! ستارے بھی تیری سرزمین کو آسمان سے کم تر نہیں سمجھتے یعنی تیرا رتبہ بے شک بہت بلند ہے اس کے باوجود اس سے بڑا المیہ یہاں اور کیا ہو سکتا ہے کہ صدیوں سے کسی نے تیرے بلند و بالا مینار سے اذان کی آواز نہیں سنی!
(2) اب تو مردان حق پرست اور جاں نثاروں کے اس قافلے کا انتظار ہے کہ یہاں پہنچ کر اے مسجد! تیرے وسیع صحن میں سجدہ ریز ہونے سے قبل اللہ اکبر کا آوازہ بلند کرے گا۔
(3) پچھلی چند صدیوں میں مختلف یورپی ممالک میں مذہب اور معاشرے کے حوالے سے کئی تحریکیں اٹھیں۔ اقبال نے اس بند کے اس شعر اور باقی اشعار میں ان تحریکوں کے حوالے سے اپنی فکر کا اظہار کیا ہے۔ زیر تشریح اس شعر میں انہوں نے جرمنی میں مارٹن لوتھر کی مشہور تحریک "اصلاح دین" کا ذکر کیا ہے۔ جس کے باعث عیسائیت دو دھڑوں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں بٹ گئی۔ کیتھولک پوپ کے ماننے والے تھے جب کہ پروٹسٹنٹ مارٹن لوتھر کے پیرو قرار دیئے گئے۔ لوتھر نے یہ دعویٰ کیا کہ نہ پوپ معصوم ہے نا ہی وہ کسی کے گناہ بخشنے کی صلاحیت کا حامل ہے۔ اصلاح دین کی تحریک نے یورپ میں عیسائیت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔
(4) اس شعر کا موضوع بھی اس سے پہلے شعر کا تسلسل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پوپ کی جس

معصومیت کا ایک عرصے سے ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا وہ حرف غلط ثابت ہو کر رہ گئی۔ مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح دین نے اسے کافی نقصان پہنچایا اور عیسائیت کا بنیادی تصور بھی متزلزل ہو کر رہ گیا۔ آزادی فکر کا رد عمل بھی یورپ کو کوئی مثبت تہذیبی ڈھانچہ فراہم نہ کر سکا۔

(5) اس کے ساتھ ہی فرانس میں جو انقلاب آیا اس نے تو مغربی تہذیب اور مغربی معاشرے کے ضمن میں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اس انقلاب کے اثرات بھی عیسائیت کے خلاف مرتب ہوئے۔

(6) لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اطالوی تہذیب اور معاشرہ جو رجعت پسندی اور قدامت کے آخری مرحلے پر تھے وہ ان تبدیلیوں سے ضرور متاثر ہوئے اور ان کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔

(7) اور تو اور مسلم معاشرے میں بھی تبدیلی اور ارتقاء کی خواہشوں نے بڑی تیزی کے ساتھ جنم لینا شروع کر دیا ہے اور یہاں ایک اضطراب کی لہریں دوڑ رہی ہیں اور طوفان کے آثار ہویدا ہیں دیکھنا یہ ہے کہ اس صورتحال میں اس سمندر کی تہہ سے اچھل کر کیا نکلتا ہے۔ اور یہ نیلگوں آسماں کیا رنگ بدلے گا؟ اس شعر میں اقبال کا کہنا یہ ہے کہ یورپ کی طرح عالم اسلام بھی ان بین الاقوامی تبدیلیوں سے متاثر ہو رہا ہے تاہم یہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں اگر تبدیلیوں کو قبول کیا گیا تو اس کی نوعیت کیا ہو گی۔

## آٹھواں بند

**معنی:** آب روان کبیر: وادی الکبیر اندلس کا مشہور دریا۔ امم: امت کی جمع یعنی قومیں۔

(1) اس بند کے ابتدائی اشعار میں اقبال نے مسجد قرطبہ کے گرد و پیش جو مناظر ہیں۔ ان کو اپنے مخصوص انداز میں نظم کرتے ہوئے بعد کے اشعار میں اپنی فکر کے حوالے سے صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔ اولین شعر میں انہوں نے وادی کہسار میں غروب آفتاب کا نظارہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس لمحے تو بادل بھی شفق کے رنگ میں غرق ہو چکے ہیں۔ یوں لگتا ہے ڈوبتا سورج اس مقام پر غروب ہوتے ہوئے لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا ہے مراد یہ ہے کہ وادی کوہ میں موجود سنگریزوں پر شفق کی سرخی جس طرح پڑ رہی ہے اس کے سبب یہ سنگریزے لعل بدخشاں دکھائی دیتے ہیں۔

(2) اس منظرنامے میں کسان کی ایک بیٹی سادہ لیکن پرسوز لے میں اس طرح گیت گا رہی ہے کہ جس سے یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں کہ ایک دوشیزہ کے دل کو اگر کشتی سے تعبیر کر لیا جائے تو شباب کا زمانہ ایک طوفان کے مانند ہو گا۔ اقبال نے بڑی خوبصورت علاقوں کے حوالے سے مذکورہ بالا منظر نامہ میں موجود ایک گاتی ہوئی دوشیزہ کے کردار کو واضح کیا ہے۔

(3) سابقہ دو اشعار کے بعد اس شعر میں اقبال ایک نیا رخ بدلتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اندلس کے مشہور دریا وادالکبیر کے کنارے پر بیٹھا کسی اور زمانے کے بارے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ واضح رہے کہ یہ زمانہ ماضی بھی ہو سکتا ہے جب ہسپانیہ میں سلطنت اسلامیہ عروج پر تھی اور آنے والا دور بھی ہو سکتا ہے جو یورپ میں رونما ہونے والے انقلاب اور تبدیلیوں سے عبارت ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ دریائے کبیر کے کنارے پر ہی مسجد قرطبہ واقع ہے۔

(4) ہر چند کہ آنے والا نیا دور ابھی تک پردہ تقدیر میں پوشیدہ ہے اقبال کہتے ہیں اس کے باوجود میں

اس کی حقیقتیں سے پوری طرح آگاہ ہوں۔
(5) اس شعر میں اقبال اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یورپ نے جو افکار اپنائے ہیں اگر ان کی حقیقت بیان کر دوں تو یورپ کے دانشور شاید اس کو برداشت نہیں کر سکیں گے کہ سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے۔
(6) اس سمیت باقی اشعار میں ایسے نکات بیان کئے گئے ہیں جن کو علامہ کی فکر و دانش کے نچوڑ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ وہ زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔ جس میں انقلاب اور تغیر و تبدل کی صلاحیت نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ وہ انقلابی جدوجہد کو بین الاقوامی سطح پر زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح ایک مقام پر ٹھہرا ہوا پانی کچھ عرصے کے بعد سڑاند دینے لگتا ہے یہی حال ایک قوم کا ہے کہ اگر اس میں عملی جدوجہد کا جذبہ موجود ہو تو وہ عروج سے ہم کنار نہیں ہو سکتی اس مقصد کے لئے تو زندگی میں انقلابی عمل درکار ہوتا ہے۔
(7) وہ قوم جو اپنی جدوجہد اور عمل کے دائرہ کار میں خود احتسابی کو روا رکھتی ہے تو اسے اپنی خامیوں اور خوبیوں کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ اپنی خامیوں کو دور کر لیتی ہے اور خوبیوں میں اضافے کے بارے میں سوچتی ہے۔ اس کی حیثیت تو ایک ایسی تلوار کی مانند ہے۔ جس سے قدرت کام لینے کی خواہاں ہو۔
(8) اور اس ضمن میں حرف آخر یہ ہے کہ عملی جدوجہد اور خون جگر صرف کئے بغیر تمام نقوش اور کام نامکمل رہتے ہیں حتیٰ کہ شاعری کی تخلیق بھی خون جگر کی شمولیت کے بغیر نیم دیوانگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مراد یہ کہ ہر عمل کے لئے خون جگر بنیادی شرط ہے۔

# قید خانہ میں معتمد کی فریاد

126

معتمد اشبیلیہ کا بادشاہ اور عربی شاعر تھا۔ ہسپانیہ کے ایک حکمران نے اس کو شکست دے کر قید میں ڈال دیا تھا۔ معتمد کی نظمیں انگریزی میں ترجمہ ہو کر "وزڈم آف دی ایسٹ سیریز" میں شائع ہو چکی ہیں۔

اک فغاں بے شرر سینے میں باقی رہ گئی
سوز بھی رخصت ہوا جاتی رہی تاثیر بھی!
مرد حر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج
میں پشیماں ہوں پشیماں ہے مری تدبیر بھی!
خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل
تھی اسی فولاد سے شاید مری شمشیر بھی!
جو مری تیغ دو دم تھی اب مری زنجیر ہے
شوخ و بے پروا ہے کتنا خالق تقدیر بھی!

معتمد بقول علامہ اقبال اشبیلیہ کا بادشاہ اور عربی زبان کا مشہور شاعر تھا۔ ہسپانیہ کے ایک حکمران نے اسے شکست دے کر قید میں ڈال دیا۔ اس کی نظمیں انگریزی زبان میں ترجمہ ہو کر "وزڈم آف دی ایسٹ سیریز" (Wisdom of the East Series) میں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر شرح نظم کا ترجمہ بھی اقبال نے انگریزی زبان سے کیا ہے۔ معتمد اور اس کے خانوادے کا تاریخی پس منظر نظم کے اشعار کی تشریح کے بعد پیش کیا جائے گا۔ نظم کے اولین شعر میں کہا گیا ہے کہ
(1) اقبال کے بقول معتمد نے اپنے اشعار میں کہا کہ میں قید خانے کی چہار دیواری میں محبوس ہوں۔ اس

وقت مایوسی اور دل شکستگی کی صورت حال یہ ہے کہ میرا سینہ ہر قسم کے جذبہ مردانگی اور جوش و خروش سے خالی ہو چکا ہے بس لے دے کے ایک فریاد اور باقی رہ گئی ہے۔ جس میں کوئی چنگاری دکھائی نہیں دیتی۔ اور حد تو یہ ہے کہ فریاد میں بھی سوز باقی نہیں رہا اور وہ تاثیر سے بھی محروم ہو گئی ہے۔

② دوسرے شعر میں معتمد کہتے ہیں کہ کس قدر افسوس اور حیرت کا مقام ہے کہ مجھ سا حریت پسند انسان قید خانے کی چہار دیواری میں بند ہے۔ اپنے حریف کے خلاف میں نے جو منصوبہ بندی کی تھی آج اس کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑا ہے کہ میں اس غلط منصوبہ بندی کے باعث شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا ہوں۔

③ مجھے میرے دشمن نے جس زنجیر میں جکڑا ہوا ہے اب تو میرا دل بھی اسی زنجیر کی جانب کھنچا جا رہا ہے حالانکہ میں تو ہمیشہ سے صاحب شمشیر رہا ہوں۔ زنجیر سے اس کشش کا کہیں یہ مطلب تو نہیں کہ دونوں ایک ہی فولاد سے تیار کی گئی ہوں۔

④ یہی کشش اس امر کی مظہر ہے۔ میرے ہاتھ میں کبھی جب دو دھاری تلوار ہوتی تھی اب وہ میرے ہاتھ اور پاؤں کی زنجیر میں ڈھل گئی ہے۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ میں جو کبھی صاحب تخت و تاج تھا اور جاں نثاروں کے ایک لشکر کا سالار بھی تھا آج قید خانے کی زنجیروں میں جکڑا پڑا ہے۔ شاید یہ تقدیر کا کھیل ہی ہے تاہم اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ خالق تقدیر کس قدر بے پروا اور بے نیاز واقع ہوا ہے۔

ان اشعار کی مختصر تشریح کے بعد معتمد اور اس کی گرفتاری کے پس منظر کا بھی مختصراً ذکر کر دیا جائے تو اس سے ان اشعار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ملت اسلامیہ کی تواریخ کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اندلس میں سلاطین بنو امیہ کا زوال ہوا تو یہ سلطنت پارہ پارہ ہو کر کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان میں سے ایک سلطنت بنو عباس کی تھی جس کا مرکز اشبیلیہ تھا۔ **المعتمد علی اللہ** اس سلطنت کا سب سے اہم حکمران تھا۔ جس نے مورخین کے مطابق 1068ء سے 1091ء تک حکومت کی۔

**معتمد** نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کے شعراء اور علماء کی پذیرائی کرتا تھا بلکہ خود بھی انتہائی خوش مذاق شاعر تھا۔ اس زمانے میں ہسپانیہ کی عیسائی حکومتوں نے مذکورہ مسلم ریاستوں پر حملے شروع کر دیے۔ معتمد میں ایک عیسائی بادشاہ الفانسو کا خراج گذار تھا لیکن اس سے بوجوہ اختلاف کے سبب دونوں ممالک کے مابین جنگ ہوئی جس میں مراکش کے مشہور حکمران یوسف بن تاشفین کی مدد سے معتمد نے الفانسو کو شکست فاش دی۔ عیسائیوں کے حملوں سے نجات پانے کے بعد اندلس کی مسلم حکومتوں کے مابین از سر نو ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ جس کی بنا پر یوسف بن تاشفین نے بالآخر اندلس پر اپنا تسلط جما لیا۔ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ معتمد کو بھی قید خانے میں ڈلوا دیا۔ مندرجہ بالا اشعار اسی پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔

# عبد الرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت

127

## سرزمین اندلس میں

یہ اشعار، جو عبد الرحمٰن اول کی تصنیف سے ہیں تاریخ المقری میں درج ہیں۔ مندرجہ ذیل اردو

127 نظم ان کا آزاد ترجمہ ہے۔ (درخت مذکور مدینتہ الزہرا میں بویا گیا تھا)

میری آنکھوں کا نور ہے تو میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں میرے لیے نخل طور ہے تو!
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا صحرائے عرب کی حور ہے تو!
پردیس میں ناصبور ہوں میں پردیس میں ناصبور ہے تو
غربت کی ہوا میں بارور ہو ساقی تیرا نم سحر ہو!
عالم کا عجیب ہے نظارہ دامان نگہ ہے پارہ پارہ
ہمت کو شناوری مبارک پیدا نہیں بحر کا کنارہ!
ہے سوز دروں سے زندگانی اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبح غربت میں اور چمکا ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے! مومن کا مقام ہر کہیں ہے!

اقبال کے بقول اس نظم کے چھ اشعار عبدالرحمن کی تصنیف سے ہیں اور تاریخ المقوی میں درج ہیں۔ مندرجہ ذیل نظم ان اشعار کے آزاد اردو ترجمے پر مشتمل ہے۔ (درخت مذکورہ مدینتہ الزہرہ میں بویا گیا تھا)۔ نظم دو بندوں پر مشتمل ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ پہلے بند کے اشعار تو عبدالرحمن اول کی نظم کے آزاد اردو ترجمے کے طور پر پیش کیے گئے اور دوسرے بند میں خود اقبال کے اپنے تاثرات درج ہیں۔

عبدالرحمن اول کے اشعار اور ان کا آزاد ترجمہ بظاہر بالکل سیدھا سادا ہے۔ اس میں کسی تشریح کی گنجائش بھی نہیں ہے تاہم یہ اشعار اور اس کا شاعر اپنے تاریخی اور ثقافتی پس منظر کے حوالے سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ نظم کی تشریح کے بعد یہ تاریخی پس منظر میں پیش کر دیا جائے گا۔

① شاعر نظم کے اولین شعر میں اپنے ہاتھ سے بوئے ہوئے کھجور کے درخت کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تو میری آنکھوں کی روشنی بھی ہے اور دل کے لیے وجہ مسرت و سکون بھی ہے۔

② مجھے تو جبری طور پر اپنا وطن چھوڑ کر دیار غیر میں اپنا مسکن آباد کرنا پڑا یہاں تیرا وجود میرے لیے وہی اہمیت رکھتا ہے جو کوہ طور پر تجلی حق کے سبب وہاں موجود کھجور کے درخت کو حاصل ہوئی۔

③ ہر چند کہ اپنے مزاج کے اعتبار سے تیرا وجود عرب کے صحرا سے ہی مطابقت رکھتا ہے اور تجھ سے ہی اس صحرا کا حسن برقرار ہے لیکن یہاں اندلس میں مقامی آب و ہوا نے تیری پرورش کی ہے۔

④ اپنا وطن چھوڑ کر میں جس طرح اندلس میں مضطرب اور پریشان ہوں تیری بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔

⑤ میری دعا ہے کہ تو پردیس کی اس اجنبی آب و ہوا اور ماحول میں پھلے پھولے اور علی الصبح برسنے والی شبنم تجھے تازہ دم اور ہرا بھرا رکھے۔

# دوسرا بند

**معنی:** شناوری: تیرنا۔ شام: مراد ہے ملک شام ہے۔

سطور بالا میں اس امر کی نشاندہی کر دی گئی تھی کہ یہ دوسرا بند پہلے بند کے حوالے سے اقبال کے اپنے تاثرات پر مشتمل ہے۔ عملاً اس نظم کی تخلیق دو شاعروں سے متعلق ہے۔ پہلے بند کے اشعار عبدالرحمٰن اول کی نظم کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بھی اقبال نے کیا ہے اور دوسرا بند تو خود ان کے تاثرات کا حامل ہے۔ فرماتے ہیں کہ

① اس عالم فانی کی صورت حال عجیب و غریب ہے کہ جسے دیکھ کر انسان کی آنکھیں چار ہو جاتی ہیں اور وہ پتھر ہو کر رہ جاتا ہے کہ بقول خود اقبال کے!

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!

مراد یہ ہے کہ کل جو انتہائی عروج پر تھے آج زوال و پستی سے دوچار ہیں۔ یہ اشعار عبدالرحمٰن اول کی جانب ہے۔ جو ترک وطن پر مجبور ہو کر ایک اجنبی دیس میں آکر آباد ہوا۔

② اس عالم رنگ و بو کی مثال سمندر کی سی ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا اور لامحدود ہوتا ہے۔ یہاں کم ہمتی اور مایوسی کا کوئی دخل نہیں بلکہ انسان کو بلند حوصلگی اور عزم و ہمت کے ساتھ حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

③ یہ زندگی کسی نصب العین کے بغیر کامیابی کے ساتھ بسر نہیں ہو سکتی۔ انسان تو مٹی کا پتلا ہے اور مٹی سے کبھی چنگاریاں پیدا نہیں ہوتیں لیکن اگر اس کے دل میں کچھ کرنے کی لگن اور تڑپ موجود ہو تو پھر اس کا ہر عمل کامیابی و کامرانی سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

④ اس شعر میں علامتی سطح کے باوجود اقبال کا واضح اشارہ عبدالرحمٰن اول کی جانب ہے کہ یہ بلند حوصلگی اور دلی تڑپ کے علاوہ عزم و ارادہ کی برکت ہی تھی کہ اموی شہزادے عبدالرحمٰن کو اپنی مملکت شام سے فرار ہو کر اندلس میں پناہ لینا پڑی لیکن انہی جذبوں کی بدولت یہاں بھی وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا بانی ہوا جس کا نام آج بھی تاریخ میں محفوظ ہے۔ صبح غربت اور شام کے ٹوٹے ستارے سے اقبال نے خوبصورت علامتیں تخلیق کی ہیں۔

⑤ آخری بات یہ کہ جو شخص صاحب ایمان ہے وہ کسی ایک مقام تک محدود نہیں رہتا بلکہ جہاں سکونت اختیار کی وہی اس کا وطن ہے۔

اس نظم کا پس منظر مختصراً یہ ہے کہ شام میں عباسیوں نے اموی سلطنت کو ختم کر کے اس خانوادے کے سرکردہ لوگوں کو چن چن کر قتل کرا دیا۔ اموی خاندان کا شہزادہ عبدالرحمٰن مختصر سے لشکر کے ساتھ فرار ہو کر اندلس پہنچا اور وہاں اموی گورنر کو شکست دے کر ایک مضبوط سلطنت قائم کر لی۔ قرطبہ کے پاس اس نے ایک باغ لگوا کر وہاں اپنا محل تعمیر کرایا۔ یہیں پر وہ کھجور کا درخت لگوایا جو اس نظم کا محرک ہے۔

128

# ہسپانیہ

## (ہسپانیہ کی سرزمین میں لکھے گئے)

## (واپس آتے ہوئے)

ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امیں ہے / مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں / خاموش اذانیں ہیں تری باد سحر میں
روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں / خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی؟ / باقی ہے ابھی رنگ مرے خون جگر میں!
کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں / مانا وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں!
غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن / تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں!
دیکھا بھی دکھایا بھی' سنایا بھی سنا بھی / ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں!

**معنی:** **کوہ کمر:** پہاڑ اور اس کا دامن۔ **غرناطہ:** اندلس کا مشہور شہر جو قرطبہ کی عظمت مٹ جانے کے بعد ہسپانیہ کے آخری اسلامی حکمران خاندان کا دارالحکومت تھا۔

ہسپانیہ میں مسلمانوں کا عروج و زوال بعض مورخین کی طرح اقبال کے ہاں بھی ان کی شاعری کے حوالے سے انتہائی طور پر قابل توجہ رہا ہے۔ دراصل مسلم حکمرانوں کے عہد میں ہسپانیہ نے ہر شعبہ زندگی میں جو ترقی کی وہ اس ملک کے لئے عہد زریں کی حیثیت رکھتا ہے جب مسلم حکومتیں زوال پذیر ہوئیں اور یہاں عیسائی حکمرانوں نے تسلط جمایا تو انہوں نے انتقاماً مسلمانوں کی قائم کردہ تہذیب و ثقافت کو تباہ کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اقبال نے اپنے اشعار میں جہاں بھی ہسپانیہ کو موضوع بنایا ہے وہاں وہ ایک طرح کے کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ زیر شرح نظم بھی انہوں نے ہسپانیہ کی سرزمین سے واپس آتے ہوئے لکھی۔ وہ کہتے ہیں۔

① ہسپانیہ وہ سرزمین ہے جہاں صدیوں تک نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کا اقتدار قائم رہا بلکہ وہ وقفے وقفے سے عیسائی حکمرانوں کی یلغار کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس سرزمین کو مسلمانوں نے ہر ممکن جدوجہد اور قربانی سے زندگی کے ہر شعبے میں انتہائی عروج پر پہنچایا۔ ہسپانیہ پر اپنا تسلط برقرار رکھنے اور اس سرزمین کے دفاع میں لاکھوں مسلمانوں نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا۔ بے شمار مسلم حکمران' سپہ سالار' ادیب' فلسفی' شاعر' معمار' صناع اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین اس کی خاک تلے دفن ہیں۔ اس لئے اگر اقبال اس سرزمین کو مسلمانوں کے خون کی امانت دار سمجھتے ہوئے اسے حرم کعبہ کی طرح پاک اور محترم گردانتے ہیں تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ مسلمانوں کی قربانیوں کے سبب آج بھی ہسپانیہ کی تہذیب و ثقافت ساری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

② اے ہسپانیہ! جب بھی چشم بصیرت سے دیکھا تو یوں لگتا ہے کہ تیری خاک ابھی تک ان سجدوں کے نشان ثبت ہیں جو سات سو سال سے زیادہ عرصے تک یہاں مسلمانوں نے ادا کئے۔ اسی طرح جب یہاں

صبح کی ہوا چلتی ہے تو ان میں ماضی کی اذانوں کی گونج سنائی دیتی ہے اور اس دور کی یاد تازہ کر جاتی ہے۔

③ یہ سجدہ گزار وہی جاں نثار تھے۔ جنگ و جدل کے دوران جن کی تلواریں اور نیزے اس طرح سے چمکتے تھے جیسے ستارے جگمگا رہے ہوں یہی وہ لوگ تھے جو آرام و آسائش کی پروا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کے خیمے پہاڑوں کی چوٹیوں اور ان کے دامن میں نصب ہوتے تھے۔ وہ ہر لمحے حالت جنگ میں ہوتے تھے اس لئے انہیں مستقل ٹھکانوں کی پرواہ نہ تھی۔

④ ہسپانیہ کی سرزمین حال کی طرح ماضی میں بھی حسن و جمال کا سرچشمہ رہی ہے۔ اقبال پیشکش کرتے ہیں کہ ہسپانیہ اگر تیری حسین صورتوں کو اپنے جمال میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے تو میرا خون ان کے لئے مہندی کا بدل ثابت ہو سکتا ہے اور ابھی اس خون کی ایک قلیل مقدار میرے جسم میں محفوظ ہے۔

⑤ ہرچند کہ آج کے مسلمانوں میں وہ جذبہ' حرارت اور غیرت باقی نہیں رہی جو ماضی کے ادوار میں ہوتی تھی اس کے باوجود وہ اپنے حریفوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔

⑥ اقبال کہتے ہیں کہ ہسپانیہ میں قیام کے دوران میں نے غرناطہ کا مشہور شہر بھی دیکھا جو قرطبہ کی عظمت مٹ جانے کے بعد اندلس کے آخری مسلمان حکمران کا دارالحکومت بنا اور جہاں وہ مشہور زمانہ شاہی محل اب تک موجود ہے جو الحمرا کے نام سے موسوم ہے اور دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ غرناطہ جیسے عظیم الشان مناظر دیکھنے کے باوجود سکون قلب میسر نہیں ہوا۔

⑦ اس آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ میں نے (اقبال نے) ہسپانیہ کے دوران قیام ہر نوع کے خوشنما مناظر بھی دیکھے اور ان کے بارے میں دوسروں سے مختلف نوعیت کی داستانیں بھی سنیں۔ ان کا جلال و جمال اپنے اشعار کے ذریعے دوسروں تک پہنچانے کے علاوہ وہ باتیں بھی دہرائیں جو اوروں کی زبانی سنی تھیں اس کے باوجود ہمیں سکون قلب حاصل نہ ہو سکا۔



# طارق کی دعا
## (اندلس کے میدان جنگ میں)

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی!
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت' نہ کشور کشائی!
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خون عرب سے!
کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں' نظر میں' اذان سحر میں!
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں!
کشاد در دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

دل مرد مومن میں پھر زندہ کر دے ۔ وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لا تذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے ۔ نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے!

**معنی:** خیاباں: پھولوں کی کیاری عرفاً مراد ہے باغ۔

بنو امیہ کے خلیفہ ولید کے عہد میں پہلی بار جب مسلمان عساکر نے ہسپانیہ پر قبضہ کیا تو اس فوج کا سپہ سالار طارق بن زیاد تھا۔ طارق کا تعلق بربر قبیلے سے تھا۔ وہ انتہائی دلیر' جراءت مند اور اصولوں کا پکا تھا۔ عالم اسلام کے ممتاز سپہ سالار موسیٰ بن نصیر کی زیر تربیت تمام عسکری فنون پر اس نے مہارت حاصل کر لی تھی۔ جب خلیفہ ولید نے موسیٰ بن نصیر کو افریقہ کا گورنر بنا کر بھیجا تو طارق بھی ایک فوجی دستے کے سالار کی حیثیت سے اس کے ہمراہ تھا۔

انہی ایام میں اندلس سے مسلمانوں کی ایک جماعت ہسپانیہ کے سربراہ مملکت راڈرک کے ظلم و ستم کی داستانوں کے ساتھ موسیٰ بن نصیر کے پاس آئی تو اس نے اپنے چند فوجی دستے سرحدی علاقوں کا جائزہ لینے کے لئے بھیجے جو ہسپانوی فوج سے معمولی جھڑپوں کے بعد واپس چلے آئے۔ موسیٰ بن نصیر نے بالآخر تمام صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد پانچ ہزار جنگجو فوجیوں کا نسبتاً ایک بڑا لشکر طارق بن زیاد کی قیادت میں بھیجا۔

اس معرکے کا سب سے اہم اور تاریخی واقعہ یہ ہے کہ طارق جن جہازوں پر سمندر پار کر کے اپنی فوج کو دشمن کے علاقے میں لے گیا تھا ساحل پر اترتے ہی اس نے ان جہازوں کو نذر آتش کرنے کا حکم دیا تاکہ اس کا کوئی سپاہی واپسی کے بارے میں سوچ بھی نہ سکے۔ کئی روز کی خونریز جنگ کے بعد طارق کا لشکر فتح یاب ہوا اور راڈرک فرار ہوتے ہوئے ایک دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ اس حملے نے ہسپانیہ کی تقدیر بدل کر رکھ دی بعد میں اس ملک پر مسلمانوں کا ساڑھے سات سو سال تک قبضہ برقرار رہا۔

اس پس منظر میں یہ نظم ہرچند کہ اقبال کے تصوراتی اشعار پر مبنی ہے تاہم بین السطور میں تاریخ کا جو بے حد منفرد اور اہم واقعہ موجود ہے (جہاز جلوانے کا) اس کے باعث اس نظم کی اہمیت بھی دوچند ہو جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں بالخصوص ہسپانیہ میں مسلمانوں کے عروج و زوال پر رائے زنی کی گئی ہے۔ وہ ایسے عظیم المرتبت کرداروں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ طارق بن زیاد کا یہ ہمیشہ یاد رکھا جانے والا معرکہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ فرماتے ہیں۔

① اے پالنے والے! میرے فوج کے جیالے جو اپنی کشتیاں جلا کر راہ حق میں اپنے دشمن کے خلاف نبرد آزما ہیں وہ غازی ہیں جن کے کردار اور صلاحیتوں کا بھید کسی پر منکشف نہیں ہوتا اس لئے کہ ان کو تو تیری جانب سے قیادت اور سرداری کی صلاحیت عطا ہوئی ہے۔

② یہ لوگ تو صحراؤں اور دریاؤں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کی ہیبت سے پہاڑوں کے دل بھی لرز اٹھتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان کے جانبازوں کے عزم و حوصلے اور جراءت و ہمت کے سامنے جنگل' دریا اور پہاڑ بھی کوئی معنی نہیں رکھتے۔

③ اس کی وجہ اے باری تعالیٰ! ان غازیوں کے پاکیزہ قلوب میں تیرے عشق حقیقی کا موجزن ہونا ہے کہ اس عشق میں ہی وہ لذت موجود ہوتی ہے۔ جو انسان کو ہمیشہ سرمست رکھتی ہے۔ اور دونوں جہانوں سے بھی بے نیاز کر دیتی ہے۔ وہ دنیا و آخرت میں صرف تجھے ہی اپنا مقصود تصور کرتے ہیں۔ اور تیری ہی خاطر

زندہ رہتے ہیں اور تیرے لئے موت سے ٹکرا جاتے ہیں۔

④ یہ لوگ ایسے صاحب ایمان ہیں جن کا مقصد تیری راہ میں شہادت کے حصول کے سوا اور کچھ نہیں! وہ نہ تو دوسروں کی املاک پر قابض ہونے میں یقین رکھتے ہیں نا ہی اس قبضے سے حاصل ہونے والا لوٹ کا مال ان کا مقصود ہوتا ہے۔

⑤ ہسپانیہ اگرچہ خوش حال اور سرسبز علاقہ ہے لیکن اے باری تعالیٰ تیرے نام اور ملک کی سربلندی کے لئے تیرے غازی ہر قربانی دینے یہاں آگئے ہیں۔

## دوسرا بند

① اقبال کے مطابق طارق بن زیاد کے حوالے سے دعائیہ نظم کے دوسرے بند میں باری تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ تو نے عرب کے صحرانشین مسلمانوں میں وہ صلاحیت پیدا کر دیں جو عشق حقیقی سے آگاہی، اور اشیاء کی پہچان کے علاوہ صبح کی اذان میں جو سرور اور کیفیت ہوتی ہے۔ ان سب کی بنا پر انہیں یگانہ روزگار بنا دیا۔ مراد یہ ہے کہ ان لوگوں میں زندگی کی جملہ حقیقتوں کا ادراک پیدا کر کے انہیں دوسروں سے افضل بنا دیا۔

② حیات انسانی صدیوں سے جن خصوصیات سے محروم تھی اے مالک! عرب کے صحرانشینوں میں تو نے وہی صلاحیتیں اور خصوصیات پیدا کر کے انہیں ایک ایسی مثالی قوم میں ڈھال دیا جو دوسری قوموں کو نصیب نہ ہو سکیں۔ مسلمانوں کے دلوں میں کچھ کر گزرنے کی جو تڑپ اور اضطراب ہے وہی حقیقی زندگی کی مظہر ہیں۔

③ میرے مولا! ان صحرانشینوں کی خصوصیت تو یہ بھی ہے کہ وہ موت کو ہلاکت نہیں تصور کرتے بلکہ ان کے لئے نہ صرف یہ کہ زندگی آخرت کی کھیتی ہے بلکہ وہ تو حیات بعد الموت کے قائل ہوتے ہوئے موت کے بعد کی زندگی کو پہلی زندگی سے بدرجہا بہتر اور افضل سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں موت انہیں کیسے خوفزدہ کر سکتی ہے؟

④ حضرت نوحؑ نے مولائے کائنات سے دعا کی تھی کہ دنیا سے کفر کی ظلمت کو مٹا دے اور اسے نور ایمان سے لبریز کر دے۔ اسی حوالے سے دعا کے اس شعر میں کہا گیا کہ باری تعالیٰ تو اپنی رحمت سے مرد مومن کے دل میں وہی جذبہ پیدا کر دے جو حضرت نوحؑ کی دعا میں موجود تھا۔

⑤ اے مالک دوسرا! عزم و حوصلے کے جذبے مومنوں کے سینوں میں دفن ہیں۔ انہیں پھر سے بیدار کر دے کہ مسلمانوں کی نگاہیں تلوار کی مانند کاٹ کی حامل ہوں جو حریف کو فنا کے گھاٹ اتار دیں یعنی ان میں عملی جدوجہد کا جذبہ پیدا ہو سکے!

130

# لینن

## (خدا کے حضور میں)

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات!
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بند شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالق اعصار و نگارندہ آنات
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات!
جب تک میں جیا خیمہ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟
وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات؟
مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!
یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات!
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات!
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات!
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت!
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات!
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات!
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات!
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سر شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات!

**معنی: انفس:** نفس کی جمع۔ مراد ہے عالم ارواح ۔ **آفاق:** افق کی جمع۔ مراد ہے عالم اجسام۔ **آیات:** آیت کی جمع نشانیاں۔ **متغیر:** بدلنے والے۔ **نظریات:** نظریہ کی جمع۔ **کواکب:** کوکب کی جمع ستارے بنیائے کواکب سے مراد ہے ستاروں کے علم کا ماہر یعنی نجومی یا عالم ہیئت۔ **دانائے نباتات:** علم نباتات کا ماہر۔ **اعصار:** عصر کی جمع۔ زمانے۔ **نگارندہ:** لکھنے والے۔ **آنات:** آن کی جمع۔ اوقات۔ **متلاطم:** لہریں لینے والے۔ **سماوات:** سما کی جمع۔ آسمان۔ **فلزات:** دھاتیں۔ **ظلمات:** ظلمت کی جمع اندھیرے۔ **مرگ مفاجات:** ناگہانی موت۔ **مدنیت:** تمدن۔ بود و ماند۔ **شاطر:** لفظی معنی شطرنج کھیلنے والا۔ مراد ہے نہایت چالاک۔ **تزلزل:** زلزلہ۔ **پیران**

**خرابات**: مے خانے کے منتظم۔ **مکافات**: بدلہ۔

"بال جبریل" اور اقبال کی دوسری کتابوں میں بعض ایسی نظمیں اور اشعار شامل ہیں جن کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال اپنے فکر و فلسفے کے حوالے سے انتہائی بالغ نظر اور وسیع القلب شاعر تھے۔ ان کی سوچ گہرائی اور گیرائی کی مظہر تھی۔ یہ مسئلہ یقیناً ایک تفصیلی بحث کا متقاضی ہے جس کی ان صفحات میں کسی اعتبار سے بھی گنجائش نہیں۔ اس مجموعہ میں "لینن خدا کے حضور میں' فرشتوں کا گیت اور فرمان خداوندی' فرشتوں کے نام اسی قبیل کی نظمیں ہیں جو علامہ کی عام سوچ سے قدرے مختلف نظر آتی ہیں۔

لینن روس کا وہ عظیم انقلابی رہنما تھا جس کارل مارکس کے اشتراکی فلسفے کو عملی جامہ پہنا کر نہ صرف یہ کہ اپنی جماعت بنائی جس کا نام بالشویک تھا بلکہ 1917ء میں زار روس کا تختہ الٹ کر اشتراکی حکومت قائم کی۔ ہرچند کہ اقبال کا اشتراکی نظریات سے کوئی تعلق نہ تھا تاہم انہوں نے اس فلسفے اور اس کے رہنماؤں بالخصوص لینن کے فکر و فلسفے کو جس انداز سے دیکھا یہ نظم اس کی ایک واضح شکل ہے۔ اس نظم میں علامہ نے لینن کو خدائے ذوالجلال سے مکالمہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ تکنیکی اور فکری سطح پر بھی یہ ایک اہم نظم ہے۔ فرماتے ہیں۔

① اے خدا! میں اس حقیقت سے تو آشنا ہوں کہ عالم ارواح اور عالم اجسام دونوں مقامات پر تیری نشانیاں واضح اور نمایاں ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ تیرا وجود ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔

② لیکن اس عالم آب و گل میں فلسفہ و دانش اور ان کے حوالوں سے نظریات میں رد و بدل ہوتا رہتا ہے اس نے ایک تذبذب کی کیفیت پیدا کر دی ہے جس کے سامنے تیرے وجود کے بارے میں میں بھی بے یقینی کا شکار رہا اور کوئی واضح شکل سامنے نہ آ سکی۔

③ یوں بھی ہے کہ عصر موجود میں علم ہیئت و نجوم کے ماہر ہوں یا ماہرین فطرت! وہ خود بھی حقیقت کا صحیح ادراک نہیں رکھتے۔ اول الذکر تو ستاروں کی گردش پر اکتفا کرتے ہیں اور دوسرے آئے دن نئی نئی باتیں سناتے ہیں لیکن دیکھا جائے تو ان کو فطرت کے مظاہر سے کوئی آگاہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود بھی تیری ذات کے عرفان سے محروم رہے اور دوسروں کو بھی محروم رکھا۔

④ یہ درست ہے کہ جب تک زندہ رہا اس وقت کلیسا کی تعلیم اور پادریوں کی باتوں کو بے معنی سمجھ کر نظرانداز کرتا رہا لیکن اب عالم آخرت میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تمام باتیں تو حقیقت پر مبنی تھیں۔

⑤ بے شک ہم تو شب و روز کے چکروں میں محصور اور بے بس انسان ہیں اور اے باری تعالیٰ! جہاں تک تیری ذات کا تعلق ہے تو زمانوں کا خالق اور ایک ایک لمحے کی واردات کو محفوظ رکھنے والا ہے۔

⑥ تاہم! اگر تو مجھ کو اجازت دے اور میری اس جسارت سے درگزر کرے تو وہ بات ضرور پوچھوں گا جسے دنیا کے بڑے بڑے فلسفی اور ان کی تصانیف حل نہ کر سکیں۔

⑦ اور وہ یہ کہ جب تک میں زندہ رہا یہی بات میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی۔

⑧ اپنا مدعا بیان کرنے سے قبل یہ ضرور تسلیم کروں گا کہ جب روح میں خیالات متلاطم ہوں تو انسان کو اپنی گفتگو پر قابو نہیں رہتا چنانچہ اس جسارت کے لئے پہلے سے معذرت خواہ ہوں۔

⑨ لیکن اے خالق کائنات! بس اتنا بتا دے کہ وہ کون سا انسان ہے کہ تو جس کا معبود ہے؟ کیا یہ وہی انسان تو نہیں جو خاک کا پتلا ہے اور جو زیر آسماں آباد ہے؟

⑩ لیکن مشرق کے انسانوں کے خدا تو مغرب کے سفید فام لوگ بنے ہوئے ہیں جنھوں نے اس علاقے پر اپنا تسلط قائم کیا ہوا ہے اور جہاں تک اہل مغرب کا تعلق ہے وہ ہر لمحے چمکدار دھاتوں یعنی اسلحہ اور سکوں کی پرستش کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ پھر اے باری تعالیٰ! یہ تو بتا کہ تیرا پرستار کون ہے۔

(11) مجھے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ یورپ میں علم و ہنر اور سائنس و فلسفہ نے بڑی ترقی کی ہے اور وہاں ہر سو عقل و خرد کی روشنی ہے لیکن پھر بھی وہاں تاریکی کا دور دورہ ہے اور اس تاریکی میں کوئی ایسا چشمہ حیواں نہیں جس سے انسان حقیقی زندگی حاصل کر سکے۔

(12) یورپ میں تو صورت حال یہ ہے کہ فن تعمیر، رونق اور صفائی کے اعتبار سے بنکوں کی عمارتیں گرجا گھروں کی نسبت زیادہ آسودہ نظر آتی ہیں اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ یورپی باشندوں کو مذہبی عبادت گاہوں سے زیادہ اپنی دولت اور کاروبار سے لگاؤ ہے۔

(13) تاہم امر واقع یہ ہے کہ بظاہر یہ لوگ تجارت اور کاروبار کر رہے ہیں لیکن عملی طور پر اس کی حیثیت جوئے سے کم نہیں۔ یورپ میں کاروبار بالعموم سٹے کی بنیاد پر ہوتا ہے جس میں ایک آدھ شخص کو فائدہ ہوتا ہے جب کہ لاکھوں لوگ اقتصادی طور پر تباہ ہو جاتے ہیں۔

(14) چنانچہ وہاں جو علم و فلسفہ اور حکمت و سلطنت ہیں وہ بظاہر تو مساوات کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن عملاً اپنے استعماری منصوبوں سے لوگوں کے جسموں سے خون نچوڑ لیتے ہیں۔

(15) مغرب میں ہر نوع کی ترقی کے باوجود آج بھی کیفیت یہ ہے کہ ان کے زیر نگیں ممالک میں بیروزگاری اور غربت نے ڈیرہ جما رکھا ہے۔ تن ڈھانپنے کو لباس نہیں اور شراب نوشی کی لعنت عام ہے۔ ان مسائل کے پیدا کرنے کے علاوہ اہل یورپ نے خلق خدا کے لئے کون سی خدمات سرانجام دی ہیں۔

(16) یہ نظم فی الواقع تکنیکی اور فکری سطح پر اقبال کی نمائندہ اور شاہکار نظموں میں سے ایک ہے۔ قاری جوں جوں آگے بڑھتا ہے تخیل اور نغمگی اس کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ نظم کے پہلے شعر سے آخر تک انہوں نے جو تھیسس بنایا ہے اور جس انداز میں بنایا ہے اس کی مثال خود اقبال کے ہاں ہی نہیں اردو کی پوری نظمیہ شاعری میں غالباً مشکل سے ہی مل سکے گی۔ اس حوالے سے ہمیں ہر ہر شعر میں ایک نئی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ زیر تشریح اس شعر میں بھی لینن کی زبانی یورپ کی تہذیبی اور اقتصادی صورت حال کے حوالے سے اس کی خامیوں کی جانب بھی اشارے ملتے ہیں کہ مغربی قوم نے بے شک بجلی اور بھاپ کی قوتوں کو تسخیر کر کے اپنے لئے ترقی کی راہیں تو کھول دی ہیں لیکن اسے قدرت کے انعامات پر اعتماد نہیں رہا یہی وجہ ہے کہ وہ اخلاقی اقدار سے محروم ہو چکا ہے اور سائنسی اور فنی ارتقاء کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھی ہے۔

(17) اس شعر کو بھی سابقہ شعر کے منظر نامے کے حوالے سے ہی دیکھا جانا چاہیے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یورپ نے صنعتی ارتقاء کے لئے نت نئی مشینوں کی ایجاد سے ان کی اجارہ داری تو قائم کر لی لیکن اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانوں کے دل فولاد کی طرح بے حس ہو گئے اور خود بھی مشین ہی بن گئے اس کے نتیجے میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ انسانی ہمدردی کے ساتھ مروت اور احسان کے احساسات بھی ان

مشینوں کی زد میں آ کر کچلے گئے۔ یعنی خود انسان فولادی مشینوں کی مانند بے حس ہو گیا۔

(18) تاہم اس سائنسی اور فنی ارتقاء کے ذریعے یورپ میں جس طرح کی مصنوعی زندگی بروئے کار آئی ہے اس کی ناکامی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں اور یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ تقدیر بالآخر انسانی تدبیروں کو شکست دینے میں پھر سے کامیاب ہو گئی ہے۔ جس کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ استعمار پرستوں نے جو سرمایہ دارانہ صنعتی نظام قائم کیا تھا وہ اب شکست و ریخت سے دوچار ہوتا نظر آ رہا ہے اس نظام کا مقصد محض دولت کا ارتکاز اور پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ قوموں کو لوٹ کر مزید انحطاط سے دوچار کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

خود یورپ میں محنت کشوں میں بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے ان کو احساس ہو چکا ہے کہ صنعتکار اور سرمایہ داران کی محنت سے اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں اور وہ خود افلاس کی چکی میں بری طرح سے پستے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی صفوں میں ہلچل پیدا ہو چکی ہے اور شدید رد عمل کا آغاز ہو چکا ہے۔

(19) یورپ کا سرمایہ دارانہ نظام بے شک کچھ عرصے تک تو کامیابی سے دوچار رہا لیکن اس کی بنیاد چونکہ مستحکم نہ تھی اس لئے اب بری طرح سے انتشار سے دوچار ہے چنانچہ اس نظام کو جاری رکھنے والے خود پریشان ہیں کہ جو صورت حال سامنے نظر آ رہی ہے اس سے کس طرح عہدہ برآ ہوں۔

(20) اس مشینی اور استعماری نظام نے جہاں دوسروں کو متاثر کیا ہے وہاں خود اس نظام کے مدعی اہل یورپ کی صحتیں برباد ہو چکی ہیں۔ سرشام جب وہ گھر سے بن ٹھن کر برآمد ہوتے ہیں تو ان کے چہروں کی سرخی فطری نہیں بلکہ اس امر کی غماز ہوتی ہے کہ یا تو ان کے چہروں پر شراب نوشی یا پھر مختلف نوعیت کے پاؤڈر کے استعمال کے سبب سرخ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ مصنوعی زندگی نے ان کی صحتوں کو گھن کی طرح چاٹ لیا ہے اور اب جو چہروں پر سرخی نظر آتی ہے وہ فطری نہیں بلکہ مصنوعی ہے۔

(21) نظم کے آخری دو اشعار میں یہ لہجہ نسبتاً زیادہ تلخ نظر آتا ہے۔ زیر تشریح شعر میں باری تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ بے شک تجھے کائنات کی ہر شے پر قدرت حاصل ہے اور تو عادل و منصف بھی ہے اس کے باوجود اتنا بتا دے کہ تیری دنیا میں مزدوروں اور محنت کشوں کی زندگیوں میں تلخیاں کیوں بھری ہوئی ہیں۔ انہیں اطمینان قلب کیوں نصیب نہیں ہوتا؟

(22) مجھے اب اتنا بتا دے کہ سرمایہ دارانہ اور استعماری نظام کب تباہ ہو گا؟ اب تو ساری دنیا اس ضمن میں روز مکافات کی منتظر ہے۔ بے شک ظالم کی رسی ایک حد تک دراز ضرور ہوتی ہے لیکن بالآخر ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب تیرا عذاب اس پر نازل ہوتا ہے۔ استعماری نظام اب ظلم کی انتہا تک پہنچ گیا ہے اس پر تیرا عذاب کب نازل ہو گا؟ اور دنیا بھر کے لوگ اس ظالمانہ نظام سے کب نجات پا سکیں گے؟

## فرشتوں کا گیت

131

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی! نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی!

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی!
تیرا امیر مال مست' تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی!
دانش و دین و علم و فن بندگی ہوس تمام
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی!
جوہر زندگی ہے عشق جوہر عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگی نیام ابھی!

**معنی:** زمام: لگام باگ عنان نکیل۔ پردگی نیام: میان کے اندر چھپی ہوئی۔

یہ تجزیہ بڑی حد تک حقیقت پر مبنی سمجھا جانا چاہیے یہ تین نظمیں "لینن خدا کے حضور میں" فرشتوں کا گیت اور فرمان خدا (فرشتوں سے) ایک ہی دور کی نظمیں ہیں۔ مشرق و مغرب کی تہذیب' ثقافت معاشیات اور دیگر عوامل اور ان کے تضادات کو جب اقبال نے قریب سے دیکھا تو اس کے ردعمل کے طور پر انہوں نے ان نظموں میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

① چنانچہ اس نظم کے اولین شعر میں فرشتے باری تعالٰی کے حضور استدعا کرتے ہیں کہ تو نے انسان کو عقل و دانش اور عشق و محبت کے جذبوں سے اس لئے نوازا تھا کہ وہ تیرے مشن کی تکمیل کر سکے لیکن صورت یہ ہے کہ نہ وہ عقل و دانش سے کوئی مثبت کام لے سکا نا ہی معاشرے میں عشق و محبت کے جذبے کو عام کر سکا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تو نے جو نقش وضع کیا تھا وہ عملی سطح پر ابھی تک ادھورا ہے۔

② اے مالک دوجہاں! آج بھی صورت حال یہ ہے کہ رند ہو یا فقیہہ' امیر ہو یا کوئی سجادہ نشیں۔ یہ سب عوام الناس کو اپنے مفاد کے لئے آلہ کار بنانے میں مصروف ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیری دنیا میں جو حالات پہلے تھے ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ حالات جوں کے توں ہیں۔

③ تیرے روسا کا حال تو یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کمانے میں مصروف ہے اور ہر جائز و ناجائز طور پر اپنی تجوریاں بھر رہا ہے جب کہ تیرے درویش اپنے حال پریشاں میں ہی مست نظر آتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں عام آدمی تو گلی کوچوں میں دھکے کھاتا پھر رہا ہے اور آقاؤں کا معاملہ آدمی تو گلی کوچوں میں دھکے کھاتا پھر رہا ہے اور آقاؤں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بلند و بالا محلات میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

④ عقل و دانش اور علم و فن کے نام لیوا ان خصوصیات کو ذاتی مفادات اور برتری کے لئے استعمال کر رہے حالانکہ ان تمام خصوصیات کا بنیادی مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ عام لوگوں کی بہتری کے لئے استعمال ہوں اس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ تیرے عشق حقیقی کا فیض عام نہیں ہو سکا۔

⑤ اس ضمن میں ایک نکتہ تو یہ ہے کہ حیات انسانی کا جوہر عشق ہے جب کہ عشق کا جوہر جذبہ خودی ہے چونکہ معاشرے میں خودی بروئے کار نہیں آ سکی یہی وجہ ہے کہ زندگی کے جوہر آشکار ہوئے نا ہی عشق کے! اس طرح اب تک سارا عمل ہی ادھورا رہ گیا ہے۔

132

# فرمانِ خدا

## (فرشتوں سے)

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو!
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو!
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

معنی: کاخ: محل۔ کنجشک: چڑیا۔ فرومایہ: بے حقیقت۔ بے حیثیت ناچیز۔

گزشتہ دو نظموں "لینن خدا کے حضور میں!" اور فرشتوں کا گیت میں انسانی معاشرے میں طبقاتی تضاد اور انتشار کے حوالے سے باری تعالیٰ کے روبرو جو گلے شکوے کئے گئے تھے زیرِ شرح نظم پہلی نظموں کا ایک طرح سے جواب ہے۔ جس میں خدائے تعالیٰ فرشتوں کے نام اپنا فرمان جاری کرتے ہوئے انہیں حکم دیتے ہیں کہ!

① اے فرشتو اٹھو! دنیا میں محنت کشوں اور دوسرے بے سروسامان لوگوں کے ساتھ اہلِ ثروت اور صاحبانِ اقتدار جو بدسلوکی کر رہے ہیں اس کے تدارک کے لئے اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ میری دنیا کے غریبوں میں بیداری کی لہر پیدا کر دو اور طبقہ امراء کے بلند و بالا محلات کے در و دیوار ہلا کر رکھ دو کہ اس کے بغیر انصاف ممکن نہیں!

② اس مقصد کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ جو لوگ بوجوہ دوسروں کے محکوم اور دست نگر ہیں ان کی غیرت کو اس طرح بیدار کر دو کہ ان کا لہو جوش میں آجائے اس کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ ان میں یقین و اعتماد پیدا کر دیا جائے اسی صورت میں یہ بے بس و ناچار لوگ ان سرمایہ داروں اور استعمار پرستوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو ان پر اپنا تسلط جمائے ہوئے ہیں۔

③ یہ بھی جان لو کہ اب حالات میں بڑی تیزی کے ساتھ ردوبدل ہو رہا ہے۔ بادشاہتیں اور سرمایہ دارانہ نظام ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے بدلے اب عوام کے اقتدار کا دور نزدیک آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب انہیں کے ہاتھ میں کل اختیارات ہوں گے اس لئے تم پر لازم ہے کہ ماضی کے جو بھی نقوش تمہیں نظر آئیں ان کو مٹا ڈالو تاکہ اس کے بعد ایک نئی دنیا نئے نظام کے ساتھ آباد کی جا سکے۔

④ اے فرشتو! اس امر کو بھی پیشِ نظر رکھو کہ کسانوں کو جس کھیت سے اس کی تمام تر محنت مشقت کے باوجود روزی اور معاوضہ میسر نہ ہو اور اس کی تمام پیداوار زمیندار ہڑپ کر جاتا ہو اس کے اقدام سے قبل ہی اس کھیت کے ایک ایک خوشۂ گندم کو جلا کر رکھ دو کہ اگر محنت کش کسان کو پیٹ بھرنے اور تن

ڈھانپنے کے لئے یہاں سے معاوضہ نہیں ملتا تو پھر زمیندار کو بھی لوٹ کھسوٹ کا حق حاصل نہیں۔

⑤ سوال یہ کہ میرے اور میری مخلوق کے درمیان پادریوں اور دوسرے مذہبی پیشواؤں نے جو بے جواز پردے حائل کر دیئے ہیں۔ اس کا تدارک اسی طرح سے ممکن ہے کہ ان پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کو ان عبادت گاہوں سے اٹھا کر باہر پھینک دو اور وہاں ان کی اجارہ داری کا خاتمہ کر دو۔ مراد یہ ہے کہ مذہبی پیشواؤں نے عوام میں جو اپنی دکانداری چمکا رکھی ہے کہ ان کے توسط کے بغیر مجھ تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی اس تاثر کو ختم کرنا ضروری ہے۔

⑥ میں دیکھ رہا ہوں کہ مسجدوں اور بت خانوں کی صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ دکھاوے کے لئے مسجد میں گئے اور نمائشی سجدے کر لئے یہی حال ان لوگوں کا ہے جو بت پرست ہیں کہ کبھی کبھار بتوں کی پرستش کر لی اور بس! یہ سب لوگ ہی مذہب اور عقیدے کو ایک کھیل سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اس صورت حال سے یہ کہیں زیادہ بہتر ہے کہ مساجد اور بت کدوں کو ختم کر کے رکھ دو! کہ ان اداروں میں بے راہ روی کے باعث لوگ اپنے مذہب اور عقیدوں سے بیزار ہو کر رہ گئے ہیں۔

⑦ اے فرشتو! یاد رکھو کہ عبادت گاہوں میں جو قیمتی پتھر آویزاں کئے گئے ہیں اور قیمتی اشیاء سے ان کی تزئین کی گئی ہے میں ان سے شدید طور پر بیزار اور ناخوش ہوں۔ ان سے بہتر تو یہ ہے کہ میری عبادت کے لئے تو سادہ سا مٹی کا حرم تعمیر کر دو مراد یہ ہے کہ عبادت گاہوں کی آرائش و تزئین تو بے معنی شے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں میں عشق حقیقی کی لگن پیدا کی جائے! تصنع اور ظاہرداری تو خلوص و وفا کی ازلی دشمن ہیں۔

⑧ اے فرشتو! یہ بھی سن لو کہ جدید تہذیب جو اس وقت پورے انسانی معاشرہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ شیشہ سازوں کے کارخانوں کی مانند ہے جہاں ہر طرف شیشے آویزاں ہوتے ہیں لیکن کسی شے کی معمولی ضرب سے ہی چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ ایسی ناپائیدار تہذیب کو ختم کرنا ضروری ہے کہ جس میں عدم مساوات اور اقتصادی ناہمواریاں عام ہیں۔ اس کے خاتمے کے لئے لازم ہے کہ شاعر مشرق (اقبال) کو آداب جنوں سکھا دو کہ وہ اپنے تخلیقی فن کے ذریعے عوام کو مروجہ تہذیب کی بے اعتدالیوں اور خرابیوں سے آگاہ کر سکے کہ یہی طریق کار اس تہذیب کو ختم کرنے کے لئے ناگزیر ہے اور جب تک یہ تہذیب ختم نہ ہو گی اور نیا نظام اس کی جگہ نہ لے گا۔ عالمی سطح پر امن قائم نہیں ہو سکتا اور نا ہی لوگوں کو مسرت و خوشحالی حاصل ہو سکتی ہے۔

## 133 ذوق و شوق

### (ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے)

دریغ آدم زاں ہمہ بوستاں
تہی دست رفتن سوئے دوستاں

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں!
حسن ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردہ وجود
دل کے لئے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں!
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب
کوہ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں!
گرد سے پاک ہے ہوا، برگ نخیل دھل گئے
ریگ نواح کاظمہ نرم ہے مثل پرنیاں!
آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں!
آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہل فراق کے لئے عیش دوام ہے یہی!

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مے حیات
کہنہ ہے بزم کائنات تازہ ہیں میرے واردات!
کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات!
ذکر عرب کے سوز میں فکر عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات!
قافلہ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات!
عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدہ تصورات!
صدق خلیلؑ بھی ہے عشق صبر حسینؓ بھی ہے عشق!
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!

آیہ کائنات کا معنی دیر یاب تو!
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو!
جلوتیان مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیاں میکدہ کم طلب و تہی کدو!
میں، کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!
باد صبا کی موج سے نشوونمائے خار و خس!
میرے نفس کی موج سے نشوونمائے آرزو!
خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو!
فرصت کشمکش مدہ ایں دل بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را،

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب!
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب!
شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود!
فقر جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب!
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!
تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو! عشق حضور و اضطراب!
تیرہ و تار ہے جہاں گردش آفتاب سے!
طبع زمانہ تازہ کر جلوہ بے حجاب سے!

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب!
تازہ مرے ضمیر میں معرکہ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیؐ! عقل تمام بولہب!
گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد
عشق کی ابتدا عجب! عشق کی انتہا عجب!

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق　　وصل میں مرگِ آرزو! ہجر میں لذتِ طلب!
عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا　　گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب!

گرمیٔ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہو فراق!
موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق!

"بال جبریل" میں "مسجد قرطبہ" "لینن' خدا کے حضور میں' لالہ صحرا اور ذوق و شوق' ایسی نظمیں شامل ہیں جنہوں نے اقبال کو اقبال بنایا۔ یہ نظمیں تکنیک' فکر' نئے تجربوں اور خوبصورت امیجری کے سبب اردو شاعری میں بھی شاہکار کی حیثیت سے دیکھی جائیں گی۔ "ذوق و شوق" تیس اشعار پر مشتمل ایک طویل مختصر نظم ہے جس کے بیشتر اشعار بقول اقبال فلسطین میں لکھے گئے۔ واضح رہے کہ جب دسمبر 1931ء میں اقبال عالمی مسلم کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تو کم و بیش ایک ہفتے تک بیت المقدس میں قیام کیا اور بعد میں فلسطین کے بعض دوسرے مقامات کا دورہ بھی کیا۔ عملاً یہ نظم پانچ بند پر مشتمل ہے۔

## پہلا بند

**معنی: اضم:** حجاز کا ایک پہاڑ جو مدینہ منورہ سے شمال کی جانب تقریباً ایک منزل پر واقع ہے۔ **طیلساں:** چادر۔ **کاظمہ:** یہ کظم سے ہے جس کے معنی ہیں غصے کا ٹھنڈا ہونا کاظمہ کے معنی ہوئے غصے کو ٹھنڈا کرنے والی۔ **پرنیاں:** ریشم۔ **طناب:** رسی۔

اقبال نے نظم کا آغاز شیخ سعدی کے اس شعر سے کیا ہے کہ

دریغ آدم زاں ہمہ بوستاں　　تہی دست رفتن سوئے دوستاں

یعنی

① اس شعر میں اقبال کا اشارہ فلسطین کی جانب ہے کہ اس کے صحرا میں صبح کا ایسا منظر نظر آیا جو قلب و نظر کو منور کر گیا پھر جب آفتاب طلوع ہوا اور اس کی کرنیں فضائے بسیط پر رقص کرنے لگیں تو یوں محسوس ہوا جیسے نور کی ندیاں رواں ہوں۔ اقبال کے عہد کے بیشتر شاعر فطری مناظر کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ ذریعہ اظہار بنایا کرتے تھے۔ اقبال نے بھی اسی روایت کو فکری معنویت کے حوالے سے انتہائی فنی مہارت کے ساتھ بروئے کار لانے کی سعی کی ہے۔

② نگاہوں نے جو منظر دیکھا ہے اس کے مطابق یوں لگتا ہے کہ حسن ازل ایک بار اپنے مستور حصار کو توڑ کر پھر سے بے نقاب ہو گیا ہے۔ گویا اب وہی منظر سامنے ہے جو تخلیق کائنات کے مرحلے پر دیکھنے میں آیا تھا۔ یہی وہ منظر تھا جو تخلیق آدم کا مظہر بنا۔ ایسا منظر دیکھنے سے انسان کو وہ دولت مل جاتی ہے جو اسے حیات نو سے روشناس کراتی ہے۔

③ فضا میں رات کے وقت جو بادل چھائے ہوئے تھے وہ صبح دم نیلی اور سرخ بدلیاں چھوڑ گئے اور مدینہ منورہ سے شمال کی جانب واقع کوہ اضم کو ان بدلیوں کی رنگ برنگی چادر نے ڈھانپ لیا۔

④ اس منظر میں بارش کی آمد نے ہوا کو گرد و غبار سے پاک کر دیا ہے۔ صحرا میں ایستادہ کھجور کے درختوں کی شاخیں پھواروں سے دھل کر اور زیادہ نکھر گئی ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ

اس بارش کی وجہ سے مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں پھیلی ہوئی ریت ریشم کی مانند نرم ہو گئی ہے۔

⑤ ہر چند کہ بعض شارحین نے اس شعر کی مختلف تاویلات بیان کی ہیں۔ اس کی مثال صرف ایک شرح کے حوالے سے یہاں پیش کی جائے گی جس کے مطابق ایک راہرو دوران سفر خیموں کی ٹوٹی ہوئی طنابیں اور انہی کے سامنے راکھ کے ڈھیر دیکھ کر یہ سوچتا ہے کہ نہ جانے اس مقام سے کتنے قافلے گزرے ہیں لیکن فلسطین کے پس منظر میں یہ تشریح بے جواز نظر آتی ہیں۔ اس کے قرین قیاس یہ ہے کہ اس شعر میں اقبال نے اس علاقے کی جنگوں اور معرکہ آرائیوں کے پس منظر میں ان فوجی قافلوں اور عساکر کی نشاندہی کی ہے۔ میدان مبارزت میں جاتے ہوئے جنہوں نے یہاں عارضی طور پر قیام کیا لیکن پھر افراتفری میں اس طرح روانگی اختیار کی کہ چھنے لپیٹتے ہوئے ان کی طنابوں کے ٹوٹنے کی پروا بھی نہیں کی۔ گذشتہ ایک صدی کے دوران فلسطین اور اس علاقے کے لوگوں کو جس محاذ آرائی سے واسطہ رہا وہ تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اقبال نے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔

⑥ اقبال کا کہنا ہے کہ دوران سفر اس مقام پر محض یوں لگا کہ حضرت جبریل اس امر سے مجھے مطلع کر رہے ہیں کہ میں اس علاقے کی تاریخ اور حقائق سے آگاہی کا خواں تو یہی وہ مقام ہے جس کے جائزے اور کوائف سے مجھے حقیقت احوال کا پتہ چل سکتا ہے۔

## دوسرا بند

**معنی: غزنوی:** اشارہ ہے سلطان محمود غزنوی کی طرف۔ **سومنات:** کاٹھیاواڑ کا وہ مشہور بت خانہ جس کی تسخیر کے لئے غزنوی نے بہت بڑے صحرائی علاقے کا سفر کیا جو اس کے تمام کارناموں میں سے سب سے بڑا عظیم الشان مانا جاتا ہے۔ **دجلہ و فرات:** عراق کے مشہور دریا کربلا کی جنگ دریائے فرات ہی کے کنارے ہوئی تھی۔

اقبال کے کلام کی تفہیم کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ ان کے فکری نظام کو پیش نظر رکھا جائے وہاں اس امر کا ادراک بھی ناگزیر ہے کہ ان کے طرز اسلوب میں جو ہمہ جہت کیفیات موجود ہیں ان کا احاطہ بھی کیا جا سکے۔ ان کی اکثر و بیشتر نظموں میں یہ بات بالخصوص قابل غور ہے کہ ان نظموں کی تمہید بسا اوقات کسی اور حوالے سے ہوتی ہے لیکن پھر ایک ہی جست میں وہ اپنے اصل موضوع پر آ جاتے ہیں۔ ان کے شعری کینوس میں جو وسعت ہے اس کا سبب بھی یہی طرز اظہار ہے۔ زیر تشریح نظم بھی اسی پس منظر کی آئینہ دار ہے چنانچہ اب ذرا دوسرے بند کے اشعار کی طرف آیئے!

① اقبال کہتے ہیں کہ مجھے قدرت نے ایسے دور میں تخلیق کیا ہے وہ انتہائی کہنہ عقائد کی آماجگاہ ہے اس پر ستم یہ کہ مجھے ایسے فرسودہ معاشرے میں نئے تصورات اور اجتہادی فکر کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ اب اس کا گلہ اور شکایت کس سے کی جائے کہ اس نوع کے تضادات نے میری زندگی میں زہر گھول کر رکھ دیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ عہد حال کے پس منظر میں میری سوچ اور نظر مستقبل تک رسائی حاصل کرنے کی اہل ہے جب کہ میرے گردو پیش فرسودہ اور منتشر نظریات سرگرداں نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس عہد میں آج انسان سانس لے رہا ہے وہ بے حد پرانا ہو چکا ہے جو نئے افکار کو برداشت کرنے کا اہل نہیں۔

② اس وقت صورت حال یہ ہے کہ فقیہان کرام نے حرم اور مساجد کو بھی اسی طرح اندھی تقلید اور پرستش کی آماجگاہ بنا لیا ہے جس طرح سومنات کے مندر میں بتوں کی پرستش کا دور دورہ تھا چنانچہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لئے محمود غزنوی جیسا کوئی مرد مجاہد اٹھے اور اس صورت حال کو اسی طرح تبدیل کر دے جس طرح اس نے سومنات کے مندر میں بتوں کو پاش پاش کر کے لوگوں میں وحدانیت کا تصور پیدا کیا تھا۔ مراد یہ ہے کہ کائنات میں فکری سطح پر انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ جو مروجہ فرسودہ نظام کو یکسر بدل ڈالے۔

③ بغور جائزہ لیا جائے تو عرب اور عجم دونوں کا سارا ماحول اور منظر نامہ بدل کر رہ گیا ہے۔ پہلے عربوں کو ایک آزاد اور حقیقت پسند قوم سے تعبیر کیا جاتا تھا لیکن اب ان میں تصور آزادی اور حقیقت پسندی کا فقدان ہے۔ یہی حالت اہل عجم کی ہے جو اپنی بلندی فکر اور اعلیٰ تصورات کے باعث بین الاقوامی سطح پر شہرت رکھتے تھے۔ اب تو عرب بھی اور اہل عجم بھی اپنی تمام تر خصوصیات سے محروم ہو چکے ہیں۔

④ اقبال کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کے لئے اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو گا کہ آج پورے حجازی قافلے میں ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آتا جو نواسہ رسولؐ امام حسینؓ جیسی سیرت و کردار کا مالک ہو اور ظلم و استبداد کے علاوہ آمریت کے خلاف سربکف اعلان جہاد کر سکے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ظلم و استبداد اور آمریت آج بھی اپنے عروج پر ہے لیکن اس کے خلاف رزم آرائی کے لئے ایک بھی حسینؓ جیسا مجاہد پوری ملت اسلامیہ میں موجود نہیں۔

⑤ اس کی وجہ یقیناً یہ بھی ہے کہ انسان کے قلب میں عشق حقیقی جو ولولہ پیدا کرتا ہے وہ عشق ہی اب ناپید ہے۔ کربلا میں شہادت عظمیٰ کی اساس یہی عشق حقیقی تھا جس کی بدولت حسینؓ نے نہ صرف یہ کہ اپنی جان ہار دی بلکہ اپنے عزیز و اقارب سمیت بہتر رفقاء کو میدان کربلا میں قربان کر دیا۔ یہ عشق حقیقی ہی تھا جس کی بدولت نواسہ رسولؐ نے انتہائی نامساعد حالات اور بے سروسامانی کے عالم میں ظلم و استبداد کے خلاف جہاد کر کے حیات جاوداں حاصل کی۔ دراصل عشق حقیقی ہی دل و دانش اور نگاہ کی رہنمائی کرتا ہے۔ عشق کے بغیر تو مذہب اور شریعت محض تصوراتی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

⑥ چنانچہ یہ عشق ہی تھا جس کی بدولت حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ نے سچائی اور راست بازی کا رتبہ بلند حاصل کیا۔ امام عالی مقام جناب حسینؓ نے کربلا کے میدان میں جو قربانیاں دیں اور تین روز کی بھوک و پیاس کے باوجود لشکر یزید کے خلاف علم جہاد بلند کر کے سر کٹوایا اور زندگی کے آخری مرحلے تک صبر و شکر کا مظاہرہ کیا تو یہ سارا عمل عشق حقیقی کا ہی مرہون منت تھا۔ اس کے علاوہ پیغمبر اسلام حضور سرور کائنات نے بدر و حنین کے معرکوں میں کفار کو زیر کر کے جو کامیابیاں حاصل کیں وہ بھی عشق حقیقی کے سبب کیں۔

# تیسرا بند

**معنی:** معنی دیریاب: وہ مطلب جو مشکل سے سمجھ میں آئے۔ **قافلہ ہائے بانگ و بو:** لفظی معنی رنگ و بو کے قافلے۔ **جلوتیان مدرسہ:** ظاہری علوم پڑھنے والے۔ **خلوتیان مے کدہ:** ذکر و فکر اور روحانیت میں مگن

رہنے والے۔

پچھلے اشعار کی تشریحات کے بعد یہ سمجھنے میں کسی قسم کی قباحت نہیں ہونی چاہئے کہ اقبال کے کلام کی مختلف پرتیں ہیں اور ہر پرت اپنی شناخت ساتھ لے کر آتی ہے۔ زیر تشریح نظم اپنی معنویت اور تکنیک کے اعتبار سے نسبتاً مشکل نظم ہے کہ اس کے کردار اور پھر ان سے تخاطب یہ ایسی گھمبیر فضاء تخلیق کرتے ہیں جو بعض مراحل میں قاری کے لئے الجھن کا سبب بن جاتی ہے لیکن اس طرح کے اشعار کی گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو بات سمجھنے میں کوئی خاص قباحت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے جن علامتوں اور تلازمات کا استعمال کیا ہے ان تک رسائی شرط ہے چنانچہ اس بند کے پہلے شعر کو دوسرے بند کے آخری شعر سے مربوط کئے بغیر بات نہیں بنتی۔

① اقبال یہاں فرماتے ہیں کہ خدا نے جس نے آیات نازل کی ہیں اس طرح کائنات کو بھی تخلیق کیا ہے اور اگر کائنات کو بھی ایک آیت سے تشبیہ دے لی جائے تو یہ ایک ایسی آیت ہو گی۔ جس کا مفہوم اے عشق حقیقی تو ہے کہ آسانی سے جس کی تفہیم نہیں ہو سکتی۔ ارباب ظاہر و باطن تیری جستجو میں ہیں کہ تیرے بغیر وہ اپنے مقصد میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے۔

② لیکن صورت حال یہ ہے کہ جو لوگ بظاہر تحصیل علم میں مصروف ہیں وہ بے بصیرت اور حقیقت سے ناشناس ہیں۔ ان کے دلوں میں عملاً طلب علم کا ذوق مردہ ہو چکا ہے اور جو لوگ میکدے میں براجمان ہیں وہ صرف کم ظرف ہی نہیں بلکہ خالی پیمانے پر ہی اکتفا کئے ہوئے ہیں۔ مراد یہ زندگی کے لئے عملی جدوجہد سے عاری اور تہی دست ہیں۔

③ اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ جہاں تک میری تخلیقی کاوشوں کا سوال ہے تو بس اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اشعار میں اس آتش رفتہ کا سراغ لگانے اور اس میں از سر نو حرارت پیدا کرنے کی سعی کی ہے جو عرصے سے اپنی فطری صلاحیت سے محروم ہو چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ میں تو اپنے سوئے ہوئے ماضی کی جستجو میں مصروف ہوں۔ وہ ماضی جو درخشندہ اور تابناک تھا۔

④ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ جس طرح باد صبا کی حیات بخش لہریں گھاس پھوس کو تازگی سے ہم کنار کر کے اس کی نشوونما کا سبب بنتی ہیں۔ اسی طرح میرا آدرش اور پیغام لوگوں کے دلوں میں عملی جدوجہد اور کچھ کرنے کی لگن پیدا کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ میرے اشعار پڑھنے والوں میں یقین اور اعتماد کو جنم دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ عشق الٰہی سے روشناس کرا کے روح کو تازگی بخشتے ہیں۔

⑤ دیکھا جائے تو میں جو اشعار تخلیق کرتا ہوں ان میں میرے قلب و جگر کا لہو شامل ہوتا ہے۔ مولانا حالی نے بھی اس مضمون کو اپنی غزل کے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے کہ

خشک سیروں تن شاعر میں لہو ہوتا ہے
پھر نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

ظاہر ہے کہ اقبال کے مقابلے پر مولانا حالی کا یہ شعر حد سے زیادہ مبالغہ آمیز ہے۔ بہرحال اس کا تذکرہ تو سر راہے آ گیا۔ اقبال نے جس لطیف انداز میں اپنی بات کہی ہے وہ انتہائی قابل تعریف ہے۔

فرماتے ہیں کہ اس شعر کے پہلے مصرعہ کا جواب دوسرے مصرعہ کے مضمون سے ملتا ہے کہ ساز سے جو نغمہ برآمد ہوتا ہے اس میں ساز بجانے والے شخص کی تخلیقی کاوش کا بھی دخل ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ

تخلیق ابج کے بغیر کوئی تخلیق نہ وجود میں آتی ہے نا ہی تکمیل پاتی ہے۔
⑥ اس شعر میں عشق حبیب سے خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ تو نے میرے قلب و روح کو جس ولولے اور تڑپ سے روشناس کیا ہے اس میں مزید اضافہ درکار ہے۔ یہ اضطراب جس قدر زیادہ ہو قلب و روح کو تڑپانے کے ساتھ جلا بھی بخشتا ہے۔ ولولے اور تڑپ میں اضافہ اور اس کی تشکیل بالکل اسی طرح ہے جس طرح سے محبوب کی تابدار زلفوں کی شکنوں میں اضافے کا مطالبہ! کہ ان میں دل الجھ کر رہ جائے۔

# چوتھا بند

**معنی: سلیم**: عثمانی خاندان کا مشہور تاجدار جس نے مصر کو فتح کیا۔ اور جس کے عہد میں عثمانی ترکوں کو خلافت کا منصب نیز حرمین شریفین کی خدمت ملی۔ **جنید**: مشہور ولی اللہ حضرت جنید بغدادیؒ۔ **بایزید**: مشہور ولی اللہ بایزید بسطامیؒ۔ **غیاب**: غائب ہونا۔ **لوح و قلم**: لوح کے لفظی معنی تختی۔ **الکتاب**: قرآن مجید۔ **آبگینہ رنگ**: شیشے جیسا۔ **محیط**: لفظی معنی احاطہ کرنے والا۔ نیز سمندر۔ **سنجر**: سلجوقی خاندان کے مشہور بادشاہ کا نام۔

نظم کے اس بند میں جو چھ اشعار ہیں ان کا مطالعہ کسی حد تک تذبذب کو جنم دیتا ہے کہ شاعر نے عملاً یہ بات واضح نہیں کی کہ ان اشعار کا مخاطب کون ہے۔ تذبذب اور شکست و شبہ کی فضا نے اس لئے جنم لیا کہ بظاہر یہ اشعار باری تعالیٰ سے بھی منسوب کئے جا سکتے ہیں اور پیغمبر آخر الزماں حضور سرور کائناتؐ سے بھی! یہی وجہ ہے کہ بعض شارحین کے نزدیک ان اشعار کے مخاطب حضورؐ ہیں تاہم اگر سارے بند کا احتیاط اور گہرائی سے جائزہ لیا جائے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے چھٹے اور آخری شعر کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ معمہ حل ہو جاتا ہے۔ یہ شعر اس طرح سے ہے

تیرہ و تار ہے جہاں گردش آفتاب سے
طبع زمانہ تازہ کر جلوہ بے حجاب سے

اس شعر کے آخری مصرعے میں اقبال نے جو بات کہی ہے کھل کر کہی ہے اور ان کا مخاطب باری تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس بند کے تمام اشعار ایک وجود کے گرد ہی گھومتے ہیں اور ان میں ایک واضح تسلسل ہے اس لئے اس توجیہ کی ضرورت پیش آئی۔

① اقبال باری تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو ہی لوح و قلم کا مالک ہے اور تیرے وجود کا مظہر قرآن ہے۔ یہاں لوح و قلم کی تراکیب کے حوالے سے رب ذوالجلال کو انسانی تقدیر کا خالق قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ باری تعالیٰ یہ جو رنگ برنگا اور شفاف آسمان ہے یہ تو تیرے دائرہ کار میں ایک معمولی بلبلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کنایہ ہے کہ تو قادر مطلق ہے اور ہر شے تیرے وجود کے بالمقابل ذرے کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

② اے مولائے کل! ہر چند کہ تو نے اب تک انسانی نظروں سے اپنے وجود کو پوشیدہ رکھا ہے لیکن تیرے جلوے کی علامتیں طلوع آفتاب کی شکل میں سامنے آئی جس کی تابندگی نے ریت کے معمولی ذروں کو بھی منور کر دیا۔ اسی نوع کی علامتیں پوری کائنات میں روشنی اور ارتقاء کا سبب ہیں۔

③ اے باری تعالیٰ! سلجوقی خاندان کا جلیل القدر حکمران سنجر اور خاندان عثمانیہ کے مشہور تاجدار سلیم میں جراءت، حوصلے اور پختہ عزم و ارادہ کی جو خصوصیات موجود تھیں ان کو اگر تیری شان جلال کا مظہر کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اسی طرح تیری شان جمال حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامی جیسے مقبول بارگاہ اولیا میں دیکھی جا سکتی ہے۔

④ اگر تیرا عشق میرے سجدہ و نماز کا مقصود و مطلوب نہ ہو تیرا دوران نماز میرا قیام بھی بے معنی ہو جاتا ہے اور سجدے میں بھی کوئی کیفیت باقی نہیں رہتی مراد یہ کہ عشق حقیقی کے بغیر نماز اور سجدہ محض نمائشی حیثیت کا حامل ہے۔

⑤ اگر تیرا کرم ہو تو عقل و دانش اور جذبہ عشق دونوں ہی اپنی مراد پا جاتے ہیں۔ دانش و عقل جو تلاش و جستجو میں لگی رہتی ہے اور جذبہ عشق جو حضوری کا خواہش مند رہتا ہے یہی خواہش اسے مضطرب اور بے قرار رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جن میں عقل و دانش نمایاں تھی اور وہ لوگ بھی جو جذبہ عشق سے سرشار تھے بالآخر دونوں ہی تیری عنایات سے مستفید ہونے میں کامیاب و کامران ہو گئے۔

⑥ اے مولا! اب صورت حال یہ ہے کہ سورج کی گردش جاری رہنے کے بعد بھی ساری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے لہٰذا یہ خواہش اب ناگزیر ہو گئی ہے کہ پردے سے باہر آ کر اپنا جلوہ دکھا تاکہ ساری دنیا اس سے منور اور تر و تازہ ہو جائے۔

مراد یہ ہے کہ تیری عنایات کے باوجود آج بھی لوگوں کے دل تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ برائیاں ہر سو فروغ پا رہی ہیں اور نیکی کی طاقتیں کمزور پڑتی جا رہی ہیں ایسے میں ضروری ہے کہ تو اپنا جلوہ دکھا کر انسان کے سینوں کو اس کی روشنی سے منور کر دے۔

## پانچواں بند

**معنی: نخیل بے رطب:** کھجور کا وہ درخت جو پھل نہ دے۔

یہ چھ اشعار بھی ایک طرح سے موضوعی سطح پر پچھلے بند کا تسلسل ہیں۔ یہ بند عملاً زیر تشریح نظم کا خوبصورت اختتامیہ ہے جس میں اقبال اپنی فکر اور کمال فن کے ساتھ انتہائی بلندی پر نظر آتے ہیں اور قدرے خود احتسابی کے ساتھ اپنے تازہ شعور و ادراک کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ وہ بدستور باری تعالیٰ سے یوں مخاطبت کرتے ہیں کہ۔

① میں جانتا ہوں کہ میرا ماضی اور عمل تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے جہاں تک میرے کردار کا تعلق ہے میں تو اس حقیقت سے بھی بے خبر رہا کہ علم ایک شجر بے ثمر کے مانند ہے اور میں تھا کہ کم و بیش ساری عمر ہی حصول علم میں گزار دی۔ اس طرح ایک ایسے سائے کے عقب میں دوڑتا رہا جس میں جذبہ عشق کا فقدان تھا۔

② لیکن اب جو اپنے اسلاف کی زندگی بھر کا جائزہ لیا تو مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ عشق حقیقی کی مظہر تو ذات محمد مصطفیٰ ہے اور اس کے مقابلے میں جو عقل و دانش ہے وہ کار بو الہبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ عقل و خرد تو ہوس خام کا دوسرا نام ہے۔ اگر زندگی کا حقیقی مقصود پانا ہے اور کچھ حاصل کرنا ہے تو

اس کا منبع ذات محمد مصطفیٰؐ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

③ اے باری تعالیٰ! اب مجھ پر یہ راز آشکار ہو سکا ہے کہ عشق کی ابتداء اور اس کی انتہا دونوں عجیب و غریب ہیں۔ کبھی تو یہ ایسی تدبیروں سے کام لیتا ہے جو فرد کو منزل مراد تک پہنچانے میں مدد دیتی ہیں اور کبھی بزور قوت اس کی توجہ اپنی جانب منعطف کراتا ہے جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے موخرالذکر صورت حال سے واسطہ پڑا۔ یوں عشق نے مجھے عقل و دانش کے دام سے چھڑا کر ایک مثبت کیفیت سے آشنا کر دیا ورنہ میرے مشاغل تو قطعی اس کے برعکس تھے۔

④ عشق حقیقی نے یہ بھید بھی آشکار کر دیا کہ اس عمل میں ہجر اور جدائی کو وصل حبیب پر فوقیت حاصل ہے۔ وصل میں تو انسان اپنی خواہش اور آرزو کی تکمیل سے آسودہ ہو جاتا ہے لیکن ہجر میں محبوب کی طلب اور اس سے پیدا ہونے والی تڑپ برقرار رہتی ہے اور یہی تڑپ عاشق کے لئے زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ بن جاتی ہے۔

⑤ یہ میری بدبختی ہی تو ہے کہ جب محبوب کے وصل کا مرحلہ آیا تو مجھے اس کی جانب ایک نگاہ ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی حالانکہ میری شوخ نگاہیں عرصے سے دیدار محبوب کی متلاشی تھیں یوں وصل کی خواہش اور عمل بھی ادھورا رہا۔

⑥ سو اس ساری بحث کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ عشق حقیقی میں ہجر و فراق کی کیفیت ہی سب سے اہم شے ہے۔ آرزو اور خواہش اسی کیفیت میں برقرار رہتی ہیں اور تمام نالہ و فریاد بھی اسی کے دم سے زندہ ہیں۔ اس کی مثال سمندر میں موج کی سی ہے جو اس سے علیحدگی کے لئے مضطرب اور بے قرار رہتی ہے۔ اسی کے سبب سمندر میں تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ دور کیوں جائیں ایک قطرہ آب کو ہی لیجئے جو پانی میں مل کر اپنی ہستی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اس کی آبرو تو اسی لمحے تک قائم رہتی ہے جب تک وہ سمندر سے علیحدہ رہ کر اپنے وجود کو برقرار رکھتا ہے۔

مراد یہ کہ اپنی انفرادیت برقرار رکھ کر فرد اپنی شناخت کرا سکتا ہے اور یہی انفرادیت اس کو منزل کا پتہ دیتی ہے۔

134

# پروانہ اور جگنو

## پروانہ

پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

## جگنو

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں میں

معنی: دریوزہ گر: بھکاری۔

یہ مختصر سی نظم محض دو اشعار پر مشتمل ہے۔ بنیادی طور پر اقبال نے مکالمہ کی صورت میں دو ایسے ننھے ننھے پرندوں کی فطرت اور کردار کا حکیمانہ انداز میں تجزیہ کیا۔ اس میں ایک مکالمہ پروانے کا ہے اور دوسرا جگنو کا! دلچسپ بات یہ کہ محض ایک ایک شعر میں انہوں نے ان کرداروں کی تجزیہ نگاری کرتے ہوئے دو بڑے موضوعات کو محض دو اشعار میں سمو دیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کا ایک بڑے شاعر کی قادر الکلامی اور حکیمانہ روش کا اندازہ ہوتا ہے۔

## پروانہ

① اقبال یہاں اپنی تخیلی قوت کے حوالے سے پروانے اور جگنو کو ایک ہی مقام پر لے آتے ہیں۔ اس شعر میں جگنو کو مخاطب کرتے ہوئے پروانہ یوں گویا ہوتا ہے کہ میری فطرت تو شمع کی روشنی پر قربان ہو کر مرمٹنے کی ہے جب کہ تجھ میں قطعی طور پر ایسی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ تیرے پروں سے تو ایسی آگ برآمد ہوتی ہے جس میں حدت اور حرارت بھی نہیں ہوتی اس اعتبار سے تیرا وجود محض ایک بیکار جنس کے سوا اور کچھ نہیں!

## جگنو

② اس مکالے اور الزام تراشی پر کسی قسم کی برہمی کا اظہار کیے بغیر جگنو، پروانہ سے مخاطب ہو کر یوں جواب دیتا ہے کہ تو محض روشنی پر جل مرنے کے عمل پر نازاں ہے۔ اسی باعث میں پروردگار کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے تجھ جیسا نہیں بنایا۔ میں تو خود اپنی روشنی سے فضا کو منور کرتا ہوں اور تیری طرح دوسروں کی روشنی پر مرمٹنے کا قائل نہیں۔ مراد یہ ہے کہ ہر جاندار کی بنیادی خصوصیت اس کا ذاتی جوہر ہی ہوتا ہے۔

## 135 جاوید کے نام

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ!
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ!
یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحب مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ!
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ!
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ!
ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ!

ہر چند کہ یہ نظم جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے علامہ اقبال نے اپنے فرزند ارجمند جاوید اقبال کے لئے تخلیق کی اس میں کچھ نصیحتیں بھی ہیں۔ دانشمندانہ مشورے بھی اور دعائیں بھی ہیں۔ اپنے کینوس کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ نظم محض جاوید تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے مخاطب پوری ملت کے نوجوان

ہیں۔

① اس شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ اے فرزند عزیز! اس حقیقت کو پوری طرح ذہن نشین کر لے کہ خودی ہی ایسا جذبہ ہے جس کو اپنانے سے فرد کو حیات جاودانی نصیب ہو سکتی ہے اور وہ اپنے عمل سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ یہ جذبہ خودی ہی ہے جو افراد اور قوموں کے لئے عروج و ارتقاء کی منزل فراہم کرتی ہے۔

② یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی مقصد لے کر آتا ہے۔ یہی مقصد اسے ارتقاء کی منزل سے ہم آہنگ بھی کرتا ہے اور اطمینان قلب بھی بخشتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ظاہری نمود و نمائش کوئی شے نہیں۔ اصل مسئلہ وہ زندگی ہے جو بامقصد ہو۔ یہی جذبہ فرد کو عملی جدوجہد کا حامل بناتا ہے۔

③ اب ذرا ایک پرندے کوے کی جانب دیکھو کہ وہ ادھر ادھر منہ مار کر بڑی عیاری اور چالاکی سے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دوسروں کا مال تو ہڑپ کر جاتا ہے لیکن خود اپنی جدوجہد کے ذریعے کبھی بھی روزی حاصل کرنے کے قابل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بلند پروازی مفقود ہے۔ یہ بھی جان لو کہ اگر کسی بلند پرواز شاہیں کا بچہ کوے کی صحبت میں رہے گا۔ تو وہ اپنی فطری صلاحیتوں سے محروم ہو کر اس کی سی عادتیں اختیار کر لے گا۔ مراد یہ ہے کہ صحبت بد سے گریز کرو کہ یہ انسان کے اپنے کردار کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے۔

④ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ پورے معاشرے پر نظر ڈالیں تو اس امر کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے کہ انسانوں میں غیرت و حیا کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔ کسی بھی برائی کو قبول کرتے ہوئے ان کو کسی طرح کی پشیمانی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ سواے بیٹے! اس صورت حال کے پیش نظر میں خدائے عز و جل سے یہی دعا کرتا ہوں کہ تجھ میں غیرت و حیا کا جذبہ برقرار رہے اور تیرا شباب ہمیشہ داغ دار ہونے سے بچا رہے۔

⑤ آخری شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ جہاں تک میری زندگی اور کردار کا تعلق ہے اس امر سے واضح ہو جائے گا کہ میں ایک خوش طبع، خوش اخلاق اور خوش ہونے کے سبب ان خانقاہوں کے قریب تک نہ پھٹک سکا جو تنگ ظرف، خشک طبع اور مفسد ملاؤں کی کمین گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ نوجوانوں کو جہاں رند مشرب لوگوں کی صحبتوں سے گریز کرنا چاہئے وہاں متذکرہ قسم کی خانقاہوں سے احتراز بھی لازم ہے کہ ہر دو مقامات کا ماحول غیرت و حیا سے عاری ہو چکا ہے اور نوجوان نسل کے لئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

## گدائی

136

میکدے میں ایک دن اک رند زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا!
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے؟
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا؟
اس کے آب لالہ گوں کی خون دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا

اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی دینے والا کون ہے؟ مرد غریب و بے نوا!
مانگنے والا گدا ہے! صدقہ مانگے یا خراج کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا!
(ماخوذ از انوری)

اقبال کے بقول یہ نظم مصنوعی سطح پر فارسی زبان کے ممتاز اور قادر الکلام شاعر "انوری" کی نظم سے ماخوذ ہے لیکن اقبال نے جس انداز میں اپنے اشعار میں اس موضوع کا احاطہ کیا ہے وہ دیکھا جائے تو عملاً ان کے کمال فن کی دلیل ہے۔ نظم کے اشعار پر ان کی گرفت اس قدر مستحکم ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

① ایک رند شراب خانے میں ایک مے نوش سے جس کی گفتگو دانائی پر مبنی تھی۔ یوں گویا ہوا کہ ہمارے شہر کا حاکم عملاً ایک بھک منگے سے کم نہیں۔ ظاہر ہے کہ دوسرے بھک منگوں کی طرح اس میں بھی حیا اور غیرت کا کلی طور پر فقدان ہے۔

② اپنے دعوے کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے استدلال کیا کہ دیکھنا یہ ہے کہ کتنے لوگوں کی دستار چھین کر اس نے اپنے سر کا تاج بنوایا ہے اور کتنے لوگوں کو بے لباس کر کے اس کے جسم کے لئے قبائے زریں تیار ہوئی ہے۔

③ کسانوں کی خون پسینے کی کمائی سے خراج اور ٹیکس کے نام سے وصول کر کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے شراب کے جام لنڈھاتا ہے اور غریب کسانوں کے کھیت کی مٹی اس کے لئے کیمیا ثابت ہو رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ حاکم شہر اپنے مفادات اور عیش پرستی کے لئے محنت کشوں کا استحصال کرتا ہے یعنی خود محنت سے جی چرا کر دوسروں کی محنت کی کمائی کو حلال سمجھتا ہے۔

④ صورت حال یہ ہے کہ اس کے دولت کدے میں جو چیز بھی موجود ہے وہ چھینی ہوئی یا مانگی ہوئی ہے۔ اور جن لوگوں سے یہ اشیاء حاصل کی گئی ہیں وہ غریب اور مفلس لوگ ہیں جو شب و روز خون پسینہ بہا کر اپنی روزی اور دوسری ضروریات زندگی فراہم کرتے ہیں۔ لیکن حاکم شہر ہے کہ بڑی ڈھٹائی اور بے غیرتی کے ساتھ پیداواری اشیاء کا بیشتر حصہ مفت میں ہڑپ کر جاتا ہے۔

⑤ دراصل حقیقت یہ ہے کہ ساری صورت احوال کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خواہ کوئی صدقہ یا بھیک مانگے یا پھر خراج طلب کرے وہ اور کچھ نہیں عملاً بھکاری اور فقیر ہے اور اس حقیقت کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے بات یہی ہے کہ فقیر ہو یا بادشاہ عملاً وہ بھکاری اور گداگر ہی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں! ان سب کی زندگیاں بھیک پر ہی گزر رہی ہیں۔

اقبال نے جس حکیمانہ انداز میں گداگری کے مسئلے کا تجزیہ کیا ہے وہ معاشرے کے لئے دیکھا جائے تو درس عبرت ہے۔ تاہم وہ لوگ جس سارے قضیے کے ذمہ دار ہیں وہ اس قدر بے حیا اور غیرت سے عاری ہیں کہ ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

## 137 ملا اور بہشت

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبط سخن کر نہ سکا حق سے جب حضرت ملا کو ملا حکم بہشت!

عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لب کشت!
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال!
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت!
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت!

**معنی: جدل:** لڑائی۔ اختلاف۔ **قول و اقوال:** لفظی معنی اس نے کہا اور میں کہتا ہوں اس سے بھی میرا جھگڑا اور بحث ہے۔ **سرشت:** فطرت۔ خصلت۔ **بد آموزی:** بری تعلیم دینا۔ **ملل:** ملت کی جمع۔ قومیں۔ **کنشت:** بت خانہ یا غیر مسلموں کی عبادت گاہ۔

غالباً گذشتہ صفحات میں کسی مقام پر اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ "مسجد قرطبہ' لینن۔ خدا کے حضور میں' لالہ صحرا اور ذوق و شوق کے علاوہ "ملا اور بہشت! اقبال کی ان شاہکار نظموں میں سے ہیں جن کی بدولت اقبال کو ایک بڑا شاعر مانا اور جانا جاتا ہے۔ اس مختصر سی زیر تشریح نظم میں تو ان کا فن اوج کمال پر ہے۔ ملاحظہ کیجئے!

① ایک عرصے سے ملاؤں نے کج بحثی' منافقت اور تفرقہ پردازی کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اسی کے سبب بے شمار لوگوں خصوصیت کے ساتھ نوجوان نسل میں دین و مذہب کے ساتھ وہ لگاؤ نہیں کہ جو ہونا چاہئے۔ اقبال عمر بھر اپنے افکار کے ذریعے ملاؤں کے اس کردار کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ یہاں انہوں نے ملاؤں کے کردار کو جس خوبصورت انداز میں پینٹ کیا ہے وہ انتہائی لائق ستائش ہے۔ چنانچہ اس شعر میں وہ آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ اس وقت ملا کو بہشت میں بھیجنے کے لئے باری تعالیٰ نے حکم جاری کیا تو اتفاق سے میں بھی وہیں موجود تھا۔ چنانچہ ملا کی پذیرائی کے اس عمل کو دیکھ کر میری قوت برداشت جواب دے گئی۔

② چنانچہ حق تعالیٰ سے میں نے گذارش کی کہ اگر میری تقصیر معاف کر دے تو تجھ سے یہ استفسار کرنے کی جسارت کروں کہ تو جو اسے بہشت میں بھیج رہا ہے تو یہ بھی سوچا کہ اس جیسے شخص کو وہاں کی حوریں' شراب طہورہ اور سبزہ و گل کیسے راس آئیں گے اور یہ چیزیں کیسے اس کے اطمینان قلب کا باعث ہو سکیں گی کہ وہ تو اپنی فطرت کے لحاظ سے لڑائی جھگڑے کا قائل رہا ہے۔

③ اس شعر میں بھی کم و بیش انہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو اس سے پہلے کے شعر میں موجود ہیں یعنی کہ کج بحثی اور لڑائی جھگڑا تو تیرے اس بندے کی سرشت میں شامل ہے جب کہ بہشت میں اس جیسے مشغلوں کی گنجائش کہاں ہے۔

④ قوموں اور ملتوں کو غلط راہ پر لگانا اور مختلف حیلے بہانوں سے ان میں پھوٹ ڈالنا تو ہمیشہ اس کی سرخوشی کا باعث ہوتا ہے جب کہ جنت میں تو نہ مسجدیں ہوں گی نہ گرجے اور نا ہی دوسری عبادت گاہیں! جن کو یہ شخص جھگڑے کی بنیاد بناتا ہے۔ اقبال نے یہی موضوع اپنے بے شمار اشعار میں چھیڑا ہے۔ وہ بوجوہ ملا سے اکثر و بیشتر بدظن نظر آتے ہیں کہ ان کے نزدیک ملا کا کردار بس یہ ہے کہ

دین ملا فی سبیل اللہ فساد

# دین و سیاست

138

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی سماتی کہاں اس فقیری میں میری!
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری!
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری!

**معنی:** **رہبانیت:** ترک دنیا۔ **خصومت:** دشمنی۔ **سربزیری:** لفظی معنی سر نیچے رکھنا۔ سرنگونی۔ **نابصیری:** اندھا پن۔ کوری۔ **صحرانشین:** لفظی معنی۔ بیابان کا رہنے والا۔ **بشیری:** بشارت دینا یعنی لوگوں کو راہ حق پر چلا کر اس کے ثواب کی خوشخبری سنانا۔ **نذیری:** لفظی معنی ڈرانا۔ **جنیدی:** حضرت جنیدؒ بغدادی کی صفت مراد ہے دین داری ہے۔ **اردشیری:** اردشیر ایران کا مشہور بادشاہ تھا۔ یہاں اس سے مراد شہنشاہی ہے۔ یعنی سیاست۔

① علامہ اقبال نے اس نظم میں یہ وضاحت کی ہے کہ اسلام نے سیاست اور دین کو مربوط کیا ہے جب کہ عیسائیت مذہب اور سیاست کے مابین جو ربط ہونا چاہئے اس کو ختم کر دیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ خامی تھی کہ کلیسا نے اپنے عقائد کی بنیاد ترک دنیا پر رکھی۔ مقصود یہ تھا کہ دنیاداری اور اس کے جملہ معاملات کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھا جائے۔ اس صورت حال میں دین اور سیاست کی یکجائی کے امکانات کا عمل دخل کس طرح سے ہو سکتا تھا؟

② بادشاہی اور رہبانیت کے مابین تو ازل ہی سے شدید اختلافات چلے آ رہے ہیں اس لئے کہ حاکمیت کا تصور تو انسان کی بلند مرتبت کا حامل ہے جب کہ ترک دنیا کا معاملہ انسان کو پستی کی طرف دیکھنے والا اور غیر فطری ہے۔

③ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب مذہب سے سیاست نے اپنا پیچھا چھڑا لیا اور یوں دونوں کے مابین جو رابطہ تھا ختم ہو گیا اس کے باوجود پادریوں کی اجارہ داری بھی ایک طرح سے ختم ہو کر رہ گئی۔

④ کہنا یہ ہے کہ جب دین و سیاست کے مابین جو رشتہ تھا وہ ٹوٹ گیا تو سربراہ مملکت اور ان کے وزیر مشیر بے شک برسر اقتدار تو رہے تاہم محض حرص و ہوس کے بندے بن کر رہ گئے۔ اس لئے کہ اخلاقی اقدار کا تصور ہی ختم ہو گیا تو بات آگے کیسے چلتی۔

⑤ دین اور سیاست کے ایک دوسرے سے علیحدگی کے باعث ان پر نا آسودگی نے ڈیرہ ڈال لیا۔ اور اس دورخ اور متضاد رویے کے سبب تہذیب اور کلچر بے بصر ہو کر رہ گئے۔ اور دونوں میں نیکی اور بدی کا تصور بے معنی ہو کر رہ گیا۔ پھر معاملے یہاں اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ سارا نظام معاشرت درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔

⑥ متذکرہ انتشار کا یہ ردعمل تھا کہ پیغمبر انقلاب حضور سرور کائناتؐ نے مبعوث ہونے کے ساتھ جہاں دعوت اسلام دی اور وہاں معاشرے میں بھی انقلابی تبدیلیاں لانے کے لئے دین اور سیاست کو یکجا

کر دیا اور دینی احکام کو ہی حکمرانی کا منشور قرار دیا۔ اس کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ حاکم وقت پر بھی لازم ہے کہ وہ فرمان الٰہی کی ہر قیمت پر تعمیل کرے اور دوسروں کو بھی ان کی مکمل اطاعت پر آمادہ کرے۔ اس کا منطقی نتیجہ اس صورت میں نمودار ہوا کہ حاکم اور عام لوگ فطری طور پر ایک احتسابی عمل کے زیر اہتمام زندگی بسر کرنے لگے اور یوں خود بخود برائی سے دور ہوتے چلے گئے۔

⑦ حضورؐ نے احکام خداوندی کی روشنی میں یہ بات واضح کر دی کہ دین اور سیاست کو یکجا کیے بغیر انسانی معاشرے اور انسانیت کا تحفظ ممکن نہیں۔ کسی بھی معاشرے بالخصوص اسلامی معاشرے میں یہ امر ناگزیر ہے کہ ہر دو بنیادی معاملات کے مابین ربط رہے۔ اسی صورت میں انقلاب کی تکمیل ممکن ہے۔

## الارض للہ

139

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار؟ خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نور آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

**معنی:** دہ خدا: گاؤں کا مالک زمیندار۔ آبا: اب کی جمع۔ باپ دادا۔

① چار اشعار پر مشتمل اس نظم کا بنیادی موضوع زمین کی ملکیت کا مسئلہ ہے۔ احکام قرآنی اور تعلیمات اسلامی کے حوالے سے اقبال یہاں کہتے ہیں کہ زمین کا مالک زمیندار اور جاگیردار نہیں بلکہ خدائے ذوالجلال ہے۔ اور جو کاشتکار اپنی اپنی محنت سے اس کی آبیاری کر کے فصل اگاتا ہے وہ اگر کسی کے سامنے جوابدہ ہے تو وہ محض ذات خداوندی ہے۔ لہٰذا زمیندار اور جاگیرداروں کو جنہوں نے تمام زمینوں پر اپنی اجارہ داری کر کے مزارعین اور کاشتکاروں کو اپنا غلام بنایا ہے اور ان لوگوں کی خون پسینے کی کمائی سے ہی اپنی تجوریاں بھرتے ہیں اور پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سو اقبال زمینداروں اور جاگیرداروں سے استفسار کرتے ہیں کہ براہ کرم اتنا تو بتا دو! کہ وہ کون ہے جو زمین پر ہل چلا کر وہاں فصل اگانے کے لیے بیج ڈالتا ہے اور اس عمل کے لیے کس نے اسے اتنی صلاحیت عطا کی ہے پھر اس بیج کی پرورش کون کرتا ہے اور وہ کون ہے جو دریاؤں اور سمندروں کی موجوں سے پانی کشید کر کے بادلوں میں محفوظ کرتا ہے اور پھر ان محفوظ ذخائر آگتی ہوئی فصلوں کو تازگی اور نشو و نما کے مراحل سے گزارتا ہے۔

② اس سوال کا جواب بھی دے کہ انہی فصلوں کی پرداخت کے لیے پچھم سے جو ہوائیں آتی ہیں وہ کس کے حکم سے آتی ہیں۔ یہ زمین کس کی ہے؟ اور سورج جو روشنی فراہم کرتا ہے کس کے حکم سے کرتا ہے۔

③ وہ کون سی قوت ہے وہ، قی "فوقتاً" موسموں میں بھی تبدیلی لاتی ہے اور گندم کی فصل پکنے پر اس کے سنہری خوشے موتیوں جیسے دانوں سے بھر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کوئی نہیں!

④ اے زمینوں پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے والے شخص! یہ حقیقت تجھ پر واضح کرنی ضروری ہے کہ یہ زمین نہ تیری ہے نا تیرے آباءواجداد اس کے مالک ہیں۔ نہ میری ہے بلکہ اس زمین کا مالک حقیقی تو وہ رب ذوالجلال ہے جس نے ہم سب کو اور پوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔

## 140 ایک نوجوان کے نام

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی؟
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل؟
نہ زور حیدریؓ تجھ میں نہ استغنائے سلمانی!
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں!
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی!
عقابی روح جب بیداری ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں!
نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے رازدانوں میں!
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے! بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر!

**معنی: استغنائے سلیمانیؓ:** استغنا کے لفظی معنی ہیں بے نیازی، دل کی سیری، ہر قسم کا احتیاج سے بے پروائی سلیمانؓ سے مراد حضرت سلیمان فارسی ہیں۔ **علم و عرفان:** عام لفظ ہیں لیکن یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جو دماغی جوہروں کو جلا دیتا ہے۔ عرفان سے مراد کیفیت ہے جو تزکیۂ قلوب اور حقائق شناسی کا ذریعہ ہے۔

ہرچند کہ یہ نظم اپنے عنوان کے اعتبار سے ایک نوجوان کے نام ہے لیکن عملاً یہاں اقبال نے ملت اسلامیہ کے تمام نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے نصیحت کی ہے کہ تمہیں تن آسانی زیب نہیں دیتی بلکہ جفاکش ہونا چاہئے اور ضروری ہے کہ حیدر کرارؓ کی سی قوت و جراءت اور سلمان فارسی جیسا استغنا اپنے آپ میں پیدا کرو۔ یہی عوامل دنیا میں کامیابی و کامرانی کی دلیل ہیں۔ چنانچہ وہ نظم کا آغاز اس طرح کرتے ہیں۔

① اے نوجوان! ہرچند کہ تیرے ایوان راحت میں عیش و عشرت کے تمام لوازمات یکجا نظر آتے ہیں۔ اس کا اندازہ یوں ہوتا ہے کہ تیرے جو صوفے بچھے ہوئے ہیں وہ مغربی طرز کے ہیں اور کمروں کو ایرانی قالینوں سے مزین کر رکھا ہے بے شک تیرے پاس دولت ہے اور دولت کی نمائش کا حق بھی تجھے حاصل ہے لیکن ان نمائشی اشیاء کی موجودگی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تجھے آرام پسندی اور عیش و عشرت کے سوا اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں اور یہی وہ المیہ ہے جو مجھے خون کے آنسو رلاتا ہے۔

② دوسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اے نوجوان! یہ دولت تو الگ رہی اگر تجھے کسی ملک کی بادشاہت بھی مل جائے تو اس سے اس وقت تک کچھ حاصل نہ ہو گا کہ اس کو مضبوط و مستحکم رکھنے کے لئے تجھ میں شیر خدا حیدر کرارؓ جیسی قوت اور جراءت و ہمت کے علاوہ حضرت سلمان فارسی جیسا استغناء موجود نہ ہو یعنی تو مذکورہ علائق دنیوی سے بے نیاز نہ ہو جائے۔

③ اور اس نوع کی بے نیازی عہد حاضر کی جو تہذیب ہے اس کی مصنوعی چکاچوند میں ملنا مشکل ہی نہیں

بلکہ ناممکنات سے ہے کہ اس تہذیب نے حرص و ہوس ایسی لعنتیں انسان پر مسلط کر دی ہیں جن سے چھٹکارا اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات پر عمل کرے۔ انہی تعلیمات کے ذریعے مسلمان عروج و ارتقاء کی منازل طے کرنے کے اہل بن سکتے ہیں۔

④ اے میرے عزیز! تجھے اس حقیقت کا مکمل ادراک ہونا چاہیئے کہ جب نوجوانوں میں بلند ہمتی اور ارادوں میں استحکام کے جوہر پیدا ہوتے ہیں تو وہ اپنی منزل مقصود کی معراج کو چھو لیتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمت و حوصلے کے بغیر منزل تک رسائی ممکن نہیں۔

⑤ بے شک حالات کتنے ہی ناگفتہ بہ ہوں اور فضا کتنی ہی ناسازگار ہو اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے کہ اس نوع کی مایوسی اور ناامیدی اس وقت جنم لیتی ہیں جب فرد میں علم و عرفان کے جوہر زائل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی ذات کی شناخت کے عمل اور معرفت خداوندی سے محروم ہو جاتا ہے۔ امید پر ہی دنیا قائم ہے۔ انسان کے لئے لازم ہے کہ منزل کو پالینے کے لئے عملی جدوجہد کرتا رہے اور اس کا نتیجہ کیا حاصل ہو گا۔ یہ سب خدا پر چھوڑ دے۔ مومن کی حقیقی شان اور اس کا کردار ہی یہی ہے۔

⑥ اے نوجوان! اس ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ جس طرح شاہیں کسی ایسے مقام پر نہیں ٹھہرتا جہاں محض مصنوعی آرام و آرائش ہو بلکہ وہ تو پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانوں میں جا کر بسیرا کرتا ہے تو بھی شاہیں کے مانند ہے۔ جس کی عملی زندگی آرام و آسائش اور عیش و عشرت تک محدود نہیں ہونی چاہیئے بلکہ جفاکشی اور بلند حوصلگی تیرا اشعار ہونا چاہیئے!

## 141 نصیحت

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخورد — اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں!
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام — سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں!
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر — وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں!

**معنی**: سال خوردہ: بوڑھا۔ **تلخ**: کڑواہٹ۔ **انگبیں**: شہد۔

① یہ نظم بھی اقبال کے مخصوص انداز فکر کی حامل ہے جس کے دو بنیادی اور مرکزی کردار ہیں۔ ان میں ایک تو ایسا شاہیں ہے جو تجربہ کار ہے اور عمر کے آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہے۔ دوسرا کردار شاہیں کا بچہ ہے۔ اس مختصر لیکن جامع اور مکمل نظم کے تین شعر ہیں جن میں ایک پوری داستان بیان کر دی گئی ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ نظم بھی اس سے پچھلی نظم سے معنوی سطح پر خاصی مشابہت رکھتی ہے چنانچہ نظم کے تینوں اشعار میں جو مکالمہ کیا گیا ہے وہ کچھ اس طرح سے ہے۔

① ایک تجربہ کار اور عمر رسیدہ شاہیں نے اپنی نسل کے ایک نو عمر شاہیں بچے سے کہا کہ میری دعا تو یہ ہے کہ رب ذوالجلال تیرے بازوؤں میں آسمان کی بلندیوں تک اڑنے کی صلاحیت پیدا کرے۔

② اے عزیز! یہ بات بھی ذہن نشیں کر لے کہ جوانی سخت کوشی' جفاکشی اور جدوجہد کے عمل سے عبارت ہے۔ کوئی بھی جاندار عمر کے اس حصے میں اگر ان خصوصیات کو نہیں اپناتا تو زندگی میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکتا۔ یہ درست ہے کہ ان مراحل کے ضمن میں بسا اوقات بڑے سخت معاملات کا سامنا

بھی کرنا پڑتا ہے لیکن نتیجہ ہمیشہ کامیابی اور کامرانی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے کہ محنت اور جدوجہد کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔

③ اور یہ بھی جان لے کہ جو لطف اڑتے ہوئے کبوتر پر حملہ آور ہونے اور اس پر جھپٹنے کے عمل میں حاصل ہوتا ہے وہ مزہ تو شاید اس کبوتر کا خون پینے میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔

ان تین اشعار سے مراد یہ لی گئی ہے کہ زندگی عملی جدوجہد کے بغیر بے معنی شے ہے اور ہر بلند ہمت اور جفاکش انسان اس نوع کی جدوجہد میں ہی وہ لطف محسوس کرتا ہے جو فی الواقع جدوجہد سے حاصل کی ہوئی اشیاء میں نہیں ملتا۔

142

## لالہ صحرا

یہ گنبد مینائی! یہ عالم تنہائی!
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی!
بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو!
منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی؟
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلہ سینائی! میں شعلہ سینائی!
تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبہ پیدائی! اک لذت یکتائی!
غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی!
اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی!
ہے گرمی آدم سے ہنگامہ عالم گرم
سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی!
اے باد بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی سرمستی و رعنائی!

علامہ اقبال کے فکر و فن کے حوالے سے "لالہ صحرا" ان کی بہترین اور شاہکار نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم میں جو امیجری ہے وہ اقبال کے فنی اجتہاد کی دلیل ہے۔ نظم کے اولین شعر میں انہوں نے گنبد مینائی اور عالم تنہائی کے تلازمات سے ایسا منظر نامہ ترتیب دیا ہے جو ایک مخصوص صورت حال کا آئینہ دار ہے اور اس کے بعد دوسرے شعر سے "لالہ صحرا" سے مکالمہ کرتے اور حکمت و دانش کے موتی بکھیرتے نظر آتے ہیں۔

① صحرا کی وسعت اور فراخی! جس پر نیلگوں آسمان کا گنبد! اس ماحول میں اے "لالہ صحرا" تیری موجودگی حیران کن ہے جب کہ میرے لئے تو یہ سب کچھ خوفزدہ کرنے کا سبب ہے۔ عملی سطح پر یہ کیفیت تو ترک دنیا کے عمل کی مظہر ہے جب کہ میرے نزدیک زندگی ترک دنیا نہیں بلکہ اس میں موجود رہ کر اپنے مقاصد کو روبہ کار لانے کے لئے عملی جدوجہد کا نام ہے۔

② ہرچند کہ اپنی بے عملی کے سبب ایک ایسے مسافر کی مانند ہوں جو کہ گم کردہ راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور تیرا وجود بھی مجھے کچھ اپنے سے ملتا جلتا محسوس ہوتا ہے۔ میری طرح تو نے بھی کبھی سوچا کہ تیری منزل کون سی ہے جب کہ تو نے تو خود کو صحرا و بیاباں تک محدود کر لیا ہے۔ اس ماحول میں آخر تیرے حسن کا قدرداں کون ہے؟

③ یہ ایک المیہ ہے کہ دنیا کے پہاڑ اور اس کے دامن اب پیغمبر خدا حضرت موسیٰ کلیم اللہ جیسی بلند پایہ

ہستیوں کی آماجگاہ نہیں رہے ورنہ میرے سینے میں بھی وہی شعلہ موجود ہے اور تیرے سینے میں جو حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر نظر آیا تھا اور جس کی تاب نہ لا کر وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ مراد یہ ہے کہ تیری طرح مجھ میں بھی وہ خصوصیتیں موجود ہیں جو حسن حقیقی کی آئینہ دار ہیں لیکن ہوا یوں ہے کہ ان کا ادراک رکھنے والے لوگ ناپید ہو چکے ہیں۔

④ اسی پس منظر میں یہ سوال بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ اے لالہ صحرا' تو شاخ کی کوکھ سے کیوں برآمد ہوا اور میں عدم سے وجود میں کیوں آیا تو اس کا جواب بھی شاید مشکل نہیں ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ہر شے میں نمود و نمائش کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ یہی جذبہ تیری تخلیق کا سبب بنا اور یہی جذبہ میری تخلیق کا! دونوں کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں آ کر اپنے اپنے مقام سے ذاتی انفرادیت اور خود نمائی کا اظہار کیا جائے!

⑤ عشق و محبت کی راہیں اس قدر کٹھن ہیں کہ ان سے خدا کی مدد کے بغیر عاشق عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس راہ کا ایک ایک مرحلہ پورے بیابان خارزار سے گزرنے کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں دلی مقصد کا حصول انتہائی مشکلات کا حامل ہے۔

⑥ عملی جدوجہد کے ذریعے بے شک ہر شخص اپنی منزل پا لیتا ہے لیکن کچھ بدقسمت افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو تمام تر عملی جدوجہد اور اس کے علاوہ ہر نوع کی مشکلات سے گزرنے کے باوجود اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔ فطرت بھی ایسے لوگوں کی ناکامی پر کسی نہ کسی انداز میں اظہار تاسف کئے بغیر نہیں رہتی۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ انسان کو اس کی محنت اور جدوجہد کا پھل کسی نہ کسی صورت میں مل ہی جاتا ہے۔

⑦ کائنات میں اگر کوئی فرد سرگرم عمل ہے تو وہ محض انسان ہے جو دنیاوی سطح پر تہذیب و تمدن اور معاشرے کی بھلائی کے لئے ہر ممکن سعی کرتا رہتا ہے ورنہ سورج اور ستارے ہر چند کہ تاریکی میں جلوہ آرا ہوتے ہیں اور دنیا کو منور کرنے کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی حیثیت محض تماشائی کی سی ہے۔ سارا زمام کار تو انسان کے ہاتھوں میں ہے۔

⑧ کاش مجھے بھی رب ذوالجلال ان کیفیتوں سے نواز دے جو اس نے صحرا کی ہواؤں کو بخشی ہیں کہ تنہائی کے سناٹے میں جاری و ساری رہتی ہیں۔ ایک طرف سکون اور دوسری جانب سرمستی اور رعنائی سے ان کا وجود عبارت ہے۔ میں بھی انہی کیفیات میں زندگی گزارنے کا خواہاں ہوں۔

# ساقی نامہ

143

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ارم بن گیا دامنِ کوہسار!
گل و نرگس و سوسن و نسترن! شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن!
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں!
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ!
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ!
ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام!
پلا دے مجھے وہ مے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصل گل روز روز!
وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات!
وہ مے جس سے ہے مستی کائنات!
وہ مے جس میں ہے سوز و ساز ازل!
وہ مے جس سے کھلتا ہے راز ازل!
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے!

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش راز فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ!
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے!
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا!
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے!
دل طور سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر خطر ہے کلیم!
مسلماں ہے توحید میں گرمجوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش!
تمدن تصوف شریعت کلام
بتان عجم کے پجاری تمام!
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی!
لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب
مگر لذت شوق سے بے نصیب!
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا!
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے!
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے!

شراب کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر!
جوانوں کو پیروں کا استاد کر!
ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے!
دل مرتضیٰؓ سوز صدیقؓ دے!
جگر سے وہی تیر پھر پار کر!
تمنا کو سینوں میں بیدار کر!
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر!
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!

جوانوں کو سوز جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر!

بتا مجھ کو اسرار مرگ و حیات
کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات!

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں!
مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں!

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز!
مری خلوت و انجمن کا گداز!

امنگیں مری، آرزوئیں مری!
امیدیں مری، جستجوئیں مری!

مری فطرت آئینۂ روزگار!
غزالان افکار کا مرغزار!

مرا دل مری رزم گاہ حیات!
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات!

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر!
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!

مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے!

دمادم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رم زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود!

گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل
خوش آئی اسے محنت آب و گل

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی!
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی!

یہ وحدت ہے، کثرت میں ہر دم اسیر!
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر!

یہ عالم، یہ بتخانۂ شش جہات!
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات!

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں

چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

اسی کے بیاباں اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور!

کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ
لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور!
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور!

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروان وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے!
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے!

ہوا جب اسے سامنا موت کا کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہان مکافات میں رہی زندگی موت کی گھات میں!
مذاق دوئی سے بنی زوج زوج اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے! اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے!
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس! ازل سے ابد تک رم یک نفس!

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے!

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے! خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے!
خودی کیا ہے راز درون حیات! خودی کیا ہے بیداری کائنات!
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند! سمندر ہے اک بوند پانی میں بند!
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک! من و تو میں پیدا من و تو سے پاک!
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے! نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے!
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں! پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں!
سفر اس کا انجام و آغاز ہے یہی اس کی تقویم کا راز ہے!
کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں! یہ بیرنگ ہے' ڈوب کر رنگ میں!
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے! نشیب و فراز و پس و پیش سے!
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے!

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب وہ ناں جس سے جاتی رہی اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فروفال محمود سے درگزر خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر
وہی سجدہ ہے لائق اہتمام کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام!
یہ عالم' یہ ہنگامہ رنگ و صوت یہ عالم کہ ہے زیر فرمان موت
یہ عالم' یہ بتخانہ چشم و گوش جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزل اولیں مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں! جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر طلسم زمان و مکاں توڑ کر!

خودی شیر مولا جہاں اس کا صید! زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید!
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار!
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت! تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت!
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ! حقیقت ہے آئینہ، گفتار زنگ!
فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس!

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم!

اقبال نے یوں تو اس نوعیت کی متعدد نظمیں تخلیق کی ہیں لیکن زیرِ تشریح نظم جو "بالِ جبریل" میں "ساقی نامہ" کے عنوان سے شامل ہیں اس موضوع پر ان کی طویل ترین نظم ہے۔ جو ننانوے اشعار اور سات بند پر مشتمل ہے۔ یہ بند علی الترتیب موسمِ بہار، عہدِ حاضر کے انقلابات اور ملتِ اسلامیہ کی پستی، باری تعالیٰ کے حضور ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کے لیے دعائیں، زندگی کے حقائق، زندگی کی خصوصیات، رازِ خودی اور خودی کے محاسن و اوصاف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخری چند اشعار فلسفۂ زندگی اور پیغام سے عبارت ہیں، ملاحظہ ہوں۔

## پہلا بند

① علامہ اقبال نے اس ابتدائی بند میں موسمِ بہار کے حوالے سے جو خوبصورت امیجری پینٹ کی ہے وہ اردو زبان کی پوری نیچرل شاعری میں انتہائی انفرادیت کی حامل نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ موسمِ بہار کی آمد آمد ہے اور پہاڑوں کے دامن میں اس طرح سے رنگ برنگے پھول نشوونما پا رہے کہ ان کو دیکھ کر باغِ ارم کا گمان ہوتا ہے۔

② اس باغِ ارم میں گلاب، نرگس، سوسن، و نسرین کے علاوہ "لالے" کے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ ان کا وجود گناہوں کو خیرہ کیے دیتا ہے۔

③ ساری کائنات انہی رنگا رنگ پھولوں میں چھپ کر رہ گئی ہے۔ ان کے حسن نے اس کو مسرور و مسحور کر دیا ہے۔ عمارات پر بھی نظر ڈالئے تو ان پر بھی ان پھولوں کے رنگ یوں جگمگا رہے ہیں جیسے ان میں لگے ہوئے پتھروں کی رگ رگ میں سرخ رنگ لہو گردش کر رہا ہو۔ مراد یہ ہے کہ بہار کے پھولوں نے چار سو رنگ و نور پھیلا رکھا ہے۔

④ اس منظر سے ساری فضا رنگ برنگی ہو کر رہ گئی ہے۔ پھولوں کی مہک اور عطر بیز ہوائیں دل و نظر کو سرور بخش رہی ہیں۔ انسان تو انسان، پرندے تک جھومتے جھامتے اپنے آشیانوں سے باہر نکل کر اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

⑤ موسمِ بہار محض عام فضاء پر ہی اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ پہاڑ اور دریا بھی اس سے لطف اندوز ہوتے

ہیں چنانچہ پہاڑوں میں سے برآمد ہونے والے ندی نالوں کا یہ عالم ہے کہ کبھی تو وہ دھیرے دھیرے، اور خراماں خراماں رواں دواں ہوتے ہیں اور کبھی رکتے ہوئے اور سرسراتے ہوئے گزر رہے ہیں۔

⑥ گردوپیش کی فضاء سے یہ ندی نالے بھی اس طرح مسحور ہو رہے ہیں کہ کبھی جوش مسرت سے اچھل پڑتے ہیں اور ان کی روانی میں تیزی آجاتی ہے۔ یہ ندی نالے تمام پر پیچ راستوں سے بل کھاتے ہوئے گزر رہے ہیں۔

⑦ دلچسپ بات یہ ہے کہ اتنی تیز روانی کے سبب جب ان ندی نالوں کی راہ میں کوئی پتھر آجائے تو ان کو ریزہ ریزہ کر ڈالتے ہیں۔ اس لمحے یوں لگتا ہے جیسے وہ پہاڑوں کے دل چیر رہے ہوں۔ واضح رہے کہ یہ زیر تشریح تینوں اشعار اپنے مضمون کے اعتبار سے موسم بہار میں پہاڑی ندی نالوں کی کیفیت کے مظہر ہیں۔

⑧ پہلے بند کے آخری پانچ اشعار میں اقبال موضوع کے بنیادی کردار ساقی سے مخاطب کرتے ہیں کہ اور باتوں کے علاوہ اس جانب بھی توجہ دے کہ زندگی تجھے کیا پیغام دے رہی ہے۔ اس شعر سے قبل کوہ و ندی کے حوالے سے جو حرکت اور جوش کی بات کی گئی ہے وہی دراصل بند حیثیت کی حامل ہے۔

⑨ اے ساقی! یہ تو ایک بدیہی امر ہے کہ یہ فصل گل اور موسم بہار کا مخصوص وقت ہوتا ہے۔ روز روز ان کی آمد ممکن نہیں! للذا اس سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ تو مجھ ایسا نشہ آور مشروب دے جو اس پردے کو جلا کر خاک کردے کہ جو میرے اور تیرے درمیان حائل ہیں۔

⑩ مجھے وہ نشہ پلا جو ضمیر حیات کی روشنی اور تازگی بخشتا ہے اور جس کے سرور سے ساری کائنات وجد میں آجاتی ہے۔

(11) ایسا نشہ جو آغاز کائنات کے سوز و ساز سے عبارت ہے۔ یہی نہیں بلکہ عشق حقیقی کے حوالے سے آغاز کائنات کے بھید کھولنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

(12) اور اے ساقی! جب تو راز عشق سے پردہ اٹھا دے گا تو مجھ ایسا کمزور و ناتواں شخص بھی اپنے انتہائی طاقتور حریف سے اس طرح نبرد آزما ہو سکے گا جس طرح کہ ایک ننھی چڑیا عقاب کے مقابلے پر سر دھڑ کی بازی لگا دے۔

## دوسرا بند

① نظم کی تشریح کا آغاز کرتے ہوئے اس امر کی واضح طور پر نشاندہی کردی گئی تھی کہ دوسرے بند میں علامہ اقبال نے اپنے عہد میں عالمی سطح پر جن تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا ان کو اپنے افکار و تجربات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ آج کا عہد انقلابی تبدیلیوں کی زد میں ہے۔ جس طرح کسی گیت کے لئے نئے راگ اور نئے سازوں سے کام لے کر موسیقار روایت سے ہٹ کر نئی دھن ترتیب دیتا ہے۔ اسی طرح معاشرتی سطح پر تمام دنیا میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

② ان انقلابی تبدیلیوں کے سبب ساری دنیا کو اب اس حقیقت کا علم ہو چکا ہے۔ یورپ اپنے استعماری نظام کو زندہ رکھنے کے لئے کس طرح دوسرے ممالک کا عیاری اور مکاری کے ساتھ استحصال کرتا ہے۔ اس راز کے اچانک افشاء ہونے سے خود استعمار پسند یورپی ممالک حیرت زدہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے

لئے یہ امر انتہائی خدشات کا سبب ہے کہ ان کے زیر اقتدار ملک بھی اس عیاری اور مکاری سے آگاہ ہو گئے ہیں۔

③ بدلتے ہوئے حالات میں کیفیت یہ ہے کہ سیاست کے قدیم ہتھکنڈے ناکارہ اور ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے ہیں اور پوری دنیا بادشاہی ملوکیت اور آمریت سے بیزار ہو چکی۔ اب کوئی بھی اس فرسودہ نظام کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

④ سب اس حقیقت سے آشنا ہو چکے ہیں کہ سرمایہ داری کا استحصالی نظام اپنے منطقی انجام تک پہنچ کر ختم ہو گیا ہے۔ بالکل ایک ایسے مداری کی طرح جو تماشا دکھاتا ہے اور تماشائیوں سے اس کا معاوضہ وصول کر کے اپنی راہ لیتا ہے۔ اسی طرح سے استعماری نظام نے بھی اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا ہے۔

⑤ حد تو یہ ہے کہ اہل چین جن کو مغرب نے اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے ہوئے منشیات کا عادی بنا دیا تھا اسی عادت بد کے سبب وہ ناکارہ ہو کر رہ گئے تھے۔ اب وہ بھی شعوری سطح پر بیدار ہونے لگے ہیں اور اپنے حقوق کے حصول کی خاطر مغرب کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ یہی کیفیت ہمالہ کے نواحات کی ہے۔ یعنی ہندوستان اور اس کے قرب کے ممالک میں بھی استعماریت سے آزادی کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔

⑥ یہاں سے اقبال مذکورہ بالا پس منظر کے حوالہ سے بڑی دل سوزی کے ساتھ ملت اسلامیہ کے انحطاط و زوال پر روشنی ڈالتے ہیں کہ عالمی سطح پر انقلابی تبدیلیوں کے باوجود ملت مسلمہ شعوری سطح پر عصری انقلابات کا ادراک رکھنے کے باوجود انحطاط سے دوچار ہے اور جس طرح کوہ طور پر حضرت موسیٰؑ اور فاران کی چوٹی پر حضور سرورؐ کائنات نے معجز نمائی کی۔ آج بھی پوری ملت اس طرح کے معجزوں کی منتظر ہے۔ خود کسی قسم کی عملی جدوجہد سے گریزاں ہے۔

⑦ ہر چند کے مسلمان توحید الٰہی کے ضمن میں بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن غلامی کے دور میں اس کے عقائد میں جس طرح سے ردوبدل ہوا آج بھی وہ اس کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔

⑧ حد تو یہ ہے کہ معاشرت اور رہن سہن ہی نہیں تصوف، شریعت اور علم کلام غرض آج کے مسلمانوں میں اسلام کے نظریات کی بجائے عجمی معتقدات کا رنگ زیادہ غالب ہے۔

⑨ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اسلام کی حقیقی تعلیم، فضول اور لغو معاملات سے ہم آہنگ ہو کر رہ گئی ہے۔ اور پوری ملت اسلامیہ جو انقلابی نظریات کی آئینہ دار تھی اب وہ محض توہمی روایات میں دب کر رہ گئی ہے۔

⑩ بے شک مسلمان علماء اور واعظین کی پر زور خطابت سننے والوں کے دل کو تو لبھا لیتی ہے مگر ان تقریروں میں حقیقت کی وہ چاشنی موجود نہیں ہوتی جو قلب و روح کو منور کرتی ہے۔

(11) اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ان علماء اور واعظین کا بیان منطق اور فلسفے کے علوم سے آراستہ ہوتا ہے لیکن وہ جو ثقیل و پر شوکت الفاظ اور تراکیب استعمال کرتے ہیں۔ وہ بالعموم عام سامع کی پہنچ سے باہر ہوتی ہیں۔ اس صورت میں ان تقریروں کا اثر کیا خاک ہو گا؟

(12) ملت اسلامیہ میں ایک زمانہ تھا کہ تصوف پر اعتقاد رکھنے والا شخص خدائے ذوالجلال اور اس کی

وضع کردہ حقیقتوں پر جان نثار کرنے کے لئے آمادہ ہوتا تھا۔ یہی نہیں اس کے دل میں بندگان خدا سے بھی بے پناہ جذبہ محبت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ غیرت مندی اور جراءت اس کے کردار کی بنیادی خصوصیات ہوتی تھیں۔ لیکن اب تو کیفیت ہی مختلف ہے۔

(13) آج کی صورت حال تو یہ ہے کہ وہی صوفی جس کی خصوصیات گذشتہ شعر میں بیان کی گئی ہیں۔ افسوس کہ اب وہ غیر اسلامی اور غیر حقیقی روایات میں گم ہو کر رہ گیا ہے اور اپنی روایات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔

(14) اس ساری کیفیات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے دلوں میں عشق حقیقی کا جو شعلہ روشن تھا وہ بجھ چکا ہے اور عملاً ملت اسلامیہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے۔

## تیسرا بند

**معنی:** سیار: چلنے پھرنے والا۔ گردش کرنے والا۔ **غزالان افکار:** خیالات کے ہرن یعنی خیالات۔

اس بند کے اشعار میں ایک بار پھر منظر تبدیل ہوتا ہے اور اقبال دعائیہ انداز میں خدائے ذوالجلال سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اس نظم میں ساقی سے بالعموم ان کی مراد رب العزت ہے۔ ان اشعار میں تو یہ حقیقت اور واضح ہو کر سامنے آتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

① لغوی اور معنوی سطح پر اس شعر کا مفہوم بس اتنا ہی ہے کہ اے ساقی مجھے پھر وہی پرانی شراب سے سرشار کر اور اسی جام کا دور چلا جو انتہائی سرور بخشتا تھا لیکن ذرا توجہ سے دیکھا جائے تو اس شعر میں اقبال رب ذوالجلال سے درخواست کرتے ہیں کہ خداوندا! مجھے ایک بار پھر عشق محمد مصطفیٰ کی دولت سے نواز دے کہ یہی عہد قدیم سے روز حشر تک میرا سرمایہ حیات اور جزو ایمان ہے۔

② عشق رسول مقبولؐ کی انتہائی معراج میرے قلب و روح کا سرمایہ ہو اور میری خاک کا ہر ذرہ جگنو کی طرح پرواز کرے جس سے ساری فضا منور ہو جائے۔

③ اے مولائے کائنات! ملت مسلمہ کی ذہنیتوں میں انقلاب برپا کر دے تاکہ وہ غیروں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔ اسی طرح جو ملت کے نونہال ہیں کہ وہ دینی اور انسانی سطح پر اپنے اجداد سے بھی بازی لے جائیں۔

④ ملت اسلامیہ دیکھا جائے تو تیری عنایات کے طفیل ہی زندہ و پائندہ ہے۔ اور تیرے ہی لطف و کرم کے سبب تمام تر مشکلات کے باوجود اسے فروغ حاصل ہے۔

⑤ اے مالک حقیقی! مجھے اتنی توفیق عطا فرما کہ اپنی منزل تک رسائی کے لئے عملی جدوجہد سے کام لے سکوں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے لازم ہے کہ علی مرتضیٰؓ جیسی جراءت، ہمت و حوصلہ اور ابوبکر صدیقؓ جیسا سوز و گداز حاصل ہو۔ یہی وہ عوامل ہیں جو کامیابی کے ضامن بن سکتے ہیں۔

⑥ خدایا! ملت کے قلب و روح کو پھر سے عشق رسولؐ سے ہمکنار کر اور منزل تک رسائی کے جذبے سے پھر اسے سرشار کر دے۔

⑦ اے رب العزت تیرے آسمان اور ستارے ہمیشہ سلامت رہیں اور دنیا میں وہ لوگ جو راتوں کی نیندیں قربان کر کے تیری بارگاہ میں سجدہ نیاز بجالاتے ہیں۔ وہ بھی زندہ سلامت رہیں۔

⑧ میں دست بدعا ہوں کہ ملت کے نوجوانوں کو سوز و گداز سے آشنا کر اور جس طرح میں عشق حقیقی کا پرستار ہوں اور جیسے میری نظریں نور حقیقی سے منور ہیں یہ صلاحیتیں نوجوانوں میں بھی پیدا کردے۔

⑨ اے مولائے کل! ملت اسلامیہ کے ہر پیر و جواں کو مشکلات سے نکال کر ان کی منزل تک پہنچا دے۔ ان کی جو کشتی میری طرح گرداب میں پھنسی ہوئی ہے اسے بھی پار لگانے کا اہتمام کر!

⑩ تو مجھے بھی موت و زندگی کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ کر دے اس لئے کہ یہ محض تیرا ہی وجود ہے جو تمام کائنات کے احوال سے باخبر ہے۔

(11) ملت مسلمہ جس ابتلاء میں گرفتار ہے اور انحطاط و زوال سے دوچار ہے اس پر میرا دل خون کے آنسو روتا رہتا ہے۔ یہی اذیت مجھے شب بھر بیدار رکھتی ہے۔ لیکن افسوس اس امر پر ہے کہ میری اس حالت سے کوئی واقف نہیں!

(12) اسی کیفیت کے سبب میں تیری بارگاہ میں نصف شب کے وقت نالہ و فغاں میں مصروف رہتا ہوں۔ تنہا ہوں یا کسی اجتماع کے مابین! ہر لمحے میرا قلب اسی کرب کا شکار رہتا ہے۔ اور ہر لمحے اضطراب مجھ پر مسلط رہتا ہے۔

(13) اے مولا! میری امنگیں اور آرزوئیں سب میری ذات تک محدود نہیں بلکہ پوری ملت کے لئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میں اس کے لئے ہی بہتری کی امید اور جستجو کرتا رہتا ہوں۔

(14) میں تو ایک ایسا مفکر ہوں جو فطرتاً کائنات کے حقائق کا ادراک حاصل کرنے میں مصروف رہتا ہے اور میرا دل ہر نوع کے خیالات کا خزینہ ہے۔ جس میں انسان اور معاشرے کی بہبودی کے لئے جذبات موجزن رہتے ہیں۔

(15) اے رب کریم! میرا دل تو حیات انسانی کے جملہ مسائل کی آماجگاہ ہے جہاں ہر لمحے نیک و بد میں تصادم رہتا ہے۔ اور ہر نوع کے یقین و گمان کا مرکز ہے۔

(16) میں تو ایک فقیر و درویش کے مانند ہوں لیکن تو نے میری ذات میں جو خصوصیات پیدا کی ہیں اور جن کا تذکرہ میں اشارتاً گذشتہ چند اشعار میں کر چکا ہوں انہی کے دم پر میں امیری کا لطف حاصل کر رہا ہوں۔

(17) ان اشعار میں جو اسرار و رموز بیان کئے گئے ہیں تو جانتا ہے کہ ملت کے لئے وہ کس قدر کارآمد ہیں۔ تجھ سے اتنی ہی استدعا ہے کہ یہ جذبے ملت مسلمہ کے سینوں میں بھی داخل کر دے کہ تو اس عمل پر قادر ہے۔

## چوتھا بند

**معنی: حضر:** سفر کے برعکس۔ اپنے گھر میں ٹھہرے رہنا۔ **مکافات:** بدلہ۔ زوج زوج۔ جوڑا جوڑا۔ **تیز جولاں:** تیز چلنے والی۔ **زود رس:** جلد پہنچنے والی۔

① اس بند میں اقبال نے زندگی کے ان اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا ہے جن کا ہر فرد کو ادراک نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ زندگی کا تمام کاروبار ہر لمحے جاری و ساری ہے۔ افراد کی عملی جدوجہد نے اس میں جوش و خروش پیدا کر دیا ہے۔ اسی کے سبب ہر شعبے میں ترقی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔

② جس طرح سے آگ کے ایک شعلے میں دھوئیں کی ایک رو پوشیدہ ہوتی ہے اسی طرح جسم حیات انسانی میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اور یہ زندگی ہی ہے جو اسے وجود عطا کر کے نمایاں کرتی ہے۔ مراد یہ کہ اصل شے روح حیات ہے۔

③ ہر چند کہ حیات کو آگ، پانی، مٹی اور ہوا جیسے جملہ عناصر کی حدود میں رہنا گوارا نہیں لیکن یہ عناصر انسانی وجود میں جدوجہد میں ارتقاء کی علامت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کو خوشگوار انداز میں برداشت کر لیتی ہے۔

④ یہ نکتہ کہ زندگی مذکورہ چار عناصر کے پھندے میں جکڑی ہوئی بھی ہے اس کے باوجود انہی عناصر کے وسیلے سے چونکہ وجود قائم و دائم ہے اور انہی کے سبب ترقی کے مواقع نصیب ہوتے ہیں اسی لئے زندگی کے لئے جملہ عناصر ناگزیر ہیں۔

⑤ زندگی تو عملاً ظہور وحدت ہے تاہم اس کے منظر نامے میں جو اشیاء موجود ہیں وہ کثرت کی آئینہ دار ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ہر شے اور اس کا منظر جدا جدا اور ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ایک شے کی ہیئت ہر دوسری شے سے جداگانہ ہے۔

⑥ اور جو یہ دنیا ہے وہ ایک ایسے بتکدے کی مانند ہے جو عملاً چھ سمتوں پر مشتمل ہے یہ بھی زندگی کی بدولت وجود میں آیا ہے یعنی زندگی کا وجود نہ ہوتا تو دنیا بھی نہ ہوتی۔

⑦ یہ عالم رنگ و بو ایسا ہے جس میں موجود ایک فرد کی شبیہ کسی دوسرے سے نہیں ملتی۔ کیا یہ حیرت انگیز امر نہیں ہے کہ ہر فرد دوسرے سے عملاً مختلف ہے۔

⑧ ہر چند انجمن سجانے میں زندگی بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس کے بغیر آرائش انجمن بھی ممکن نہیں۔ اس کے باوجود یہ حیرت انگیز بات ہے کہ میری تیری محفل کے دوران بھی وہ تنہائی کے کرب میں مبتلا رہتی ہے اور ہر کہ و مہ کی نظر سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔

⑨ اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو زندگی عالمی سطح پر بے شمار اشیاء میں مختلف رنگ ڈھنگ سے نظر آتی ہے۔ کبھی بجلی کے تاروں میں کبھی ستاروں میں اس کی چمک موجود ہوتی ہے اور کبھی چاندی، سونے اور پارے میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ غرض یہ کہ زندگی اپنے طور پر مختلف اشکال میں موجود ہوتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کو گہری نظروں سے دیکھا جائے۔

⑩ امر واقعہ تو یہ ہے کہ زندگی ہی کی بدولت صحرا اور اس کے کانٹے دار درخت اور پھول نشو و نما پاتے ہیں۔

(11) زندگی میں اس قدر قوت و استحکام ہے کہ تصادم کی صورت میں پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ جبرئیل علیہ السلام جیسا فرشتہ اور حوران جنت اگر بالمقابل ہوں تو انہیں بھی اپنے جال میں پھانسنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان میں اگر روحانی قوت موجود ہو تو اس کی رسائی بہشت بریں اور اس میں موجود فرشتوں اور حوروں تک ہو سکتی ہے۔

(12) کہیں اس امر کا امکان بھی ہوتا ہے کہ زندگی سے بھرپور کوئی لشکر اور اس کا سپہ سالار اپنے سے کمزور سلطنتوں کے خلاف خوں ریز جنگ کے بعد شکست فاش دے کر ان پر اپنا قبضہ جما لیتے ہیں اور وہاں پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی فکر کرتا ہے۔

(13) کہیں زندگی ایسی بالادست حیثیت میں ظاہر ہوتی ہے کہ اپنی ذہانت سے حریفوں کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتی ہے۔ غرض زندگی ہی وہ قوت ہے جو ہر شے پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی اہل ہوتی ہے۔

## پانچواں بند

اس بند کے اشعار میں علامہ اقبال مزید ایک قدم آگے بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی فکر و نظر میں زندگی کی کچھ ایسی حقیقتیں بھی ہیں جو عمومی سطح پر انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ چنانچہ ان اشعار میں وہ اسی نوعیت کے رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مطابق!

① زندگی میں کہیں کہیں جو یہ سکون اور ٹھہراؤ سا نظر آتا ہے۔ یہ تو دھوکے سے سوا اور کچھ نہیں اس لئے کہ فی الواقع حرکت ہی حقیقی زندگی ہے۔ بے شک ظاہر بیں آنکھ اس مرحلے تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ کائنات کا ہر ایک ذرہ اضطراب سے دوچار ہے اور حرکت میں ہے۔

② اسی پس منظر میں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ انسانی وجود بھی ہر لمحے متحرک رہتا ہے اور مختلف جہتوں سے ہم کنار رہتا ہے۔

③ اے دانشمند انسان حیرت ہے کہ تو اب بھی زندگی کو ایک ایسا راز تصور کرتا ہے جو افشاء نہیں ہوتا حالانکہ یہ بنیادی حقیقت ہے کہ زندگی تو بلند پروازی اور عروج و ارتقاء سے عبارت ہے۔

④ جان لے کہ زندگی تو بے شمار بلندیوں اور پستیوں سے ہو کر گزری ہے۔ حرکت اور گردش اس کی سرشت ہے اس کو تو منزل تک رسائی سے زیادہ سفر اور گردش ہی پسند ہے۔ وہ کسی پڑاؤ پر رکنے کا نام نہیں لیتی بلکہ ہمیشہ متحرک رہتی ہے۔

⑤ جہاں تک سفر کا تعلق ہے سو وہ زندگی کو متحرک اور بر سر عمل رکھنے کا دوسرا نام ہے۔ اسی لئے سفر کو ایک حقیقت بھی تصور کر لینا چاہیے اور مجاز بھی! کہ سفر کی یہ دونوں صورتیں زندگی کے ہی بلاشبہ دو رخ ہیں۔

⑥ ہنگامہ خیزی، کشمکش اور ہر نوع کی آویزش دیکھا جائے تو ایسے عوامل ہیں جو زندگی کے لئے باعث سکون ہوتے ہیں۔ وہ اسی صورت میں عروج و ارتقاء کی منازل طے کر سکتی ہے کہ معروضی حالات کا دلیری اور جراءت مندی کے ساتھ مقابلہ کرے۔ صرف مقابلہ ہی نہیں بلکہ ان پر غلبہ حاصل کرنے کی سعی بھی کرے۔

⑦ اقبال کے بقول زندگی کی اصل حریف موت ہے اور جس مرحلے پر اسے موت کا سامنا کرنا پڑا تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس سے مقابلہ بڑا سخت تھا۔ اس کے باوجود یہ زندگی میں جراءت و ہمت و حوصلہ ہی تھے کہ اس نے بالآخر موت کو شکست سے ہم کنار کر دیا۔

⑧ چنانچہ موت سے نبرد آزمائی کے وقت زندگی نے اپنی پوری صلاحیتوں سے کام لے کر اسے گھٹنے ٹیکنے

پر مجبور کر دیا۔

⑨ فطرت کے ساتھ امتزاج کے سبب زندگی جنگلوں اور پہاڑوں میں اپنے تخلیقی رویے کے ساتھ فوج کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

⑩ چنانچہ زندگی کو اگر کسی پودے کی شاخ تصور کر لیا جائے تو ایک جانب تو پھول اسی شاخ سے ٹوٹتے رہے دوسری طرف اسی شاخ سے پھولوں کی نمود ہوئی۔ مراد یہ ہے کہ زندگی کا دوہرا عمل یہ ہے کہ اس ہاتھ سے دیتی ہے تو دوسرے سے لے لیتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس شعر میں اقبال نے مسئلہ آواگون کا اشارتاً ذکر کیا ہے۔

(11) سچی بات تو ہے کہ جو نادان اور احمق لوگ ہیں وہ زندگی کو ناپائیدار اور فانی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ زندگی تو ایسا نقش ہے جو مٹ مٹ کر ابھرتا ہے۔ یہ تو ایسی حقیقت ہے جو موت سے ہمکنار ہو کر بھی زندہ اور جاوداں رہتی ہے۔

(12) جان لے! کہ زندگی اس قدر تیز رفتار ہے جو آن کی آن میں اس منزل تک رسائی حاصل کر لیتی ہے جو اس کی مطلوبہ منزل ہو۔ یہ تو ایسی حقیقت ہے جس نے آغاز کائنات سے سانس کی آمد و شد کے حوالے سے اپنے وجود کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔ موت قطعی طور پر اس کے ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔

(13) زمانہ تو دنوں، مہینوں اور سالوں کے باہمی تسلسل کا دوسرا نام ہے اسی لئے یہ رواں دواں اور متحرک زندگی کی دوسری صورت ہے۔

## چھٹا بند

**معنی:** **تجسس:** تلاش۔ جستجو۔ ڈھونڈ ڈھانڈ۔ **تقویم:** قیام۔ ثبات۔ مضبوطی استحکام پائیداری استقامت۔

اقبال کی بنیادی فکر اور فلسفہ دیکھا جائے تو خودی سے عبارت ہے۔ اس بند میں وہ خودی کے حوالے سے اپنے نظریات بیان کرتے ہیں۔ ان اشعار کے علاوہ علامہ کے اردو اور فارسی کلام کے علاوہ ان کے بعض مضامین میں خودی کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ تیرہ اشعار پر مشتمل یہ بند خودی کی ماہیت پیش کرتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

① اگر انسان کے سانس کو ایک تلوار تصور کر لیا جائے تو پھر خودی کو اس تلوار کی دھار سمجھ لینا چاہیے اور اس حقیقت کی وضاحت کی زیادہ ضرورت بھی نہیں ہے کہ دھار کے بغیر تلوار کند اور بے مصرف ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس شعر سے مراد یہ ہے کہ خودی ہی دراصل روح حیات ہے اس کے بغیر زندگی کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

② اس شعر میں بھی علامہ خودی کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خودی ایک ایسا راز ہے جسے زندگی نے محفوظ اور پوشیدہ رکھا ہوا ہے اور یہ خودی ہی ہے کہ پوری کائنات کو بیداری کا پیغام دیتی ہے۔ جس طرح بے شعور انسان کا وجود بے معنی ہے اسی طرح کائنات خودی سے خالی ہو تو بے مقصد اور بے معنی بن کر رہ جاتی ہے۔

④ جلوت اور خلوت دونوں صورتوں میں خودی اپنا کمال دکھاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ خودی کی شکل میں سمندر ہے جو محض ایک قطرہ میں بند ہے۔ مراد یہ ہے کہ خودی تو ایک ایسا جوہر ہے جو پوری زندگی پر محیط ہے۔

⑤ خودی کی روشنی محض تاریکی ہی کو نہیں اجالے کو بھی زیادہ تابناک بنا دیتی ہے۔ یعنی خودی عملاً اندھیرے اجالے کا امتیاز کئے بغیر دونوں صورتوں میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اور کوئی شے اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ خودی تو کثرت و وحدت میں یکساں طور پر نمودار ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان دونوں عناصر سے خود کو علیحدہ رکھتی ہے۔

⑥ اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ خودی کا وجود آغاز کائنات سے پہلے بھی تھا اور آئندہ روز حشر تک برقرار رہے گا۔ عملاً خودی کے نزدیک ہر دو زمانوں کی کوئی اہمیت نہیں۔

⑥ مذکورہ صلاحیتوں کے باوجود اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ زمانہ ایک دریا کی مانند ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ خودی ایک ایسا مظلوم جذبہ ہے جو اس دریا میں بہتا ہوا اور دریا سے پیدا ہونے والی اور بپھری ہوئی موجوں کے مظالم سہہ رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جذبہ خودی ماقدری زمانہ سے متصادم ہو رہا ہے۔

⑦ اقبال کہتے ہیں کہ خودی کی تلاش عملاً بڑا مشکل مسئلہ ہے کہ اس تک رسائی کے لئے طرز عمل حالات کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ اور اس طرز عمل کی طرح نظروں میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ خودی کو درجہ کمال تک پہنچنے کے لئے انتہائی کٹھن اور پیچیدہ راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

⑧ اور جب اس عمل کے بعد خودی ایک مستحکم اور پر قوت جذبہ بن کر ابھرتا ہے تو بھاری پتھر بھی اس کے لئے سبک اور بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے حتیٰ کہ اس کی ضربوں سے پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو کر ریت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہاں اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب خودی کا جذبہ مستحکم ہو جاتا ہے تو بڑی سے بڑی شے بھی اس کے سامنے ہیچ ہوتی ہے۔

⑨ گزشتہ بند کے بعض اشعار کی طرح یہاں بھی سفر کو حرکت کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے کہ سفر خودی کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی! کہ اس کے استحکام کا راز بھی سفر میں مضمر ہے۔ دراصل سفر سے یہاں مراد حرکت اور جدوجہد ہے کہ حرکت اور جدوجہد کے بغیر منزل تک رسائی مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتی ہے۔

⑩ خودی کا جذبہ چاند میں کرن کی صورت اختیار کر لیتا ہے اسی طرح وہ پتھر میں چنگاری کا روپ دھار لیتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رنگ میں غوطہ لگانے پر بھی وہ بے رنگ ہی رہتی ہے۔ یعنی مختلف اشیاء میں موجود ہونے کے باعث وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتا ہے اور دوسری اشیاء میں گم ہو کر نہیں رہ جاتا اس لئے کہ جذبہ مادی نہیں بلکہ روحانی ہے۔

(11) خودی کو بلندی و پستی اور کمی و زیادتی سے کوئی واسطہ نہیں اس لئے کہ اس کا مادی اشیاء سے کوئی تعلق نہیں!

(12) آغاز کائنات سے خودی کشمکش میں مبتلا رہی ہے کہ اس کا حقیقی مسکن کہاں ہے؟ بالآخر اس پر انکشاف ہوا کہ آدم خاکی کا جسم ہی اس کی پناہ گاہ بن سکتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان اور صرف انسان ہی خودی کی اہمیت سے آگاہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری شے اس کے مقام و مرتبہ کا اندازہ کرنے کی قطعی

اہل نہیں۔

(12) اس سے پہلے کے شعر کا جو موضوع ہے وہی زیر تشریح بند کے آخری شعر کا موضوع ہے۔ جس طرح مختصر اور محدود سی آنکھ آسمان کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے اسی طرح سے یہ جان لینا چاہئے کہ خودی کا حقیقی مقام دل ہے اور یہ کہ انسان خودی میں ڈوب کر ہی کائنات کے علاوہ اپنی ذات کے داخلی بھید پا سکتا ہے۔

## ساتواں بند

**معنی : فر و فال**: شان و شوکت اور اقبال مندی۔ **خاک دان**: لفظی معنی مٹی کا گھر۔ مراد دنیا۔ **یلغار**: ترکتاز' یورش' حملہ۔

① شاعر مشرق نے اس بند کے اشعار میں فلسفہ خودی کے محاسن اور اوصاف کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ عملاً یہ موضوع ان کا پسندیدہ ہے جس کے حوالے سے بے شمار اشعار اور نظمیں انہوں نے تخلیق کی ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ جذبہ خودی کو اوج کمال پر پہنچانے کے لئے لازم ہے کہ خودی کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والا شخص رزق حلال سے خود کو آسودہ کرے اس لئے رزق حرام اور ناجائز کمائی سے تو خودی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

② اس شعر میں بھی اقبال سابقہ شعر کے مضمون کا اعادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کے لئے رزق حلال ہی عظمت و سربلندی کا سبب بنتا ہے۔ یہی اس کی خودی کا کمال ہے۔ اسی مضمون کو انہوں نے قدرے مختلف انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!

③ سلطان محمود غزنوی ہر چند کہ بڑا جلیل القدر اور بہادر سلطان تھا۔ اس کے باوجود زندگی میں کامرانی کے لئے لازم ہے کہ اس کی پیروی کرنے کی بجائے اپنی خودی کو بروئے کار لایا جائے۔ ایسا نہ کیا گیا تو ایاز کی طرح غلامی مقدر بن جائے گی۔

④ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود ہونے کے سوا غیر خدا کے لئے کسی سجدے کا اہتمام باعث قدر و تحسین نہیں ہوتا کہ یہ تو غلامی کے مترادف ہوگا۔ خودی کی تکمیل کے لئے یہی عمل ضروری اور ناگزیر ہے۔

⑤ یہ دنیا جو بظاہر رنگ و روشنی اور آوازوں کی غنائیت سے ہم آہنگ ہے۔ عملاً اس کا وجود فنا سے عبارت ہے یعنی تمام حسن و رنگ کے باوجود بالآخر ہر شے کو فنا کے گھاٹ اترنا ہے۔

⑥ یہ شعر اور اس کے بعد کے متعدد اشعار پانچویں شعر کا تسلسل ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ یہ دنیا تو وہ مقام ہے جہاں کچھ کہا جائے اس کو سن لیا جائے اور جس شے کا نظارہ ہو اس کو خامشی کے ساتھ دیکھا جائے کہ یہاں جو زندگی رواں دواں ہے وہ محض خورد و نوش تک محدود ہی نہیں اس کی محتاج بھی ہے۔

⑦ یہ دنیا تو بلاشک و شبہ جذبہ خودی کی پہلی منزل ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بے معنی بات نہ ہوگی کہ

یہاں تو انسان ہر دم مسافرت میں ہے۔ اس کا کوئی مستقل گھر اور ٹھکانہ نہیں ہے۔

⑧ اے زمینی باشندے یہ بھی جان لے کہ تجھ میں جو حرارت ہے وہ اس دنیا کی خاک کی مرہون منت نہیں ہے بلکہ خالق کل نے تو یہ جہاں تیرے لئے ہی تخلیق کیا ہے اور تو کسی مرحلے پر بھی اس کا دست نگر نہیں ہے۔

⑨ لہٰذا تیرے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ اپنے وجود کو زندہ برقرار رکھنے کی راہ میں حائل تمام پابندیوں کو توڑ کر اپنی منزل تک رسائی کے لئے آگے بڑھتا جا اور زمان و مکان کے طلسم کو توڑ کر اپنی خودی کو اوج کمال تک لے جا!

⑩ خودی تو خدائے ذوالجلال کے تخلیق کردہ ایسے شیر کی مانند ہے جس کا شکار یہ تمام تر عالم رنگ و بو ہے اس شیر کی گرفت تو زمین اور آسمان دونوں پر ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس نے اپنی خودی کو عروج پر پہنچا دیا اس نے کل کائنات کو تسخیر کر لیا۔

(11) یہ بھی جان لے کہ اس جہان فانی کے علاوہ دنیائیں اور بھی ہیں جو ابھی تک ہماری بصیرت کی گرفت میں نہیں آسکیں تاہم ضمیر وجود خلا کا متحمل نہیں ہو سکا۔ چنانچہ اگر خودی پایہ تکمیل تک پہنچ جائے تو ہر ان دیکھی دنیا کا ادراک خارج از امکان نہیں رہتا۔

(12) شاید یہ امر خلاف حقیقت نہ ہو کہ ہر ان دیکھی دنیا تیری یورش کی منتظر ہے کہ کب تو اپنی فکر و دانش کے علاوہ جذبہ خودی کے طفیل کب اس کو مسخر کرتا ہے۔ تیرا کردار اور عمل ہی اس کی تسخیر کر سکتا ہے۔

(13) اور یہ جو کائنات کا نظام ہر لمحے متحرک رہتا ہے اور گردش میں مصروف رہتا ہے۔ اس کا مدعا ہی یہ ہے کہ تیری خودی کے سارے بھید تجھ پر کھل جائیں اور تو اپنی حقیقی منزل پانے کا اہل ہو سکے۔

(14) اب تجھ کیسے سمجھاؤں کہ قدرت نے تیری تخلیق کس مقصد کے لئے کی ہے۔ پہلے تو یہ جان لے! کہ دنیا اچھی ہے یا بری! تجھے تو اس پر اپنا تسلط جمانے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

(15) سچ تو یہ ہے کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ سچائی اور حقیقت تو آئینے کی مانند ہیں اور ان پر تفصیلی گفتگو اس آئینے پر گرد کی طرح سے ہے۔

(16) ہر چند کہ میرا سینہ جذبات کی شدت سے پھٹا پڑتا ہے لیکن یہ موضوع ایسا ہے جس پر مزید گفتار کی تاب نہیں!

(17) پھر خدشہ اس امر کا بھی ہے کہ اگر اپنی حدود سے بڑھتے ہوئے عشق حقیقی کے راز افشاء کر دوں تو قادر مطلق کو یہ گوارا نہ ہو گا اور وہ مجھے جلا کر خاک کر دے گا۔

# زمانہ

144

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہو گا، یہی ہے اک حرف محرمانہ!
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ!
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں

میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!

ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ!

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل، قصور میرا ہے یا کہ تیرا؟
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ!

مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ!

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے! یہ جوئے خوں ہے!
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ!

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ!

ہوائیں ان کی، فضائیں ان کی، سمندر ان کے، جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ!

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ!

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ!

**معنی:** حرفِ محرمانہ: نکتہ، رمز، پتے کی بات۔ **مقامر:** جوا کھیلنے والا۔

① اس نظم کا مرکزی کردار زمانہ ہے۔ علامہ اقبال نے عہد کے حوالے سے جو کچھ کہنا چاہا ہے وہ اسی کی زبان سے کہلوایا ہے۔ دس اشعار پر مشتمل اس نظم کے اولین شعر میں بقول اقبال زمانہ یوں گویا ہوتا ہے کہ کائنات میں بے شمار اشیاء جو کبھی موجود تھیں نظامِ قدرت کے تحت اب ناپید ہو چکی ہیں۔ اور وہ اشیاء بھی ناپید ہو جائیں گی جو آج موجود ہیں۔ غرض فنا ہر شے کا مقدر ہے اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہی معرفت کا نکتہ ہے۔ پھر یوں بھی ہے کہ جو عہدِ آئندہ میں ظہور پذیر ہو گا تو میں اسی کا منتظر رہتا ہوں۔

② میں (زمانہ) تو ایک ایسے خزینے کے مانند ہوں جس میں ہزاروں بھید اور واقعات محفوظ ہیں اور جب حسبِ حالات، یہ واقعات ایک ایک کر کے برآمد ہو کر منظرِ عام پر آتے ہیں تو ان کو شمار کر کے اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا ہوں۔

③ میرا عام طرزِ عمل یہ ہے کہ دنیا میں موجود ہر فرد سے واقف ہونے کے باوجود ان کے ساتھ میری رسم و راہ کے انداز بالکل الگ الگ ہیں۔ کسی کو اپنا طابع بنا لیتا ہوں اور جو باصلاحیت اور صاحبِ اختیار ہیں۔ ان کا مطیع ہو جاتا ہوں اور کسی کے لئے عبرت کا تازیانہ بن جاتا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ میں ہر فرد کے ساتھ اس کی صلاحیت کے مطابق زندہ برآمد ہوتا ہوں۔

④ میں تو ہر لمحے داد و دہش کے مراحل سے گزرتا رہتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری فیاضی سے استفادہ نہیں کرتا تو اس کے لئے قصوروار وہ ہے میں نہیں! یوں سمجھنا چاہئے کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور جو لوگ موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ وہ نااہل بھی ہیں اور اپنی مراد کے حصول سے بھی محروم رہتے ہیں۔

⑤ علم نجوم کا ماہر میری حقیقت سے کس طرح آشنا ہو سکتا ہے جب کہ اس کا کام تو ہر لمحے ستاروں کی گردش کی مدد سے لوگوں کو قسمت کا حال بتانے کے چکر میں مبتلا رکھنا ہوتا ہے۔ کہ یہ طرز عمل میری شناخت کا معیار نہیں ہو سکتا۔ جان لو کہ جس شخص کو معرفت کا مقام حاصل نہ ہوں وہ منزل مراد تک نہیں پہنچ سکتا۔

⑥ اور یہ مغرب یعنی یورپ کے افق پر جو شفق کی سرخی نمایاں ہے توفی الواقعہ یہ شفق کی سرخی نہیں بلکہ ان لوگوں کے خون کی سرخی ہے۔ مغرب نے جن کا استحصال کیا۔ للذا اے مرد خدا! یہ امر ناگزیر ہے کہ حالات کا جائزہ آنے والے عہد کے پیش منظر سے لیا جائے۔

⑦ یورپ کے سائنسدان اور خطرناک ہتھیاروں کے موجد یکجا ہو کر انسانی فطرت کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ بے شک یہ لوگ اپنی تباہ کن ایجادات پر فخر کریں لیکن امرواقعہ یہ ہے کہ آج یہ ایجادات ان کے اپنے لئے ہی تباہی کا سبب بن رہی ہیں۔ ہر چند کہ انہوں نے عالمی امن کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اس کے باوجود ان ایجادات کے باعث یورپ کو جنگ اور اس کے خوف کے علاوہ کچھ اور نہیں مل سکا۔ حد تو یہ ہے کہ ان خطرناک ایجادات پر جو بے دریغ اخراجات ہوئے ہیں انہوں نے یورپ کے کم و بیش تمام ممالک کو اقتصادی طور پر شدید قسم کے بحرانوں سے دوچار کر دیا ہے۔

⑧ اس شعر میں بھی اقبال نے پچھلے شعر کے حوالے سے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ہے کہ بے شک یورپی طاقتیں آج اپنے جہازوں' سیاروں اور دوسرے ذرائع سے خشکی' سمندر اور تمام فضاؤں پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود قدرت نے انہیں ایسے گرداب کا شکار بنا دیا ہے جو ان کے لئے ہولناک تباہی کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ ہولناک ایجادیں بھی ان کی ان کی بربادی کا سامان بن رہی ہیں۔

⑨ ہر چند کہ یہ ہولناک ایجادات کا دور ہے جسے عالمی سطح پر عروج و ترقی کا نام دیا جا رہا ہے لیکن ذرا گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ عروج وارتقاء منفی حیثیت کے حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کا انحطاط و تنزل زیادہ دور نہیں ہے۔ جس کے رد عمل کے طور پر یہ امر قدرتی ہے کہ ایک نیا نظام وجود میں آئے گا اور ہر طرح کی برائیوں اور تباہ کاریوں کے خلاف نبرد آزما ہو سکے گا۔ مراد یہ ہے کہ اہل یورپ نے جس طرح عالمی امن تباہ کرنے کے منصوبے بنا رکھے ہیں یہ منصوبے انہیں خود ہی لے ڈوبیں گے اور اس کے بعد ایک نیا نظام وجود میں آنا قدرتی امر ہے ایسا نظام جو عالمی سطح پر امن و سکون اور خوشحالی سے بہرہ ور کر سکے۔

⑩ اقبال نظم کو تمام کرتے ہوئے اس شعر میں فرماتے ہیں۔

ہر چند کہ حالات ناساز گار ہیں مخالفت کی تند و تیز آندھی پورے زور و شور کے ساتھ ماحول کو زیر و زبر کر رہی ہے تاہم میں نے اس کی پرواہ کئے بغیر اپنی فکر اور حکمت و دانش کا چراغ جلا رکھا ہے اس لئے کہ رب ذوالجلال نے مجھے وہ صلاحیت اور قوت بخشی ہوئی ہے کہ ہر طرح کی برائیوں اور نامساعد حالات کا مقابلہ کر سکوں۔

# 145 فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی!
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی!
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی!
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحرگاہی
اسی سے ہے ترے نخل کہن کی شادابی!
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی!

**معنی: شکر خوابی: میٹھی نیند۔**

پانچ اشعار پر مشتمل اس مختصر سی نظم میں اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں تصوراتی سطح پر فرشتوں کا حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اس مکالمے کی نشاندہی کی ہے جب کہ رب العزت نے حضرت آدم کو بہشت سے نکال کر اس لئے زمین پر بھیج دیا تھا کہ انہوں نے اس کی نافرمانی کی تھی۔ اس واقعہ کے ضمن میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اقبال نے خود بیشتر مقامات پر نظم و نثر میں اشارتاً اور کسی مقام پر تفصیل کے ساتھ بات کی ہے۔ یہ نظم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہاں انہوں نے اپنے اشعار میں اس تصوراتی اور تخیلی سطح پر مکالمے کو یوں پیش کیا ہے کہ!

① اے آدم! یہاں فردوس میں جو تو اس طرح مضطرب اور بیتاب رہتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجوہات ہیں؟ ہم نے تیرے بارے میں بہت سوچا لیکن یہ طے نہ کر سکے کہ تو خاک سے پیدا ہوا ہے یا پارے سے!

② شنید تو یہی ہے اور ارشاد خداوندی بھی یہ کہ تیری تخلیق مٹی سے کی گئی ہے لیکن تیری سرشت کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں تاروں اور چاند کی سی چمک دمک دکھائی دیتی ہے مراد یہ ہے کہ قدرت نے تجھے بے شک مٹی سے پیدا کیا جس کا تعلق زمین سے ہے لیکن تیری فطرت عملاً ارتقاء اور بلندیوں سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

③ خدائے عزوجل نے تجھ میں وہ صلاحیتیں اور کمالات ودیعت کیے ہیں کہ اگر تو خواب میں بھی ان کا تصور کرے تو یوں لگے گا کہ تیری میٹھی نیند عالم ہوش کی بیداریوں پر بھی فوقیت اور برتری رکھتی ہے۔

④ اے آدم! جب تو صبحدم بارگاہ خداوندی میں سربسجود ہو کر اس کے حضور گریہ و زاری کرتا ہے تو یہ بیش بہا عمل ہر عبادت سے افضل نظر آتا ہے کہ یہ عجز و انکسار کی انتہا ہے اور یہی عمل ہر لمحے نہ صرف یہ کہ تجھے تروتازہ رکھتا ہے بلکہ اسی سے تیرا ضمیر بھی مطمئن رہتا ہے اور روح کو سکون بھی نصیب ہوتا ہے۔

⑤ تیری صداؤں میں وہ کیف موجود ہے جو رازہائے زندگی کو بے نقاب کرتا ہے۔ ان میں وہ اسرار و رموز پوشیدہ ہیں جن سے افراد کو اپنی شناخت میں مدد ملتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تجھ میں جتنے بھی جوہر اور کمالات موجود ہیں وہ خدائے ذوالجلال کے عطا کردہ ہیں مزید یہ کہ ایسے جوہر اور کمالات قدرت نے کسی اور کو عطا نہیں کیے۔ اسی لئے تجھے کائنات کی ہر شے سے افضل و برتر قرار دیا گیا ہے۔

ابلیس لاکھ بغاوت پر آمادہ ہو اس کے باوجود وہ قطعی طور پر تیری ہمسری نہیں کر سکتا۔

# 146 روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ!
ایام جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ!
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے!
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے!
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے!
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے!
تعمیر خودی کر، اثر آہ رسا دیکھ!

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں!
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں!
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں!
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں!
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ!

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے!
تو جنس محبت کا خریدار ازل سے!
تو پیر صنم خانۂ اسرار ازل سے!
محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے!
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ!

**معنی:** بیم و رجا: خوف و امید۔ نالندہ: لفظی معنی رونے والا۔ مراد بجنے والا۔

یہ نظم عملاً اس سے پہلی نظم کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں بھی پہلی نظم کی طرح انسان کی عظمت و برتری کا اعتراف کیا گیا ہے۔ یہ نظم اس اعتبار سے بھی دلچسپ اور بعض نفسی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو کسی مقام پر ایک اجنبی کو درپیش ہوتے ہیں اور مقامی لوگ اس سلسلے میں اس کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ نظم عملاً پانچ بند پر مشتمل ہے جس کے پہلے بند میں روح ارض آدم سے کہتی ہے۔

## پہلا بند

اے آدم! تیرے لئے یہ زمیں یہ مقام اجنبی حیثیت کا حامل ہے۔ بہشت سے نکال کر خداوند تعالیٰ نے تجھے یہاں بھیجا ہے۔ ظاہر ہے کہ بہشت کا ماحول مختلف تھا۔ یہاں کی فضاء بھی مختلف ہے چنانچہ یہ میری ذمہ داری ہے کہ تجھے اس اجنبی فضا سے متعارف کراؤں لہٰذا اس کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ اپنی آنکھیں کھول کر اس زمین اس آسمان بلکہ ساری فضا کا بغور جائزہ لے۔ مشرق کی سمت سے طلوع آفتاب

کا نظارہ کر! اور تو نے جن جلووں کو بے پردہ دیکھا ہے اب پردوں میں بھی ان کا مشاہدہ کر اور یہاں زمین کے مصائب و آلام سے بھی آشنائی حاصل کر۔ اور سب سے اہم کہ کسی اضطراب اور بے چینی کے ساتھ قدرے سکون سے امید و ناامیدی کے منظر نامے کا جائزہ لے۔ اس لئے کہ یہ دنیا تو عملی جدوجہد کا دوسرا نام ہے جہاں امید اور ناامیدی دو متضاد مگر زندہ حقیقتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

## دوسرا بند

پہچان لے کہ یہ جو بادل اور گھٹائیں ہیں' یہ جو آسمان اور اس کے نیچے خاموش فضائیں موجود ہیں۔ یہ پہاڑ' صحرا' سمندر اور ہوائیں ہیں۔ یہ سب اب تیرے تصرف اور زیر اہتمام و انصرام ہیں۔ یہ نظارہ یوں بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ کل تو تیرا مسکن بہشت تھا لیکن اب تو زمیں پر مسند نشین ہو چکا ہے لہٰذا لازم ہے کہ یہاں کے شب و روز اور ماحول کا جائزہ لے۔ کہ یہاں کے مسائل اور مشکلات کا اندازہ ہو سکے۔

## تیسرا بند

اس بند میں اقبال فرشتوں کی جانب سے آدم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابھی تو تو اس دنیا میں نیا نیا وارد ہوا ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب یہاں کی ہر شے تیری عظمت کا لوہا ماننے پر مجبور ہو جائے گی۔ یہ زمانہ تیری آنکھوں کے اشاروں کو سمجھے گا اور فلک پر ستارے تجھے دور سے دیکھ کر رشک کریں گے۔ تیرے خیالات و تصورات میں اتنی وسعت ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ کسی مرحلے پر تیرے دل سے آہ بھی نکلی تو اس کا تاثر آسمان تک بھی پہنچ جائے گا لیکن اس کے لئے یہ امر لازم ہے کہ تو اپنی خودی کی تعمیر کرے پھر دیکھ تیری آہ کا اثر کہاں تک پہنچتا ہے۔

## چوتھا بند

تیرے سینے میں فکر کی جو چنگاری موجود ہے اس میں ساری دنیا کو منور کرنے والے آفتاب کی ضو پوشیدہ ہے۔ اور تجھ میں جو ہنر موجود ہے وہ ایک نیا جہان تخلیق کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے اس لئے کہ تو اور تیری حمیت مانگی ہوئی جنت قبول کرنے پر یقین نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ تیری جنت تو خود تیری صلاحیت اور محنت و مشقت میں پوشیدہ ہے چنانچہ اے خاک کے پتلے ہمت کر اور اپنی سعی پیہم کا صلہ حاصل کر لے۔

# پانچواں بند

ابتدائے آفرینش سے ہی تیری حیثیت مسلمہ ہے۔ اسی لیے سے محبت تیری روح میں رچی بسی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ کہ کائنات کے جملہ اسرار تیری ذہانت سے منکشف ہوئے ہیں اور آخری بات یہ کہ تو ابتداء سے ہی محنت و مشقت کا عادی اور خون پسینہ ایک کرنے والا ہے۔ مزید یہ کہ کسی کو آزار میں مبتلا نہیں کرتا اسی لئے تیری مرضی کے بغیر یہ دنیا بے معنی شے ہے۔

## پیر و مرید

147

### مرید ہندی

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں　علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں!

### پیر رومی

علم را بر تن زنی مارے بود!　علم را بر دل زنی یارے بود!

### مرید ہندی

اے امام عاشقان درد مند　یاد ہے مجھ کو ترا حرف بلند!
خشک مغز و خشک تار و خشک پوست!　از کجا می آید ایں آواز دوست!
دور حاضر مست چنگ و بے سرور!　بے ثبات و بے یقین و بے حضور!
کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا!　دوست کیا ہے دوست کی آواز کیا!
آہ یورپ! با فروغ و تاب ناک　نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوئے خاک

### پیر رومی

بر سماع راست ہر کس چیر نیست!　طعمہ ہر مرغکے انجیر نیست!

### مرید ہندی

پڑھ لیے میں نے علوم شرق و غرب　روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب!

### پیر رومی

دست ہر نا اہل بیمارت کند!　سوئے مادر آ کہ تیمارت کند!

### مرید ہندی

اے نگہ تیری مرے دل کی کشاد　کھول مجھ پر نکتہ حکم جہاد

پیر رومی

نقش حق را ہم با مرِ حق شکن بر زجاجِ دوست سنگِ دوست زن

مرید ہندی

ہے نگاہ خاوراں مسحور غرب! حور جنت سے ہے خوشتر حور غرب!

پیر رومی

ظاہر نقرہ گر اسپید است و نو دست و جامہ ہم سیہ گردد ازو!

مرید ہندی

آہ مکتب کا جوان گرم خون! ساحر افرنگ کا صید زبوں!

پیر رومی

مرغ پر نارستہ چوں پراں شود طعمہ ہر گربۂ دراں شود!

مرید ہندی

تا کجا آویزش دین و وطن جوہر جاں پر مقدم ہے بدن؟

پیر رومی

قلب پہلو می زند با زر بشب! انتظار روز می دارد ذہب

مرید ہندی

سر آدم سے مجھے آگاہ کر خاک کے ذرے کو مہر و ماہ کر!

پیر رومی

ظاہرش را پشہ آرد بچرخ باطنش آمد محیط ہفت چرخ!

مرید ہندی

خاک تیرے نور سے روشن بصر! غایت آدم خبر ہے یا نظر؟

پیر رومی

آدمی دید است، باقی پوست است دید آں باشد کہ دید دوست است

مرید ہندی

زندہ ہے مشرق تری گفتار سے امتیں مرتی ہیں کس آزار سے؟

پیر رومی

ہر ہلاک امت پیشیں کہ بود زانکہ بر جندل گمان بردند عود!

مرید ہندی

اب مسلماں میں نہیں وہ رنگ و بو سرد کیونکر ہو گیا اس کا لہو؟

پیر رومی

تا دل صاحب دلے نامد بدرد ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد!

مرید ہندی

گرچہ بے رونق ہے بازار وجود کون سے سودے میں ہے مردوں کا سود؟

پیر رومی

زیرکی بفروش و حیرانی بخر! زیرکی ظن است و حیرانی نظر!

مرید ہندی

ہم نفس میرے سلاطیں کے ندیم میں فقیر بے کلاہ و بے گلیم!

پیر رومی

بندہ یک مرد روشن دل شوی بہ کہ بر فرق سر شاہاں روی!

مرید ہندی

اے شریک مستی خاصان بدر میں نہیں سمجھا حدیث جبر و قدر

پیر رومی

بال بازاں را سوئے سلطاں برد بال زاغاں رابگورستاں برد

مرید ہندی

کاروبار خسروی یا راہبی؟ کیا ہے آخر غایت دین نبی؟

### پیر رومی

مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ

### مرید ہندی

کس طرح بیدار ہو سینے میں دل؟ کس طرح قابو میں آئے آب و گل؟

### پیر رومی

بندہ باش و بر زمیں رو چوں سمند! چوں جنازہ نے کہ بر گردن پرند!

### مرید ہندی

سر دیں ادراک میں آتا نہیں! کس طرح آئے قیامت کا یقیں؟

### پیر رومی

پس قیامت شو قیامت را بہ بیں! دیدن ہر چیز را شرط است ایں!

### مرید ہندی

آسماں میں راہ کرتی ہے خودی! صید مہر و ماہ کرتی ہے خودی!
بے حضور و با فروغ و بے فراغ! اپنے نخچیروں کے ہاتھوں داغ داغ!

### پیر رومی

آں کہ ارزد صید را عشق است و بس لیکن او کے گنجد اندر دام کس!

### مرید ہندی

تجھ پہ روشن ہے ضمیر کائنات کس طرح محکم ہو ملت کی حیات؟

### پیر رومی

دانہ باشی مرغ کانت برچنند! غنچہ باشی کو دکانت برکنند!
دانہ پنہاں کن سراپا دام شو! غنچہ پنہاں کن گیاہ بام شو!

### مرید ہندی

تو یہ کہتا ہے کہ دل کی کر تلاش طالب دل باش و در پیکار باش
جو مرا دل ہے مرے سینے میں ہے میرا جوہر میرے آئینے میں ہے

## پیر رومی

تو ہمی گوئی مرا دل نیز ہست　دل فراز عرش باشد نے بہ پست!
تو دل خود را دلے پنداشتی!　جستجوئے اہل دل بگذاشتی!

## مرید ہندی

آسمانوں پر مرا فکر بلند!　میں زمیں پر خوار و زار و درد مند
کار دنیا میں رہا جاتا ہوں میں　ٹھوکریں اس راہ میں کھاتا ہوں میں
کیوں مرے بس کا نہیں کار زمیں؟　ابلہ دنیا ہے کیوں دانائے دیں؟

## پیر رومی

آں کہ بر افلاک رفتارش بود　بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود!

## مرید ہندی

علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ؟　کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟

## پیر رومی

علم و حکمت زاید از نان حلال!　عشق و رقت آید از نان حلال!

## مرید ہندی

ہے زمانے کا تقاضا انجمن　اور بے خلوت نہیں سوز سخن!

## پیر رومی

خلوت از اغیار باید نے زیار　پوستیں بہر دے آمد نے بہار

## مرید ہندی

ہند میں اب نور ہے باقی نہ سوز!　اہل دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز!

## پیر رومی

کار مرداں روشنی و گرمی است　کار دوناں حیلہ و بے شرمی است

* یہ طویل نظم عملاً دو کرداروں پر محیط ہونے کے ساتھ فکری سطح پر بڑی اہم اور قدرے طویل نظم ہے۔ اس میں اقبال نے مولانا رومؒ اور ان کے ہندی مرید کے مابین ایک مکالمہ پیش کیا ہے۔ جو مولانا رومؒ کے فکر انگیز جوابات اور اسی طرح ان کے ہندی مرید کے استفسارات پر مشتمل ہے۔ مکالمے کا آغاز مرید ہندی کے استفسار سے ہوتا ہے۔ اقبال نے ساتھ ہی مثنوی مولانا روم کے بعض اشعار کی تشریح بھی کر دی ہے۔

## مرید ہندی

① حقیقت حال کو پرکھنے والی آنکھ سے آنسوؤں کی جگہ خون جاری ہے۔ اس لئے کہ عہد حاضر کی تہذیب اور علوم نے مذہب کی اہمیت گھٹا دی اور یوں دین کو خراب و خستہ کر کے رکھ دیا ہے۔ آپ کے نزدیک اس کا کیا علاج ہے۔

## پیر رومی

اگر تو علم کو محض جسمانی پرورش تک محدود رکھے گا تو وہ بلاشبہ سانپ بن کر ڈس لے گا۔ اس کے برعکس اگر تو علم کی وساطت سے باطن کو آراستہ کرے گا تو پھر وہ تیرا رفیق و مددگار ثابت ہو گا۔

مراد یہ ہے کہ علم اگر ظاہری آرائش و آسائش کے لئے استعمال ہو گا تو وہ عملاً غیر مفید اور نقصان دہ ثابت ہو گا۔ اس کے برعکس اگر علم کا مقصد باطن کی آراستگی ہو تو خواہ وہ مغربی علم ہی کیوں نہ ہو عالم انسانیت کے لئے باعث رحمت ہو گا۔ مغربی علوم کو دراصل منفی انداز میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس لئے وہ دینی نقطہ نگاہ سے خرابی کا سبب بن گئے ہیں۔

## مرید ہندی

② اے دردمند عشاق کے امام! مجھے آپ کا یہ قول بلند مرتبہ پوری طرح ازبر ہے کہ ساز کا مغز خشک ہوتا ہے۔ اس کے تار اور ڈھانچہ یہ سب خشک ہوتے ہیں پھر اس میں سے وہ نغمے کیسے برآمد ہوتے ہیں جو محبوب حقیقی کی یاد تازہ کرتے ہیں؟۔

موجودہ عہد محض آواز پرست ہے اسی لئے اسے کیف و سرور کا ادراک نہیں۔ نہ یہ راہ حقیق کا پرستار ہے۔ نا ہی اس میں یقین کا کرشمہ نظر آتا ہے اور نا ہی اسے حضوری کا ذوق نصیب ہے۔ اس صورت میں اسے اس راز سے کیا واسطہ کہ دوست کون ہے اور اس کی آواز سے کیا مراد ہے۔ ہرچند کہ اہل یورپ نے علم و فن میں کافی ترقی کر لی پھر بھی اس نے کوئی بلند مرتبہ حاصل نہیں کیا۔ اس کا ذوق سطحی ہے۔ نغمہ و ساز سے بھی اس نے استفادہ نہیں کیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

## پیر رومی

جس طرح انجیر کا میل ہر پرندے کی مرغوب غذا نہیں۔ اسی طرح موسیقی کا معاملہ ہے۔ اس سے لطف وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو حقیقی ذوق کا مالک ہو۔ بالفاظ دگر یہ یورپ کی بدنصیبی ہے کہ موسیقی سے حقیقی معنوں میں حظ نہ اٹھا سکا۔

## مرید ہندی

③ میں نے ہرچند کہ مشرق و مغرب کے بیشتر علوم کا مطالعہ کر لیا۔ اس کے باوجود محسوس کرتا ہوں کہ روح ابھی تک تشنہ ہے۔ ان سے میرے دکھ اور کرب کا مداوا نہیں ہو سکا۔ آخر اس کا کیا سبب ہے؟۔

## پیر رومی

طبیب ہو یا تیماردار، ہر نااہل شخص کا ہاتھ تجھے مزید بیمار کر دے گا۔ ماسوا یہی ہے جو حقیقی تیمارداری کی اہل ہے۔ اسی کی جانب متوجہ ہوا۔ مراد یہ ہے کہ محض علم و فنون سے روح کی تشنگی دور نہیں ہو سکتی نا ہی انسانی دکھ اور کرب کا مداوا ہو سکتا ہے۔ روح کی کسک تو اہل حق رفع کر سکتے ہیں جو اس کے اہل ہوں اور

جس میں ماں کی سی شفقت بھی ہو۔

## مرید ہندی

④ پیر و مرشد! آپ کی حکمت و دانش ہر لمحے میرے لئے مشعل راہ رہی ہے۔ از راہ کرم یہ فرمایئے کہ جہاد کی حقیقت کیا ہے؟ یہ نکتہ میرے ذہن میں ابھی تک لاینحل ہے۔

## پیر رومی

جہاد کی تعریف یہ ہے کہ خدا کے بنائے ہوئے نقش کو اسی کے حکم کے مطابق مٹا دیا جائے۔ بالفاظ دگر دوست کے آئینے پر اسی کے دیئے ہوئے پتھر سے وار کیا جائے۔ مراد یہ ہے کہ باطل کی قوتوں کے خلاف بحکم خداوند تعالیٰ حق پرستوں کا نبرد آزما ہونا ہی جہاد ہے۔ حالانکہ دونوں قوتیں رب العزت نے ہی پیدا کی ہیں لیکن اس کے فرمان کی تعمیل کے مطابق باطل کی قوتوں کے خلاف جہاد فرض اولین ہے۔

## مرید ہندی

⑤ اہل مشرق کی نگاہیں یورپی تہذیب اور اس کے ظاہری حسن و جمال سے خیرہ ہیں۔ انہیں تو یورپ کی حسین و جمیل عورتیں حوران جنت سے بھی زیادہ حسین لگتی ہیں۔

## پیر رومی

چاندی بظاہر چمکیلی' سفید اور نئی لگتی ہے جب کہ اس کے استعمال سے ہاتھ اور کپڑے سیاہ بھی تو ہو جاتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ چیزوں کی ظاہری حالت سے ان کی باطنی حقیقت اور افادیت کا اندازہ لگانا صریحاً غلط ہے۔ یورپی خواتین کتنی بھی پرکشش اور حسین و جمیل ہوں پھر بھی اگر وہ قلب و روح کے لئے چاندی کی طرح سیاہی کا باعث بنیں تو ان پر فریفتگی کار عبث ہے۔

## مرید ہندی

⑥ افسوس کہ ہماری درس گاہوں کے گرم خون نوجوان مغربی خواتین پر فریفتہ ہونے کے ساتھ انہی کی تہذیب اور طور طریقوں کو اپنا لیتے ہیں۔ اس کے بارے میں بھی کچھ ارشاد فرمایئے؟

## پیر رومی

جو پرندہ ابھی ننھا سا ہو اور پروں سے بھی محروم ہو اس کے باوجود اڑنے کی کوشش کرے گا تو قریب ہی تاک میں بیٹھی ہوئی بلی اسے یقیناً دبوچ لے گی اور وہ اس کا لقمہ تر بن کر رہ جائے گا۔

## مرید ہندی

⑦ یہ تو فرمایئے کہ مذہب اور وطن کے حوالے سے معرکہ آرائی کب تک جاری رہے گی۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ مذہب کی حیثیت جان کی ہے اور وطن کو جسم تصور کر لیا جائے تو اس صورت میں مذہب ہی اصل شے ہے مگر ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو جان پر جسم کو یعنی وطن کو مذہب پر فوقیت دیتا ہے۔ یہ مسئلہ کافی حد تک حل طلب ہے۔

## پیر رومی

شب کی تاریکی میں دیکھا جائے تو کھرے کھوٹے کی تمیز نہیں کی جا سکتی۔ سونے کی حقیقت تو شب کی

تاریکی میں نہیں دن کی روشنی میں بھی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ شب کو تو کھوٹا سکہ بھی کھرا سکہ لگتا ہے اور دونوں میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔

مراد یہ کہ عہد حاضر کی جو تعلیم ہے اس کی چمک نے نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ ذہنوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔ جب مطلع صاف ہو گا تو پتہ چل جائے گا کہ حقیقت کیا ہے۔ مذہب کھرا سکہ ہے یا وطنیت!

## مرید ہندی

⑧ یا حضرت! میں تو ایک ذرہ خاک ہوں۔ براہ کرم مجھے اس امر سے آگاہ کیجئے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اس حقیقت سے آگاہی مجھے مہر و ماہ کے ہم پلہ لانے کی مترادف ہو گی!

## پیر رومی

بظاہر انسان اس قدر کمزور اور بے حیثیت ہے کہ ایک معمولی سا مچھر بھی اس کی بے بسی کا سبب بن سکتا ہے اور دم بھر کے لئے چین نہیں لینے دے گا لیکن خدائے ذوالجلال نے باطنی سطح پر اس میں وہ صلاحیتیں پیدا کر دی ہیں کہ آسمانوں کی بلندیوں کو بھی چھو سکتا ہے۔

مولانا روم کے اس شعر کے پس منظر میں نمرود جیسے صاحب اقتدار بادشاہ اور پیغمبر آخر الزماں حضرت محمدؐ کی معراج کے واقعات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ کہ نمرود جیسے ظالم لیکن جلیل القدر بادشاہ کی موت کا سبب ایک معمولی سا مچھر تھا جب کہ حضورؐ نے بحیثیت انسان اور پیغمبر ہفت افلاک طے کر کے معراج کا رتبہ بلند حاصل کیا۔

## مرید ہندی

⑨ آپ تو ایسے صاحب حکمت و کرامت ہیں کہ اپنے نور سے مٹی کے پتلے کی آنکھیں روشن کر دی تھیں۔ مجھے اتنا بتا دیجئے کہ انسان کا مقصد اس جہان فانی میں حقیقتوں کا بالواسطہ علم حاصل کرنا ہے یا ان کو بلاواسطہ دیکھنا!۔

## پیر رومی

انسانیت کی حقیقت محض دیدار دوست ہے۔ باقی سب کچھ محض تکلف ہے اور دیدار سے یہ مراد ہے کہ محبوب حقیقی کے جمال سے آنکھوں میں روشنی آ جائے۔ مراد یہ ہے کہ عشق حقیقی سے ہی انسانی روح میں بالیدگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

## مرید ہندی

⑩ مشرق کے لوگ آپ کے کلام اور اس میں موجود حکمت و دانش سے زندگی کی حرارت اور تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ تو فرمایئے! وہ کون سے عوارض ہیں جن سے قومیں تباہ و برباد ہو کر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں اور ان کا وجود باقی نہیں رہتا؟

## پیر رومی

بے معنی شے اور غلط کاریوں کو حقیقت کے جوہر سے تعبیر کرنے والی قومیں کبھی زندہ نہیں رہ سکتیں نا ہی ترقی کے عمل سے گزر سکتی ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہر پتھر کو عود تصور کر لیا جائے تو یہ بصیرت کا نقص ہے۔ بے شک عود اور پتھر ملتی جلتی شباہت کے مظہر ہوتے ہیں لیکن عود کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے

جس مقام پر رکھ کر جلایا جائے تو وہ مقام معطر ہو جاتا ہے جب کہ یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جوہر ناشناسی بصیرت کی موت ہے اور جو قوم دانش و بصیرت کے جوہر سے محروم ہو جائے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

## مرید ہندی

11- یہ کیسے ہوا کہ مسلمانوں میں نہ وہ جذبہ باقی رہا نہ پہلی سی شان و شوکت اس کی قوت عمل اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ آخر کیوں سرد پڑ گیا۔

## پیر رومی

اس کا سبب یہ ہے کہ اب مسلمان سچائیوں اور حق پرستی سے محروم ہو گئے اور ان اہل حق کے لئے دل شکنی اور دکھ کا سبب بن گئے ہیں جنھوں نے ان کی رہنمائی کی اور اس عمل میں بے شمار مصائب سے دوچار ہوئے جب کہ مسلمان ان کی پیروی سے گریز کر رہے ہیں۔

## مرید ہندی

12- ہر چند کہ یہ دنیا عارضی قیامگاہ ہے اور اس کی رونق مفقود ہوتی جا رہی ہے لیکن یہ تو فرمایئے کہ ان حالات میں مردان حق کا کیا کردار ہونا چاہئے جس سے وہ موجودہ صورت حال میں بھی کامیاب زندگی گزار سکیں؟

## پیر رومی

مردان حق پر لازم ہے کہ عقل و دانش جو عملی سطح پر وہم و گمان سے ہم آہنگ ہیں۔ انہیں لوگوں میں تقسیم کریں اور حیرانی ان کے عوض حاصل کریں جو عشق اور معرفت کی مظہر ہے۔ یہی وہ عمل ہے جس سے مردان حق اس جہان عارضی میں کامرانی و بامراد ہو سکتے ہیں۔

## مرید ہندی

13- میرے تمام رفقا اور ہم جلیس تو بادشاہوں اور امراء کے مصاحب بن گئے ہیں۔ ایک میں ہی ایسا فرد ہوں جس کا سر کلاہ اور جسم لباس سے بھی محروم ہوئے یعنی میرے رفقا تو مصلحتوں اور موقعہ پرستی کے طفیل بلند مناصب پر پہنچ گئے لیکن چونکہ مجھ میں یہ صلاحیتیں موجود نہ تھیں اس لئے ہر نوع کی سہولت اور آسائش سے محروم رہا۔

## پیر رومی

اے عزیز! شاہوں اور امراء کے دربار میں اعزاز حاصل کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ تو کسی مرد حق اور روشن ضمیر سے اکتساب فیض کرے۔ کہ شاہوں اور امراء کے دربار تو خوشامدی اور منافقوں کی آماجگاہ ہوتے ہیں جب کہ مردان حق اور روشن ضمیر لوگوں کی صحبت اختیار کرنے والے لوگ ہر نوع کی شان و شوکت اور نمائش و مصلحت پرستی سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

## مرید ہندی

14- پیر و مرشد! آپ تو اس مرتبے کے مالک ہیں جو معرکہ بدر کے ان مجاہدین کو حاصل ہوا جو حضور ختمی مرتبتؐ کے خاص یار و مددگار تھے۔ آپ نے معرفت الٰہی کا اکتساب انہی کے اسوہ حسنہ سے کیا

لیکن مجھ میں اتنی صلاحیت نہیں کہ مسئلہ جبر و قدر کی حقیقت معلوم کر سکوں۔ براہ کرم اس سلسلے میں میری رہنمائی کیجئے!

**پیر رومی**

شاہین اور کوے میں قدر مشترک یہ ہے کہ رب ذوالجلال نے دونوں کو پرواز کے لئے پر عطا کئے ہیں لیکن شاہین کو صاحب اختیار لوگ پالتے ہیں کہ ان کو دوسرے پرندوں کے شکار کے لئے استعمال کریں جب کہ کوا مردہ شکار سے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا ہے یعنی شاہین کو بال و پر شاہوں اور امراء کے دربار تک لے جاتے ہیں جب کہ اسی نوع کے بال و پر کوے کو قبرستان کا راستہ دکھاتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ ایک اپنی بلند ہمتی اور اعلیٰ ذوق کے سبب انتہائی اعزاز اور مرتبے سے سرفراز ہوتا ہے جب کہ اس کے مقابل دوسرا اپنی پست ہمتی اور کور ذوقی کے باعث ذلت و رسوائی کے ساتھ پستی میں گر جاتا ہے۔ دونوں اپنے کردار و عمل کے حوالے سے اچھے یا برے مقام کے حقدار ہوتے ہیں۔

**مرید ہندی**

15- یہ فرمایئے! کہ پیغمبر اسلام حضور سرورؐ کائنات نے جو دین رائج کیا اس کی بنیادی طور پر غرض و غایت کیا ہے۔ کیا اس سے بادشاہی اور حکمرانی مراد ہے یا ترک دنیا اور رہبانیت اس کا مقصود ہے؟۔

**پیر رومی**

اسلام کی تعلیمات اور ان کی روح کے مطابق نا تو شاہی اور غیر ضروری شان و شوکت ہی قابل قدر عمل ہے نا ہی یہ کہ انسان ترک دنیا کر کے پہاڑوں اور غاروں میں پناہ گزیں ہو جائے اور رہبانیت اختیار کر لے۔ دین اسلام تو جدوجہد اور عمل سے عبارت ہے کہ عشق حقیقی کے حصول اور اپنی منزل تک رسائی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی جائے۔ یہی دین نبیؐ کی غرض و غایت اور مقصد ہے۔

**مرید ہندی**

16- ازراہ عنایت یہ بھی بتا دیجئے کہ پانی اور مٹی جیسے عناصر پر غلبہ حاصل کر کے مادی اور جسمانی خواہشات پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے کہ اس کے بغیر نہ تو دل بیدار ہو سکتا ہے نا ہی زندگی کے قالب میں نئی روح پھونکی جا سکتی ہے؟

**پیر رومی**

رب العزت کے احکام کی پیروی اسی طرح کر! جیسے زمین پر گھوڑا اپنے سوار کے اشارے پر چلتا ہے۔ جدوجہد اور عمل سے گریز نہ کر! اور دوسروں کا اس طرح دست نگر نہ بن جس طرح کسی فرد کا جنازہ دوسروں کی گردن کا بوجھ بن جاتا ہے۔ یہی عوامل ہیں جن کے ذریعے زندگی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔

**مرید ہندی**

17- میری سمجھ میں تو آج تک دین کا بھید ہی نہیں آیا پھر قیامت پر کس طرح سے یقین آ سکتا ہے؟

**پیر رومی**

تو خود عملاً قیامت بن جا۔ اپنی ذات میں ایسا انقلاب پیدا کر لے جو قیامت کے ضمن میں متوقع ہے۔ اس کے بعد تجھے خود بخود قیامت کا یقین آ جائے گا اور یہ معرفت بھی حاصل ہو جائے گی کہ دین کیا ہے اور پھر قیامت کیا ہے۔

**مرید ہندی**

18- جب خودی اپنے انتہائی عروج تک جا پہنچتی ہے تو اس کی رسائی آسمانوں تک ہو جاتی ہے جہاں پہنچ کر وہ چاند اور سورج کو بھی اپنے زیر نگیں کر لیتی ہے۔ مراد یہ کہ جذبہ خودی کا اوج کمال تک پہنچنا افلاک سے لے کر سورج اور چاند پر گرفت حاصل کرنے کے مترادف ہے! لیکن جب اسے بارگاہ خداوندی میں حضوری کا شرف حاصل نہیں ہوتا اور فراغت میسر نہیں آتی تو اپنے افکاروں کے ہاتھوں ہی پریشان حالی میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

**پیر رومی**

اگر شکار کے لائق کائنات میں کوئی شے ہے تو وہ عشق حقیقی ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ عشق حقیقی تو ہر حال میں کسی کی بھی پہنچ سے باہر ہے۔ وہ کس طرح کسی کے جال میں سما سکتا ہے۔

**مرید ہندی**

19- پیر و مرشد آپ پر تو پوری طرح واضح ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے۔ اتنا بتا دیجئے کہ قومی زندگی کے استحکام کے لئے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟

**پیر رومی**

اگر تو تخریب کاروں کی گرفت سے بچنا چاہے تو اپنی ذات کو محفوظ رکھ! اس صورت میں جو بھی تیرا تعاقب کرے گا خود ہی تیرے جال میں پھنس کر رہ جائے گا۔ اگر تیری ہیئت دانے کے مانند ہو تو ظاہر ہے کہ اسے پرندے کب چھوڑیں گے۔ کلی کی شکل اختیار کر لے تو چھوٹے چھوٹے بچے تجھے نوچ پھینکیں گے۔ اس صورت میں لازم ہے کہ اپنا بسیرا کسی ایسی بلندی پر استوار کر جو دوسروں کی دسترس سے باہر ہو۔ قوموں کا استحکام اسی صورت میں ممکن ہے کہ اپنے دفاع کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کر لی جائیں!

**مرید ہندی**

20- پیر و مرشد! یہ خود آپ ہی کا ارشاد ہے کہ دل کو تلاش کر! اور آپ ہی کا فرمان ہے کہ دل کا طلبگار رہ! اور اس ضمن میں جو رکاوٹیں درپیش ہوں ان کی مزاحمت کے لئے مستعد رہ! جب کہ میرا دل تو خود میرے سینے میں موجود ہے اور مجھ میں جو جوہر موجود ہے وہ اسی آئینے میں فروزاں نظر آتا ہے؟

**پیر رومی**

مانا کہ تیرے سینے میں بھی دل موجود ہے لیکن اس حقیقت کو جان لے کہ دل محض اس گوشت کے ٹکڑے کو نہیں کہتے جو ہر انسان کے پہلو میں دھڑکتا رہتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ دل کا حقیقی مقام عرش معلی ہے نہ کہ وہ پستی میں رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر دل کا تعلق تو بالواسطہ طور پر رب العزت سے ہے نہ کہ اس عالم فانی سے! جہاں تک میرے قول کا تعلق ہے تو نے اسے غلط سمجھا ہے اور اسی پس منظر میں

اپنے دل کو روایتی دل تصور کر لیا ہے۔ میرا نقطہ نظر یہ تھا کہ اہل دل کو تلاش کر! اور المیہ یہ ہے کہ وہ تلاش تو نے ترک کر دی ہے۔

**مرید ہندی**

21- مری فکر اتنی بلند ہے کہ اس کا رابطہ آسمانوں کے ساتھ ہے اس کے باوجود مقام عبرت ہے کہ میں خود زمین پر خوار و خستہ اور غمزدگی کے عالم میں بیٹھا ہوں! سچ تو یہ ہے کہ میں دنیاوی کاروبار کے لئے اہل ثابت نہیں ہو سکا۔ اسی لئے اس راہ میں ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ اتنا بتا دیجئے کہ دنیا کا کاروبار کیوں میرے بس کا نہیں! اور میں کیوں اس کو انجام دینے میں ناکام رہا ہوں۔ یہ فرمایئے! کہ جو شخص دین کی حقیقتوں سے کلی طور پر آگاہ ہے وہ دنیوی کام سے کیوں ناواقف ہے؟

**پیر رومی**

پہلے یہ امر ذہن نشین کر لے کہ جو شخص آسمانوں پر بے تکلف پرواز کرتا رہتا ہے اس کے لئے زمین پر چلنا پھرنا کیسے مشکل ہو سکتا ہے۔

**مرید ہندی**

22- یہ فرمایئے کہ مجھے علم و حکمت کا سراغ کس طرح سے مل سکتا ہے۔ سوز و گداز' درد اور داغ کس طرح دستیاب ہو سکتے ہیں کہ عشق کے اوصاف یہی عوامل تو سمجھے جاتے ہیں؟

**پیر رومی**

علم' حکمت' سوز و گداز اور عشق عملاً حلال کی روزی کمانے کے عمل سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ جان لے! کسب حلال کرنے والا شخص ان نعمتوں کا سزاوار ہے۔

**مرید ہندی**

23- ہر عہد کا تقاضا یہی رہا ہے کہ لوگوں سے میل جول رکھا جائے تاکہ انسان تنہائی اور گوشہ گیری پر مائل نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ تنہائی اور گوشہ گیری کے بغیر تخلیقی عمل میں سوز و گداز پیدا ہونا ممکن نہیں!

**پیر رومی**

اس حقیقت کو جان لے! کہ خلوت اور گوشہ گیری غیروں سے چاہیے تاکہ اپنوں سے! پھر پوستین موسم سرما کا لباس ہے کہ موسم بہار کا؟

**مرید ہندی**

24- ہندوستان کا المیہ یہ ہے کہ یہ خطہ ارض ان لوگوں سے خالی ہو گیا ہے جو روشن دماغ اور دل میں سوز و گداز رکھتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ اہل دل اب بدبختی کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں؟

**پیر رومی**

مردان حق کی صفت یہ ہے کہ لوگوں میں ایمان کی روشنی اور عشق کا سوز و گداز پیدا کریں جب کہ کم ظرف لوگ فطرتاً بہانہ جوئی اور بے غیرتی کے حامل رہیں گے تاہم ان کے رویوں کے پیش نظر مردان حق کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں زیادہ سرگرمی سے مصروف ہو جانا چاہیے تاکہ انہیں اطمینان قلب حاصل ہو سکے!

148

# جبریل و ابلیس

## جبریل

ہمدم دیرینہ! کیسا ہے جہان رنگ و بو؟

## ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجوے و آرزو!

## جبریل

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو؟

## ابلیس

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو!
اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوز درون کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لا تقنطوا؟

## جبریل

کھو دیے انکار سے تو نے مقامات بلند
چشم یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

## ابلیس

ہے مری جرات سے مشت خاک میں ذوق نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو!
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط! اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو!

*

معانی: کاخ و کو: محل اور کوچے۔ **نقطوا**: تم ناامید ہو۔ **لاتقنطوا**: تم نہ امید نہ ہو۔ **تار و پو**: تانا بانا۔

یہ نظم حضرت جبریلؑ اور ابلیس کے مابین ایک مکالمے پر مشتمل ہے۔ دونوں فرشتے بارگاہ ایزدی میں مقربین خاص کے طور پر شمار ہوتے تھے جب کہ ابلیس، خدائے پاک کی نافرمانی پر راندہ درگاہ قرار دیا گیا۔ سب جانتے ہیں کہ اس نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جبریلؑ آج بھی باری تعالیٰ کے مقربین خاص میں شمار ہونے والا فرشتہ ہے۔ دونوں کے مابین اقبال نے ان کے کرداروں کے پس منظر میں تخیلی سطح پر یہ مکالمہ ترتیب دیا ہے۔ چنانچہ مکالمے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

## جبریل

ابلیس سے مخاطب ہو کر جبریل کہتے ہیں! تو میرا یار قدیم ہے یہ بتا وہ جہان رنگ بو کیسا ہے جسے دنیا کہا جاتا ہے اور جہاں اب تیری بود و باش ہے۔

## ابلیس

وہاں کی زندگی اور ماحول میں سوز و ساز، درد و داغ، جستجو اور آرزو کے سوا اور کیا رکھا ہے؟

## جبریلؑ

اے ابلیس! جان لے کہ آسمان پر اکثر و بیشتر تیرا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کر کے تو نے احکام خداوندی سے انحراف کر کے جو گناہ کیا ہے کیا اس امر کا امکان نہیں کہ تو اپنی غلطی کو تسلیم کر لے تاکہ رب ذوالجلال تجھے معاف کر کے تیرے پرانے منصب پر فائز کر دے۔

## ابلیس

جبریلؑ! تو میرا ہم جلیس ہونے کے باوجود اس کیف و سرمستی سے لطف اندوز ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا جو میں نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر کے حاصل کی ہے نا ہی تو اس راز سے آگاہ ہو سکتا ہے جس سے میں اب واقف ہو چکا ہوں۔ میں اب اس نشے میں غرق ہوں جو کسی طور بھی نہیں اتر سکتا۔

میں تو اب اس ماحول میں رچ بس گیا ہوں جہاں ہر لمحے محلات کیا عام گلی کوچوں میں بھی انتہائی جوش و خروش کے ساتھ زندگی رواں دواں رہتی ہے اور جس کا ہر فرد اپنی اپنی سرگرمیوں اور دلچسپیوں میں مصروف رہتا ہے۔ جب کہ تو ابھی تک اس پر سکوت فضاء اور سناٹے تک محدود ہے جو فرشتوں اور قدسیوں کے لئے تو سازگار ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے نہیں جنہیں زندگی سے پیار ہے۔ میں بے شک اپنی نافرمانی کے سبب فرشتوں پر ودیعت کردہ عنایتوں سے تو محروم ہو گیا ہوں لیکن اب پوری زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں اس صورت میں خدا کی رحمت بہتر ہے کہ اس رحمت سے محرومی؟

## جبریلؑ

تو نے تو حکم ربی کی تعمیل سے انکار کر کے نہ صرف یہ کہ اپنے بلند مراتب کھوئے بلکہ اپنی راہ میں کانٹے بھی بو لئے! لیکن تیرا یہ عمل صرف تیری ہی ذات تک محدود نہیں بلکہ پروردگار کی نظروں میں تو اب شاید دوسرے فرشتوں کا بھی عمل مشتبہ ہو کر رہ گیا ہو گا۔

## ابلیس

میری جراءت مندی کے سبب تو ارض خاک کے باسیوں میں وہ جذبہ پیدا ہوا جو ان کے لئے حقیقی اور مسرت افزاء زندگی گزارنے کا سبب بنا۔ پھر میرا کردار جسے فتنہ سازی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہی تو عقل و دانش کا سرچشمہ ہیں۔ جہاں تک تیرا تعلق ہے تو تو ایک ایسا تماشائی ہے جو نیکی و بدی کے مابین معرکہ آرائی کو ایک پرسکون مقام پر کھڑے ہو کر اس کا نظارہ کرتا ہے جب کہ میں تو اس معرکہ آرائی کے طوفان میں بری طرح سے تھپیڑے کھا رہا ہوں!

میں نے جو طوفان برپا کئے ہیں انہوں نے حضرت خضرؑ اور حضرت الیاسؑ جیسے اولوالعزم پیغمبروں کو بھی بے دست و پا کر کے رکھ دیا ہے۔ اب اگر بارگاہ ایزدی میں کبھی خلوت نصیب ہو تو یہ ضرور استفسار کرنا کہ

حضرت آدمؑ کے واقعہ کو کس نے قربانی دے کر لہو رنگ کیا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو یہ حقیقت ہے کہ اپنی نافرمانی کے سبب دل یزداں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا ہوں اور تیرا کیا ہے تو تو ابھی تک اللہ ہو اللہ ہو کی ہر لحہ گردان میں مصروف ہے۔

## 149 اذان

اک رات ستاروں سے کہا نجم سحر نے
آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار؟
کہنے لگا مریخ ادا فہم ہے تقدیر
ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار
زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں کیا؟
اس کرمک شب کور سے کیا ہم کو سروکار!
بولا مہ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی
تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار!
واقف ہو اگر لذت بیداری شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پراسرار!
آغوش میں اس کی وہ تجلی ہے کہ جس میں
کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار!
ناگاہ فضا بانگ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دل کہسار!

اقبال نے ہر موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی فکر اور حکمت و دانش کے حوالے سے جو جادو جگایا ہے اس پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے لیکن اس کی تمامتر خیال آرائی اور فکر کا بنیادی کردار ہمیشہ اور ہمیشہ انسان ہی رہا ہے۔ زیر تشریح نظم کا مرکزی خیال "اذان اور شب بیداری" جیسے معاملات کا احاطہ کئے ہوئے ہے تاہم اس میں دلچسپی چاند اور ستاروں کے مکالمات سے پیدا کی گئی ہے۔ سات اشعار پر مشتمل یہ ایک مختصر مگر بڑی جامع نظم ہے۔ فرماتے ہیں۔

① اقبال نے اپنے موضوع کے حوالے سے اظہار کے لئے جو فضاء تخلیق کی ہے اس میں چاند اور بعض ستارے اہم کردار بن کر سامنے آتے ہیں تاہم اس موضوع کا مرکز و محور انسان ہی ہے۔ اس شعر کے مطابق ایک شب ستارہ صبح دوسرے ستاروں سے استفسار کرتا ہے کہ باری تعالیٰ نے ہمارے لئے تو شب بیداری مقدر کر دی ہے۔ رات کی تاریکی میں ہماری روشنی پوری کائنات کو جگمگاتی رہتی ہے لیکن انسان کو جو رتبہ بلند عطا کیا گیا ہے کیا تم نے اسے بھی کبھی اپنی طرح ساری ساری رات تک بیدار اور مصروف کار دیکھا ہے؟

② سب سے پہلے "ستارہ صبح" کے سوال کا جواب دیتے ہوئے مریخ نے کہا کہ قدرت بڑی حقیقت شناس ہے۔ انسان بلا شک و شبہ ایک چھوٹے سے فتنہ کے مانند ہے جس کا سویا رہنا ہی بہتر ہے۔ وہ بیدار ہے تو نہ جانے کیا کیا قیامت ڈھاتا رہے۔

③ زہرہ نے یہ گفتگو سنی تو بولا تمہارے پاس اظہار خیال کے لئے کیا کوئی اور موضوع نہیں ہے۔ انسان سے ہمیں آخر کیا لینا ہے۔ اس کی حیثیت تو ایک ایسے کیڑے کی سی ہے جو شب کی تاریکی میں بصارت سے محروم رہتا ہے پھر وہ اگر رات کو بیدار بھی رہے تو اس سے کیا حاصل ہو گا۔

④⑤⑥ ستارہ صبح، مریخ اور زہرہ کا مکالمہ جس لمحے مہ کامل کے گوش گزار ہوا تو زمین سے دوسرے ستاروں یک نسبت زیادہ قربت اور انسان کی فطرت سے نسبتاً زیادہ آگاہی کے سبب وہ گفتگو میں مداخلت

کرتے ہوئے یوں گویا ہوا کہ انسان تو عملی سطح پر زمین کو تابندہ کرنے والے ستارے کی مانند ہے۔ تم اگر رات کے وقت چمکتے ہو تو وہ دن میں درخشاں رہتا ہے۔ یہ جان لو کہ اگر کہیں وہ بیداری شب کی لذت سے آگاہ ہو جائے اور اسے پتہ چل جائے کہ رات کو جاگنے میں کیا لطف حاصل ہوتا ہے تو اس کا مرتبہ ثریا سے بھی زیادہ بلند ہو جائے۔ مت بھولو کہ اس خاک کے پتلے میں ایسا پوشیدہ نور موج زن ہے کہ اگر کسی مرحلے پر اس کا ظہور ہو جائے تو تم سمیت آسماں پر چمکنے والے تمام ستارے اور سیارے اس کے سامنے ماند پڑ جائیں اور اس کے جلووں میں دفن ہو کر رہ جائیں۔

⑦ یہ مکالمہ جاری تھا کہ ساری فضا صبح کی اذان کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ ایسی گونج تھی جس سے پہاڑ بھی دہل اٹھتے ہیں گویا اس خدائی پیغام کے ساتھ انسان کو عبادت کے لئے بیدار ہونے کا حکم مل گیا اور مکالمہ کرنے والے ستارے بھی اس راز سے آگاہ ہو گئے کہ انسان کو مخلوقات میں اسی لئے اشرف قرار دیا گیا ہے کہ احکام الہی کے تحت سوتا ہے اور انہی کے تحت بیدار ہوتا ہے۔

## 150 محبت

شہید محبت نہ کافر نہ غازی! محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی!
وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی!
یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی!
نہ محتاج سلطاں نہ مرعوب سلطاں محبت ہے آزادی و بے نیازی!
مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

**معنی: غزنوی**: سلطان محمود غزنوی۔ **ایازی**: ایاز سلطان محمود غزنوی کا غلام اور عہدہ دار تھا۔ **شیشہ بازی**: فریب کاری۔ **مرعوب**: رعب میں آیا ہوا۔ ڈرا ہوا۔ **اسکندری**: بادشاہی اس لئے کہ سکندر بہت بڑا بادشاہ تھا۔ **آئینہ سازی**: لفظی معنی آئینہ بنانا۔

دنیا کے مختلف مفکرین اور ماہر نفسیات اس کلیے پر مکمل اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ محبت کا جذبہ دوسرے تمام جذبوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اقبال بھی اس نقطہ نظر سے متفق نظر آتے ہیں۔ زیر تشریح نظم کے علاوہ ان کے کلام میں جہاں کہیں بھی محبت کا ذکر آیا ہے۔ اسی حوالے سے آیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

① محبت کا جذبہ عملاً تمام حدود سے متجاوز نظر آتا ہے۔ مذہب، قوم، ملک، نسل، فرقہ بندی اور دوسرے عوامل سے محبت بے نیاز رہی ہے۔ اس جذبے میں نہ عقیدہ کو دخل ہے نہ کوئی روایت اور رسم اس کی پاسداری کرتی ہے۔ محبت کے عمل میں قربانی دینے والا نہ تو شہید ہوتا ہے نا ہی اسے کافر اور غازی جیسے خطابات سے نوازا جا سکتا ہے نا ہی کسی نسلی بنیاد پر اس کی شناخت ممکن ہے۔

② اس شعر میں ایک اہم راز سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ محمود غزنوی اور اس کے پسندیدہ غلام ایاز کے مابین جو رشتہ تھا وہ کچھ اور تو ہو سکتا ہے اسے جذبہ محبت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس تعلق کو اقبال کے نقطہ نظر کی روشنی میں واضح کیا جائے تو بات جنس اور نفس پرستی تک جا پہنچتی ہے۔

③ نظم کے ہر دو اشعار میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اس کے باوجود زیر تشریح شعر میں اس امر کو واضح کر دیا گیا ہے کہ علم اور حکمت میں اگر محبت کا جوہر شامل نہ ہو تو انہیں فریب کاری اور مکاری کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مراد یہ ہے کہ علم و حکمت عملاً انسانی بہبود و ترقی کے ساتھ شعور و دانش سے ہم آہنگ ہیں۔ تاہم یہ اسی وقت فروغ پا سکتے ہیں کہ یہ محبت کے جوہر سے آراستہ ہوں۔ اس کے بغیر علم و حکمت بے معنی شے ہیں۔

④ محبت کا جذبہ نہ کسی بادشاہ کا محتاج ہوتا ہے نا ہی اس کا پابند! اس کے برعکس محبت تو تمام علائق دنیوی سے آزادی اور بے نیازی کا نام ہے۔

⑤ میرا فقر اور خلق خدا سے محبت کا جذبہ عملاً سکندر اعظم جیسے پرشکوہ بادشاہ کی عظمت اور جاہ و جلال سے بھی بہتر اور بلند تر ہے کہ اول الذکر میں مخلوق کی بہتری اور اس کی تربیت کا جذبہ مضمر ہے اور ثانی الذکر تصنع اور بناوٹ کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہاں اقبال کے سکندر اور آئینہ سازی کے ضمن میں جو اشارے کئے ہیں ان کا پس منظر وہ تاریخی آئینہ ہے جو سکندر نے اسکندریہ کے مقام پر سمندر میں ایستادہ مینار میں نصب کرایا تھا کہ رات کی تاریکی میں یہاں سے گزرنے والے جہازوں کی رہنمائی ہو سکے۔

## ستارے کا پیغام

151

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

(41) اقبال کہتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آسمان پر جو ستارہ چمک رہا ہے وہ انسان کو کچھ اس طرح کا پیغام دیتا ہے کہ میری فطرت میں چونکہ پاکیزگی اور تابندگی موجود ہے اس لئے اگر فضا پر تاریکی کا تسلط ہو جائے پھر بھی میں اس سے خوفزدہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ میں تو خود اس نوع کی تاریکی کا سینہ چیر کر فضا کو منور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔

اسی حوالے سے ستارہ شب کو سفر کرنے والے مسافر سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ اگر تجھے اپنے وجود کو برقرار رکھنا ہے تو میری طرح اپنی ذات میں وہ صلاحیت پیدا کر جو کسی دوسرے کے سہارے کے بغیر تیرے لئے روشن چراغ کی طرح رہنمائی کا سبب بن سکے اور اس کے لئے یہ امر بھی ضروری ہے کہ تیرے جگر کا داغ شمع کے مانند تیری تاریک رات کو روشن کر دے۔

مراد یہ ہے کہ عشق حقیقی بھی ایک روشن ستارے کے مانند ہے جو ماحول کو خواہ وہ کتنا بھی تیرہ و تار ہو تابناک بنا سکتا ہے۔

## جاوید کے نام

152

(لندن میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر)

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر!
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر!
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر!

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں | سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر!
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر | مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر!
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے! | خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر!

**معنی:** سفال: مٹی کا برتن۔ مٹی۔

پانچ اشعار پر مشتمل یہ نظم بقول اقبال انہوں نے اس خط کے جواب میں لکھی جو ان کے بیٹے جاوید نے باپ کے نام تحریر کیا تھا۔ یہ جاوید کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط تھا جو اقبال کو لندن میں موصول ہوا۔ یہ بات دل کو لگتی ہے کہ بظاہر یہ نظم انہوں نے بیٹے کے نام ہی لکھی ہے لیکن بغور دیکھا جائے تو وہ اس میں ملت اسلامیہ کے تمام نوجوانوں سے مخاطب نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

① تیرے لئے اے بیٹے لازم ہے کہ علم اور عملی جدوجہد کے ذریعے معاشرے میں اپنی شناخت کرائے اور وہ مرتبہ حاصل کرے جو عزت و احترام کا حامل ہے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ قدیم روایات کو ترک کر کے خود کو نئی اور مثبت جہتوں سے ہم آہنگ کرے۔

② خدا کرے تجھے وہ فطرت شناس دل عطا ہو کہ تو ان اشیا کی باتیں بھی جان سکے گا جو قوت اظہار سے محروم ہیں اور لالہ و گلاب جیسے پھولوں کی خامشی بھی تیرے لئے کلام بن جائے گی۔

③ اے فرزند! یورپ کے علوم و فنون اور وہاں کی تہذیب کو بھی حرف آخر تصور نہ کر کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں! تجھے عروج حاصل کرنا ہے تو اپنی تہذیب اور اپنے ہی وطن کے طور طریقوں کے علاوہ علوم و فنون سے وابستگی پیدا کر! کہ یورپ کی تہذیب مصنوعی اور ناپائیدار ہے اور مشرق کے علم و فن اور تہذیب میں وطن کی مٹی کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔

④ میں نے اپنے اشعار میں جو اسرار و رموز بیان کئے ہیں ان کی معرفت حاصل کر کے پوری طرح ذہن نشین کر لے اور انہی پر کاربند ہو جا۔

⑤ میرا طرز عمل امارت کی بجائے سے عبارت ہے۔ تیرے لئے بہتر ہے کہ یہی راستہ اختیار کر لے۔ نا ہی اپنی خودی کا سودا کر! یہی وہ نکتہ ہے کہ تو غربت میں بھی نام پیدا کر سکتا ہے۔

## 153 فلسفہ و مذہب

یہ آفتاب کیا یہ سپہر بریں ہے کیا؟ | سمجھا نہیں تسلسلِ شام و سحر کو میں
اپنے وطن میں ہوں کہ غریب الدیار ہوں؟ | ڈرتا ہوں دیکھ دیکھ کے اس دشت و در کو میں!
کھلتا نہیں مرے سفرِ زندگی کا راز | لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں!
حیراں ہے بو علی کہ میں آیا کہاں سے ہوں | رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں!
"جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ | پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

**معنی:** سپہر بریں: بلند آسمان۔ **غریب الدیار:** پردیسی مسافر۔

فلسفہ اور مذہب کے مابین کیا فرق ہے۔ اپنے مقاصد کے اعتبار سے یہ تقابلی سطح پر تضادات کے شکار کیوں ہیں۔ ان کے مقاصد میں کیا فرق ہے؟ ان کا تجزیہ کیا جائے تو جاننے میں بالعموم زیادہ قباحت محسوس نہ ہوگی کہ فلسفہ اصولی طور پر اشیاء کی تخلیق اور ان کے وجود کی غرض و غایت کے بارے میں تعقل اور

استدلال کے حوالے سے جاننے کا علم ہے جب کہ خالص عقیدے بلکہ ایک طرح سے اندھے عقیدے یقین اور ایمان ایک طرح سے مذہب کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اقبال نے اپنی اس نظم میں جس خوبی کے ساتھ فلسفہ اور مذہب کے مابین جو حد فاصل ہے اس کا تجزیہ کیا ہے وہ انتہائی فکرانگیز ہے۔ ان کے نزدیک بو علی سینا فلسفیوں کی نمائندہ کرتے ہیں اور مولانا روم کو مذہب کے ترجمان ہیں زیر تشریح نظم کے چوتھے شعر میں انہوں نے اس جانب اشارہ بھی کیا ہے۔ اس پس منظر کے حوالے سے یہ عجیب بات دیکھنے میں آتی ہے کہ اجتماعی سطح پر ان اشعار میں ایک تذبذب کی کیفیت موجود ہے اور ان کا شاعر ایک سوالیہ نشان کی صورت میں دوراہے پر کھڑا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

① یہ سورج جو علی الصبح برآمد ہوتا ہے اور شام کو غروب ہو جاتا ہے اور یہ آسمان جو کرہ ارض پر چھایا ہوا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہی کیفیت شام و سحر کے مابین جو سلسلہ ہے اس کی ہے۔

② یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس مقام پر جہاں میں بود و باش اختیار کئے ہوں اپنے وطن سے تعبیر کروں یا یہ سمجھوں کہ میرا کوئی وطن اور گھر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے صحرا اور گھر مجھے ایک انجانے خوف میں مبتلا رکھتے ہیں۔

③ ہر چند کہ میرا سفر جاری ہے اور زندگی کی جو مسافت ہے اسے طے کر رہا ہوں لیکن اس کے اغراض و مقاصد سے بے بہرہ ہوں۔ دکھ تو یہ ہے کہ کوئی ایسا صاحب فکر رہنما بھی نہیں ملتا جو حقائق سے روشناس کرا سکے اور یہ باور کرا سکے کہ زندگانی کا بنیادی مقصد کیا ہے اور میرے وجود کی غرض و غایت کیا ہے؟ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں فلسفیوں کی سوچ ایک سوالیہ نشان میں ڈھل جاتی ہے۔

④ چنانچہ جب ممتاز فلسفی حکیم بو علی سینا کے تصورات پر نظر پڑتی ہے تو انسانی وجود اور اس کی غرض و غایت کے سلسلے میں کوئی واضح نقطہ نظر نہیں رکھتے بلکہ اس مسئلے پر حیران و پریشان نظر آتے ہیں۔ سو وہ فلسفی اور دانشور خود ہی حیرانی اور تذبذب کا شکار ہو وہ کسی کی رہنمائی کیسے کر سکتا ہے۔ دوسری طرف ممتاز دانشور اور ممتاز شاعر مولانا روم ہیں وہ خود صحیح راہ اور حقیقی منزل کے لئے سرگرداں نظر آتے ہیں۔ سو ان سے یہ توقع عبث ہے کہ حتمی سطح پر عقدہ کشائی کر سکیں۔

⑤ نظم میں شامل یہ شعر میرزا غالب کا ہے اور اقبال نے اپنی مخصوص سوچ کے باوجود تھوڑے سے اجتہاد کے ساتھ اسی شعر سے رہنمائی حاصل کی ہے۔ ساتھ ہی اس کے ذریعے وہ ایک منطقی نتیجے پر بھی اس طرح پہنچتے ہیں کہ منزل تک پہنچنے کے لئے جو راہرو سامنے آتا ہے۔ اس کے ساتھ تھوڑی سی مسافت ضرور طے کر لیتا ہوں تاہم جلد ہی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک میں گم کردہ راہ ہوں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک میں ایسے حقیقی رہنما کی شناخت کا اہل ثابت نہیں ہو سکا جو منزل تک پہنچانے کی واقعی صلاحیت رکھتا ہو۔

## 154 یورپ سے ایک خط

ہم خوگر محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحر پر آشوب و پراسرار ہے رومی!

تو بھی ہے اسی قافلہ شوق میں اقبال!
جس قافلہ شوق کا سالار ہے رومی

کہتے ہیں چراغ رہ احرار ہے رومی — اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام؟

## جواب

چرا غواں — در ختن — آہوانہ — چوں خراں — جو، بجز — خورد و — نباید — کہ
ہر کہ کاہ و جو خورد قرباں شود — ہر کہ نور حق خورد قرآں شود!

**معنی: محسوس:** وہ شے جس کا علم حواس خمسہ کے ذریعے سے ہو سکے یعنی جو دیکھی، سنی، چھوئی، چکھی اور سونگھی جا سکے۔ مراد ہے مادی شے۔ **پر آشوب:** طوفانی۔ **احرار:** حر کی جمع۔ لفظی معنی آزاد۔ اصطلاحی معنی اہل حق اور خدا دوست اصحاب۔

یہ مختصر نظم بھی اسی انداز کی ہے۔ جس طرح "پیر و مرید" کے عنوان کی نظم ہے۔ موخر الذکر نظم میں "مرید ہندی" کے کردار میں خود اقبال ہیں جو بعض ایسے استفسار تراشتے ہیں جن کے جوابات بڑے حکیمانہ انداز میں مولانا روم نے دیے ہیں۔ زیر تشریح نظم کے پانچ اشعار میں تین اشعار تو خود علامہ اقبال کے ہیں جن کا متن یورپ سے علامہ کے نام ایک خط سے ماخوذ ہے۔ ان اشعار میں مولانا روم کی حکمت و دانش کے حوالے سے بعض سوالات اٹھائے ہیں جن کا جواب آخری دو اشعار میں موجود ہے۔ یہ دونوں اشعار مولانا روم کے ہیں۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے یہ نظم بھی علامہ اقبال کی ایک دوسری نظم "پیر و مرید" سے فورم کے اعتبار سے کافی حد تک ملتی جلتی ہے۔ ملاحظہ ہو!

## پہلا بند

① مکتوب نگار! علامہ اقبال سے اپنے خط میں استفسار کرتا ہے کہ ہم لوگ تو خیر اس امر کے عادی ہو چکے ہیں کہ ایک تماشائی کی حیثیت سے ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کریں۔ (مراد یہ ہے کہ ہماری نظریں محض مادی اشیاء کے نظارے تک محدود رہیں) جب کہ مولانا روم تو معرفت اور روحانیت کا ایک ایسا سمندر رہیں جس کی گہرائی اور وسعت کا اندازہ مشکل ہے۔

② آپ کا تعلق بھی تو اسی سلسلہ شوق سے ہے جس سلسلہ شوق کے سرکردہ رہنما مولانا روم ہیں یعنی آپ بھی ان کی طرح معرفت اور روحانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس صورت میں آپ با آسانی اس امر کی وضاحت کر سکتے ہیں کہ مولانا روم کا نظریہ کیا ہے۔

③ ازراہ کرم یہ تو فرمایئے کہ مولانا روم کو تو خدا دوست اور آزاد منش لوگوں کا رہنما تصور کیا جاتا ہے تو کیا انہوں نے اس ضمن میں عصر موجود کو بھی کوئی پیغام دیا ہے یا نہیں!

## جواب

① اقبال کے بقول مولانا روم کے ان دو اشعار میں ہی ان کا پیغام موجود ہے۔ پہلے شعر میں ان کا فرمان ہے کہ گھاس اور جو تو گدھوں کی خوراک ہے اور ختن کی پہاڑیوں کے باسی ہرن جو مشک نافہ پیدا کرتے ہیں نارنجی رنگ کا خوبصورت، میٹھا اور نشہ آور پھول ارغواں کھاتے ہیں۔ اسی کے سبب مشک کی پیداوار کے لئے ان کے خون میں مطلوب جوہر پیدا ہوتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ مادیت بے شک تن پروری کے کام تو آ سکتی ہے جب کہ روحانیت کے طفیل انسان کی

قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ پوری فضا کو متاثر کر دیتا ہے۔

② مولانا روم اس شعر میں فرماتے ہیں کہ گھاس اور جو کھانے والا بھیڑ بکری اور گائے بیل کی طرح ذبح کر دیا جاتا ہے تاکہ دوسروں کی تن پروری کا سبب بن سکے۔ اس کے برعکس وہ شخص جو نور خداوندی پر اکتفا کرتا ہے اس کا سینہ روحانیت سے منور ہو جاتا ہے اور وہ قرآن کی مانند دوسروں کے لئے رہنمائی کا سبب بن جاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ انسان میں صلاحیت ہو اور رہنمائی کا جوہر موجود ہو تو اس کے طفیل پورا ماحول منور ہو کر رہ جاتا ہے۔

## 155 نپولین کے مزار پر

راز ہے راز ہے تقدیر جہان تگ و تاز
جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جوش کردار سے شمشیر سکندر کا طلوع
کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز!

جوش کردار سے تیمور کا سیل ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

صف جنگاہ میں مردان خدا کی تکبیر
جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز!

ہے مگر فرصت کردار نفس یا دو نفس
عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز!

"عاقبت منزل ما وادی خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز!"

**معنی: جہان تگ و تازہ:** وہ دنیا جس میں دوڑ دھوپ اور جدوجہد لازم ہے۔ یعنی ہماری دنیا۔ **الوند:** ایران کا ایک مشہور پہاڑ۔ **تیمور:** ترکستان کا مشہور مغل فاتح جس نے اپنی ہمت سے ایشیا میں ایک نہایت عظیم الشان سلطنت قائم کرلی۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی بابر تیمور ہی کی اولاد میں سے تھا۔ اسی وجہ سے مغل سلاطین کو تیموری بھی کہتے ہیں۔

نپولین کا شمار فرانس ہی نہیں دنیا کے چند عظیم ترین جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ یہ اس کی بے پناہ صلاحیت اور جدوجہد کا نتیجہ ہی تھا کہ اس معمولی لیفٹننٹ کے عہدہ سے ترقی پا کر وہاں کی افواج کا سپہ سالار پھر مطلق العنان شہنشاہ بنا۔ زندگی میں اس نے سینکڑوں جنگیں جیتیں لیکن واٹرلو کے مقام پر انگریزوں سے شکست کھائی جس کے سبب وہ جزیرہ سینٹ ہلینا میں قید کر دیا گیا اور 1891ء میں وہیں پر اس نے وفات پائی۔ نپولین کے اس زوال کے باوجود پیرس کے قلب میں اس کا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا گیا جو آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

اقبال جب پیرس میں نپولین کے مقبرے میں گئے تو اس سے متاثر ہو کر انہوں نے یہ نظم کہی۔ یہ اقبال کی انتہائی بلند پایہ نظموں میں سے ایک ہے۔ ہرچند کہ یہ مختصر سی نظم محض چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود اس میں نپولین اعظم کا مکمل کردار جھلکتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے!

① ہرچند کہ یہ دنیا جوش عمل اور انتہائی جدوجہد کی حامل ہے۔ اس کے یہاں انسانی تقدیر ایک راز کی حیثیت رکھتی ہے جس کی عقدہ کشائی کسی کے بس کا روگ نہیں۔ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔ اس کے بارے میں انسانی علم کچھ بتانے سے معذور ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ انسان میں جوش عمل اور جدوجہد کا جذبہ موجود ہو تو تقدیر کے بھید کھلنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

جدوجہد کا جذبہ موجود ہو تو تقدیر کے بھید کھلنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

② اور یہی جوش کردار و عمل تھا جس کی مدد سے سکندر اعظم نے ایران جیسی مستحکم اور پر شکوہ سلطنت کو تہہ و بالا کر دیا۔ اور اس کا نقش صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔

③ یہ جوش کردار و عمل ہی تھا جس نے تیمور کی عسکری قوت کو ایک ہمہ گیر طوفان میں ڈھال دیا۔ اس طوفان کے مقابلے پر جو کچھ بھی آیا اس کے ریلے میں بہہ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس نوع کے ہمہ گیر طوفان کے مقابلے پر بلندی اور پستی کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ وہ تو جب پوری تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے تو نہ بلندی کو دیکھتا ہے نا ہی پستی کو ہر چیز کو روندکر بڑھتا چلا جاتا ہے۔

④ میدان کارزار میں جب اللہ کے سپاہی معرکہ آرا ہو کر تکبیر کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو جوش کردار عمل ہی اس کی بنیاد ہوتا ہے اور پھر یہی نعرہ عملاً نعرہ حق یعنی خدا کی آواز بن جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ نعرہ تکبیر میں رضائے الٰہی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دشمن کے لئے تو یہ نعرہ صور اسرافیل سے کم نہیں ہوتا۔

⑤ تاہم یہ جوش کردار و عمل انسان کی عمر کے ساتھ بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو قبر کی لمبی تاریکی ہے جو روز قیامت تک مقدر کر دی گئی ہے۔ مراد یہ ہے کہ زندگی عارضی اور مختصر ہوتی ہے۔ اپنے کردار اور عمل سے اس مختصر وقت سے پوری طرح استفادہ کرنا چاہئے تاکہ انسان کا نام اس کی موت کے بعد بھی زندہ رہے۔ اور یہ سب کچھ جوش کردار و عمل کے بغیر ممکن نہیں!

⑥ نظم کا یہ آخری شعر اقبال کا نہیں بلکہ حافظ کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انسان کی منزل بالآخر قبر ہی تو ہے جہاں تاریکی اور سکوت و خامشی کے سوا اور کچھ نہیں۔ قبر سے نہ تو کوئی صدا بلند ہوتی ہے نا ہی اور کوئی شے قریب پھٹکتی ہے۔ جب صورت حال یہ ہو تو کیوں نہ زندگی کو ہنگامہ ہاؤ ہو میں صرف کیا جائے اور اس آواز کو یوں بلند کیا جائے کہ وہ گنبد افلاک میں بھی غلغلہ پیدا کر دے۔

ان اشعار میں نپولین کے عملی کردار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی موت کے بعد کا منظر نامہ بھی ایک طرح سے نمایاں کیا گیا ہے۔

## 156 مسولینی

ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب!
ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب!

ندرت فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرت فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب!

رومتہ الکبریٰ! دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداری است یا رب یا بخواب!

چشم پیران کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں تیرے ہیں سوز آرزو سے سینہ تاب!

یہ محبت کی حرارت! یہ تمنا! یہ نمود!
فصل گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیر حجاب!

نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب!

فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثل شعاع آفتاب!

**معنی: ندرت:** تازگی۔ انوکھا پن۔ **رومتہ الکبریٰ:** لفظی معنی سب سے بڑا شہر روم۔ یہ اس زمانے سے روما کا لقب چلا آتا ہے۔ جب وہ رومی سلطنت کا مرکز تھا۔ **سینہ تاب:** جن کے سینے گرم ہوں۔ **زخمہ ور:** ساز بجانے والا۔

1931ء میں علامہ اقبال جب دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن پہنچے تو ان کو اطالوی سفیر متعینہ بھارت کی وساطت سے مسولینی کا پیغام ملا جس میں انہیں کانفرنس سے فراغت کے بعد روم آکر کچھ عرصہ قیام کرنے اور وہاں لیکچر دینے کی دعوت دی گئی تھی۔ اقبال نے یہ دعوت منظور کرلی۔ روم پہنچ کر انہوں نے روم کے اکابرین کی مجلس میں ایک لیکچر بھی دیا اور مسولینی سے بھی ملاقات کی۔ ان پر اس ملاقات کا گہرا اثر پڑا۔ یہاں مسولینی کے بارے میں چند حقائق کا ذکر ناگزیر ہے کہ ان کے بغیر اس نظم کی روح کو سمجھنا مشکل ہے۔ مسولینی نوجوانی میں اطالوی فوج سے منسلک بھی رہا۔ وہ ایک طرح سے اٹلی میں فاشزم کی تحریک کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ 1922ء میں وہ اپنے ملک کا مختار کل بن گیا۔ وہ شعلہ بیاں مقرر تھا۔ اس نے قوم میں جنگی روح پھونک کر اہل روم کی عظمت رفتہ کو یاد دلا کر ایک عظیم الشان سلطنت کا تصور پیش کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں مسولینی نے ہٹلر کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ بعد میں اتحادیوں کے مقابلے پر اٹلی نے شکست کھائی اور مسولینی کو اقتدار سے علیحدہ کر کے ایک جزیرے میں نظربند کر دیا گیا۔ جہاں سے ہٹلر کے ہوا باز اسے چھڑا کر لے گئے۔ چنانچہ شمالی اٹلی میں دوبارہ اس کی حکومت قائم ہوئی لیکن حالات اس کے قابو سے باہر ہو چکے تھے جس کے سبب وہ بھیس بدل کر سوئٹزرلینڈ فرار ہونے لگا تو راہ میں پکڑ کر اسے گولی مار دی گئی۔

1931ء میں اقبال نے اٹلی کے سفر کے دوران مسولینی کی عظمت کے نظارے جگہ جگہ دیکھے۔ اس کے علاوہ مختلف مقامات پر انہوں نے فاشسٹ نوجوانوں کے پرجوش جتھے دیکھے۔ وہ ان کے جوش و خروش سے بے حد متاثر ہوئے ہی نہیں بلکہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسولینی کی قیادت میں اٹلی کی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ یہی وہ تصورات تھے جن کی بنیاد پر اقبال نے یہ نظم تخلیق کی۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اقبال قطعی طور پر فاشزم کے حامی نہ تھے بلکہ اسے فرنگی استعمار کے خلاف ردعمل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اس حقیقت سے تو سب ہی آگاہ ہیں کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔

① "مسولینی" کے عنوان سے زیر تشریح نظم سات اشعار پر مشتمل ہے۔ پہلے شعر میں کہا گیا ہے کہ نظریہ جب زیر عمل آتا ہے تو وہ قوم میں انقلاب کا ذوق پیدا کرتا ہے۔ یہی عمل انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ نظریہ اور عمل کے ارتباط کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ قوم میں جوانی کی روح اور جوش پیدا ہو تا کہ وہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو سکے۔

② یہ نظریہ اور عمل کے مابین ارتباط کی انفرادیت ہے جو زندگی کو معجزات سے ہم کنار کرتی ہے اور یہی عمل پتھر کو سل میں منتقل کر دیتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب کسی قوم کے پاس کوئی ٹھوس نظریہ ہو اور وہ اس پر عمل پذیر ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو تو وہ ایسے انقلاب سے دوچار ہو جاتی ہے جو اپنی قوت و نمو کے سبب اپنے آپ کو بھی بدلتی ہے اور دوسروں کو بھی تبدیلی پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسی ہی قوم عملی سطح پر ایسے کارنامے انجام دیتی ہے، جن کے سبب اس کا نام ہمیشہ کے لئے تاریخ کی زینت بن جاتا ہے۔

③ اس شعر میں اقبال اٹلی میں دوران قیام اپنے مشاہدے پر متحیر ہیں کہ ایک قلیل عرصے میں یہ ملک کتنے تغیر سے ہم آہنگ ہوا ہے کہ اس کی موجودہ حالت پر یقین کرنے میں تامل ہوتا ہے اور دیکھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ میں حالت خواب میں ہوں یا جاگ رہا ہوں۔

④ اب تو کیفیت یہ ہے کہ یہاں کے ضعیف لوگوں کی نظریں بھی اس روشنی سے جگمگا رہی ہیں جو جواں

عمری کی مظہر سمجھی جاتی ہے۔ ان میں ایک ایسی آب و تاب دکھائی دیتی ہے جو قابل رشک ہے۔ اور جہاں تک روم کے نوجوانوں کا تعلق ہے ان کے سینے بلند ولولوں اور خواہشات کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ ایسا ہمہ گیر تغیر تو زندہ قوموں ہی کا مقدر ہوتا ہے۔

⑤ وطن پر مرمٹنے کا جذبہ! پھر اس جذبے میں حرارت اور جوش و خروش کا مظاہرہ تو ایسے عوامل ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اطالوی قوم کا ہر فرد اپنی منزل کی طرف غیر معمولی جوش و خروش کے ساتھ اسی طرح رواں دواں ہے۔ جس طرح موسم بہار میں پھول شاخوں سے برآمد ہونے کے لئے بیتاب ہوتے ہیں۔ اقبال نے اپنے تاثرات جس خوبصورتی کے ساتھ بیان کئے ہیں ان پر بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

⑥ اے اطالیہ! آج تیری فضا جن نعروں سے گونج رہی ہے اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ تیری خوابیدہ انقلابی فطرت کو جس تحریک کی ضرورت تھی وہ معرض وجود میں آچکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے نزدیک اس تحریک کی مظہر مسولینی کی ذات کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

⑦ اے اطالیہ! اتنا بتادے کہ آج تیری فضائیں جن انقلابی نعروں سے زیر و زبر ہو رہی ہیں اور ان میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے وہ کس کا فیض اور کس کی کرامت ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جس کی نگاہ سورج کی شعاع کے مانند ہے جہاں تک سورج کی شعاعوں کا تعلق ہے۔ وہ دیکھا جائے تو ساری کائنات کو روشنی فراہم کرتی ہیں۔ اقبال نے یقیناً مسولینی کے لئے ہی "سورج کی شعاع" کا استعارہ استعمال کیا ہے۔

157

# سوال

یہ جگہ شعر سوال کے لیے خالی ھے

# پنجاب کے دہقان سے

158

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز!
اسی خاک میں دب گئی تیری آگ سحر کی اذاں ہو گئی اب تو جاگ!
زمیں میں ہے گو خاکیوں کی برات نہیں اس اندھیرے میں آبِ حیات!
زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگیں جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں!
بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دینِ محکم یہی فتح باب کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

بخاکِ بدن دانہ دل فشاں
کہ ایں دانہ دارد ز حاصل نشاں!

**معنی: شعوب:** شعب کی جمع۔ بڑے قبیلے۔ **سلاسل:** سلسلہ کی جمع۔ زنجیریں۔

اقبال نے اپنے گردوپیش کے مسائل کا جس دل سوزی مگر حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لیا ہے وہ ایک طرف تو اس امر کا غماز ہے کہ وہ عصری صورت حال پر گہری نظر رکھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ شعر میں ان کا اظہار ہمیشہ اپنے نقطہ نظر کے حوالے سے کرتے ہیں۔ ان کی شاعری عملاً ایک پیغام کی حیثیت رکھتی ہے۔ زیر تشریح نظم کے اشعار میں جہاں وہ "پنجاب کے دہقاں کی کیفیات اور ان کے مسائل کا ذکر کرتے ہیں وہاں وہ ان کو بیداری کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے!

① نظم کے تمام اشعار میں علامہ اقبال پنجاب کے کسان سے براہ راست مخاطب ہیں۔ ان کے اولین شعر میں وہ کسان سے استفسار کرتے ہیں کہ ہزارہا سال سے تو خاک چھان رہا ہے اور غذائی اجناس پیدا کر رہا ہے لیکن اتنا بتا دے کہ کیا تیری زندگی ہمیشہ اسی عمل تک محدود رہے گی۔ نہ جانے تو اسی پر کیوں اکتفا کئے ہوئے ہے جب کہ تو زندگی کی تمام سہولتوں سے محروم ہے۔

② تجھ میں جوش و عمل کا جو جذبہ تھا کیا وہ اس مٹی کی نذر ہو گیا جس کو تو قابل کاشت بناتا ہے۔ اب تو مایوسیوں کا اندھیرا دور ہو کر امید کی نئی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ دنیا بھر میں ہر ملک کے عوام اپنے حقوق کے حصول کی خاطر بیدار ہو کر استحصالی قوتوں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں اب تیرے لئے بھی لازم ہے کہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر اپنے حقوق کے لئے عملی جدوجہد کرے۔

③ ہر چند کہ دنیا کے تمام باشندوں کو پیٹ بھرنے کے لئے رزق زمین سے ہی میسر آتا ہے اس لئے غذائی فصلوں کی کاشت زمین میں ہی ہوتی ہے اس کے باوجود یہ فصلیں انسان کو ہمیشہ زندہ رکھنے کی اہل نہیں ہوتیں۔ زندگی محض یہ تو نہیں کہ فصل پیدا ہوا اور اس سے پیٹ بھر لیا۔ زندگی کا مقصد تو اور بھی کچھ ہے۔

④ یعنی زندگی کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو پہچانے۔ اس کا تحفظ کرے اور لمحہ بہ لمحہ اس کو جانچتا رہے۔ اور جو شخص اس عمل سے بے بہرہ ہے اس کے بارے میں بس اسی قدر کہنا ہی کافی ہے کہ وہ حقیقتوں کے ادراک سے محروم ہے۔

⑤ افسوس کہ تو بیداری کے اس عہد میں بھی نسلوں، قبیلوں اور فرقوں کے قدیم اور ازکار رفتہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ان کی شکست و ریخت کے بغیر تیرا منزل مقصود تک پہنچنا ممکن نہیں۔ اس کے ساتھ یہ

بھی ضروری ہے کہ قدیم رسموں اور روایتوں کی زنجیروں کو بھی توڑ کر ان سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لے۔

⑥ دنیا میں اگر توحید کا سبق عام ہو جائے اور یہ جو مسلمانوں میں چھوٹے چھوٹے دھڑے ، فرقے اور قبائل موجود ہیں اگر یہ سب متحد ہو کر ایک ہی ملت میں ڈھل جائیں تو یہاں دوسری قوموں پر برتری کی صورت نکل سکتی ہے۔ اور اس طرح توحید کا قیام ساری دنیا تک پہنچ سکتا ہے۔ کہ یہی پیغام سب کے لئے تمام علائق دنیوی سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

⑦ نظم کے اس آخری شعر میں اقبال پنجاب کے دہقان کو اسی کی زبان میں مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب تک انسان کے دل میں زندگی کے حقیقی نصب العین کے حصول کی تڑپ نہ پیدا ہو جائے اس وقت تک وہ نا قابل فراموش کارنامے سرانجام نہیں دے سکتا۔ یہی تڑپ دراصل انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرتی ہے۔




159

## نادر شاہ افغان

سے بیدار کرتی ہے۔

حضور حق سے چلا لے کے لولوئے لالا — وہ ابر جس سے رگ گل ہے مثل تار نفس!
بہشت راہ میں دیکھا تو ہو گیا بے تاب — عجب مقام ہے جی چاہتا ہے جاؤں برس
صدا بہشت سے آئی کہ منتظر ہے ترا — ہرات و کابل و غزنی کا سبزہ نورس!

سرشک دیدہ نادر بہ داغ لالہ فشاں!
چناں کہ آتش اورادگر فرونہ نشاں!

**معنی:** لولوئے لالا: روشن اور آبدار موتی۔ ہرات ، کابل ، غزنی: افغانستان کے مشہور شہر۔ سبزہ نورس: ابھرتا ہوا سبزہ۔

مسلمان سلاطین اور زندگی کے مختلف شعبوں میں تعلق رکھنے والے بعض زعماء علامہ اقبال کے پسندیدہ لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا تذکرہ گاہے گاہے وہ مثالی کرداروں کے طور پر اپنے اشعار میں کرتے رہتے ہیں۔ نادر شاہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ زیر تشریح نظم میں انہوں نے نادر شاہ کے کردار کو ایک ایسے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے جو اپنی جراءت اور حریت پسندی کے سبب ان کے نزدیک رب العزت کی بخشش و کرم کا حامل بھی بنا اور اپنی قوم کے لئے سرخروئی کا سبب بھی بنا۔ چار اشعار پر یہ مختصر مگر کئی اعتبار سے اہم نظم بڑی حد تک علامتی انداز میں تخلیق کی گئی ہے۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ یہ نظم "بال جبریل" کی دوسری نظموں سے قدرے مختلف ہے۔ ان اشعار میں اقبال فرماتے ہیں کہ

① خالق ایزدی کی رضا سے جس لمحے زمین پر برسنے کے لئے اپنے دامن میں موتیوں کی مانند پانی کے بے شمار قطرے لے کر روانہ ہوا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے وجود سے پھولوں میں زندگی دوڑنے لگے گی۔

② اسی پرواز کے دوران جب اس نے اپنے راستے میں بہشت کے جانفزا نظاروں کو دیکھا تو ان کو دیکھ کر اس طرح سے مضطرب ہوا کہ اس کا جی چاہا کہ اسی مقام پر برس جائے۔

③ لیکن یوں لگتا تھا کہ بہشت نے اس کی نیت کو بھانپ لیا اور یوں گویا ہوئی کہ بے شک میرے وسیع و عریض دامن کو قدرت نے انتہائی حسین و جمیل نظاروں سے بھر دیا ہے تاہم میرا مشورہ یہ ہے کہ تو آگے بڑھ اور زمین پر جا کر ہرات و کابل اور غزنی کا نظارہ بھی کر کہ نادر شاہ افغانی کے زیر اقتدار یہ علاقے مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت سبزہ زار میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے سبزہ زار تو نے پہلے کہیں اور نہ دیکھے ہوں گے۔ لہٰذا برسنا ہے تو وہاں جا کر برس!

④ کہ وہاں نادر شاہ افغانی کے جذبوں میں زندگی کی جو حرارت اور جوش موجود ہے وہ پوری افغان قوم کے دلوں میں موجزن ہو جانا چاہئے تاکہ وہ کسی مرحلے پر بھی مایوس و افسردہ نہ ہو سکے یعنی نادر شاہ کے دل میں قوم کا جو درد موجود ہے اور جس طرح وہ اس کو بیدار کرنا چاہتا ہے یہ درد افغانوں کے دلوں میں منتقل ہونا چاہئے!

## 160 خوشحال خاں کی وصیت

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں **قہستاں** کا یہ بچہ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مغل شہسواروں کی گرد سمند!

**معانی: قہستان:** افغانستان کے حصے کا نام۔

خوشحال خاں خٹک پشتو زبان کا مشہور حریت پسند اور صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کی کم و بیش ایک سو

بلند پایہ نظمیں پشتو زبان سے انگریزی میں منتقل ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ خوشحال کے دیوان کے اردو زبان میں بھی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ مغلوں کے تسلط سے افغانستان کو آزاد کرانے کا خواہاں تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں اس نے متعدد پٹھان قبیلوں کو اکٹھا کر کے مغل سلطنت سے زبردست معرکہ آرائی کی تاہم محض ایک آفریدی قبیلہ تھا جو آخر دم تک اس کے ہم رکاب رہا۔ علامہ اقبال کے نزدیک خوشحال خاں خٹک ایک ایسی شخصیت تھے جنہوں نے آزادی کی خاطر تمام عمر مغلوں کے خلاف نبرد آزمائی میں گزار دی۔ چار اشعار پر یہ مختصر نظم خوشحال خاں کے جراءت مندانہ کردار کی جانب اشاعرہ کرتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

① افغان باشندوں کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ ان کے تمام قبائل یکجا ہو جائیں تاکہ وہ مغلوں کے خلاف اپنی آزادی کے لئے معرکہ آرا ہو سکیں۔ صرف اسی طرح سے ان کا نام بلند ہو سکتا ہے اور وہ سرخرو بھی ہو سکتے ہیں۔

② خوشحال کہتے ہیں کہ میں تو ایسے جوانمردوں کا والہ و شیدہ ہوں جو ستاروں پر بھی کمند ڈالنے سے گریز نہیں کرتے۔ مراد ان جوانمردوں سے ہے جو ارضی مملکتیں تو الگ رہیں آسمان کو تسخیر کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور اپنی حوصلہ مندی و اولوالعزمی کے سبب مجھے بے حد عزیز ہیں۔

③ یہ وہ افغان نوجوان ہیں جو جراءت و بہادری اور پامردی میں مغلوں سے کسی طور پر بھی کمتر نہیں۔

⑤④ خوشحال کہتے ہیں کہ یہ علاقہ تو خیر تیرا اور میرے ہم وطنوں کا ہے۔ اس پر مغل فوجوں کی یلغار کیسے برداشت ہو سکتی ہے؟ مجھے تو قبر بھی ایسی پسند ہے جہاں مغل شہسواروں کے قدموں سے اڑتی ہوئی خاک بھی نہ پہنچ سکے۔

مراد یہ ہے کہ ایک حریت پسند اور جنگجو کی حیثیت میں خوشحال خاں کا سینہ مغلوں کے خلاف شدید نفرت کی آماجگاہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مغلوں نے اس کے ملک پر غاصبانہ قبضہ کر کے افغان باشندوں کی آزادی سلب کر لی ہے۔ یہی جذبہ تھا جس کے تحت وہ ساری عمر مغلوں کے خلاف نبرد آزما رہا۔

## 161 تاتاری کا خواب

کہیں سجادہ و عمامہ رہزن کہیں ترسابچوں کی چشم بیباک!
ردائے دین و ملت پارہ پارہ قبائے ملک و دولت چاک در چاک!
مرا ایماں تو ہے باقی ولیکن نہ کھا جائے کہیں شعلے کو خاشاک!
ہوائے تند کی موجوں میں محصور سمرقند و بخارا کی کف خاک!

بگردا گرد خود چندانکہ بینم
بلا انگشتری و من نگینم

یکایک ہل گئی خاک سمرقند اٹھا تیمور کی تربت سے اک نور!
شفق آمیز تھی اس کی سفیدی صدا آئی کہ "میں ہوں روح تیمور!

اگر محصور ہیں مردانِ تاتار! نہیں اللہ کی تقدیر محصور!
تقاضا زندگی کا کیا یہی ہے کہ تورانی ہو تورانی سے مجبور؟
"خودی را سوز و تابے دیگرے دہ
جہاں را انقلابے دیگرے دہ!"

**معانی:** سجادہ: جائے نماز۔ عمامہ: دستار۔ ترسا بچہ: یہ لفظ عموماً شراب فروشوں کے ملازموں کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ ردا: چادر۔

یہ نظم ایک خواب اور اس خواب کے ردعمل کی مظہر ہے۔ اس خواب میں ایک تاتاری اپنے قبائل اور ملت کے انحطاط و زوال کے بارے میں اشاراتی سطح پر بعض حقیقتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس خواب کی رسائی تاتاری قبائل کے سب سے بڑے فاتح تیمور کی روح تک ہوتی ہے تو وہ تاتاری قبائل کے مابین چپقلش اور عدم اتحاد کو ان کی بنیادی خامی قرار دیتے ہوئے ان کی بقاء اور استحکام کے لئے ایک اجمالی لائحہ عمل پیش کرتی ہے۔ اقبال نے اس نظم میں اپنی متخیلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے محض تاتاری قبائل کے مابین نفاق کو ہی ان کی کمزوری اور عدم استحکام کا سبب ہی قرار نہیں دیا بلکہ اس طرح سے پوری ملت اسلامیہ کے بارے میں بنیادی صورت حال کی نشاندہی کی ہے۔

## پہلا بند

① تاتاری کے اس خواب کے مطابق صورت حال یہ ہے کہ قبائل و ملت کی رہنمائی جن علماء اور صوفیا کی ذمہ داری تھی وہ خود نہ صرف اپنے منصب کو بھول بیٹھے ہیں بلکہ ان کو غلط راہ پر لگا رہے ہیں۔ جس کے سبب شدید انتشار پیدا ہو گیا ہے اور نفاق تباہی کا باعث بن گیا ہے۔ دوسری جانب ساقی گری کرنے والے خوبصورت لڑکوں کی بیباک نگاہیں ان کے دین و ایمان پر ڈاکے ڈال رہی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تاتاری اول و آخر لہو و لعب اور نفاق کے سبب تباہی و بربادی سے دوچار ہو چکے ہیں۔

② یہی وہ حالات ہیں جن کے نتیجے میں دین و ملت کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ملک اور سلطنت بھی انحطاط و زوال کا شکار ہیں یعنی عدم اتحاد اور نفاق کے باعث نہ دین سلامت رہا نا ہی قوم و ملت میں اتحاد و استحکام کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔

③ ہر چند کہ ابھی لوگوں میں ایمان کی تھوڑی سی رمق باقی ہے تاہم چہار جانب فتنوں کی جو قیامت برپا ہے ان کے سبب یہ خدشہ خارج از امکان نہیں کہ یہ قیامت ایمان کو بھی بھسم کر ڈالے!

④ تاتاری قبائل آپس میں دست و گریباں ہیں۔ دشمن اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہو چکے ہیں اور وہ سمرقند و بخارا پر یلغار کے لئے صف آرائی میں مصروف ہیں۔ تاتاریوں کی غفلت کے باعث ملک و سلطنت دونوں خطرات میں گھر کر رہ گئے ہیں۔ اب بھی اگر انہیں اس حقیقت کا احساس نہ ہوا تو تباہی ان کا مقدر بن جائے گی۔

⑤ فارسی کا یہ شعر کسی نامعلوم شاعر کا ہے۔ نصیر الدین طوسی نے غالباً اسے شرح اشارات میں سے نقل کیا ہے۔ اقبال نے خود بھی لکھا ہے کہ وہ اس شعر کے مصنف کے نام سے آگاہی نہیں رکھتے! تاہم یہ

شعر اس دور کے ترکستان کی صورت حال کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ گرد و پیش جہاں تک نگاہیں جاتی ہیں کہ آفتوں اور بلاؤں نے گھیرے میں لے رکھا ہے اور ان آفتوں اور بلاؤں کا نشانہ میں ہوں۔ یہاں میں سے مراد ترکستان ہے۔

## دوسرا بند

① تاتاری جو خواب دیکھ رہا تھا اس کے دوران ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا کہ پورے سمرقند کی زمین لرزہ براندام ہو گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے زبردست زلزلہ رونما ہو گیا ہے حتیٰ کہ تیمور کی قبر بھی ہلنے لگی اور اس کی تربت سے روشنی کی ایک شعاع برآمد ہوئی۔ اس منظر کو دیکھنے والے حیران و پریشان رہ گئے۔

② تیمور کی قبر سے جو شعاع برآمد ہوئی ہرچند کہ اس کا رنگ کافی حد تک سفید تھا پھر بھی اس میں یوں لگتا تھا کہ شفق کی سرخی کی کسی حد تک آمیزش موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس شعاع میں سے ایک صدا برآمد ہوئی کہ میں روح تیمور ہوں!" اور تاتاری قبائل میں عدم اتحاد و نفاق کے سبب ہر لحہ پریشان اور بے چین رہتی ہوں!"

③ تاہم اس حقیقت کو جان لو کہ اگر اہل تاتار مصائب میں گھرے ہوئے ہیں اور ہر جانب سے دشمنوں نے ان پر یلغار کر رکھی ہے تو اس سے یہ مراد تو نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ کا اقتدار اعلیٰ بھی ان کے نرغے میں آگیا ہے۔ ظاہر ہے کہ رب ذوالجلال ہی کائنات کی ہر شے پر قادر ہے۔ وہ جس کو چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔ اس لئے تاتاری اگر اس کے احکامات کی پیروی کریں تو وہ انہیں یقیناً اپنی رحمت سے نوازے گا۔

④ کان کھول کر سن لو کہ عزت کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے یہ امر لازم ہے کہ قوم و ملت آپس میں مل جل کر رہے۔ ان میں نفاق نہ ہو۔ اسی صورت میں وہ ہر فتنے اور بلا کا مقابلہ کر کے سرخرو ہو سکتی ہیں۔ میں روح تیمور! ایک بار پھر تمہیں متنبہ کرتی ہوں کہ نفاق کے سبب تم خود ہی تمام مصیبتوں کے ذمہ دار ہو۔ اگر حقیقی معنوں میں مل جل کر رہو اور ان کا مقابلہ کرو تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی تمہیں زیر نہیں کر سکتی کہ یہی عمل زندہ قوموں کی کامیابی اور کامرانی کا باعث ہوتا ہے۔

⑤ میرے عزیز ہم وطنو! میری اس آخری بات کو غور سے سنو! کہ باعزت زندگی گزارنے کے لئے اپنی خودی میں تازہ حرارت اور تب و تاب پیدا کرو۔ اسی صورت میں تم نہ صرف یہ کہ اپنے مخالفین کو زیر کر سکو گے بلکہ ساری دنیا میں انقلاب برپا کر سکو گے۔ اس کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ اپنی صفوں میں اتحاد و استحکام پیدا کرو۔ باہمی نفاق سے گریز کرو اور آخری بات یہ کہ احکام خداوندی کی ہر صورت میں پیروی کرو! کہ یہی تمہارے لئے سربلندی اور نجات کا راستہ ہے۔

162

# حال و مقام

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور!
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور!

**معانی: حال:** لفظی معنی عام کیفیت۔ یہاں فرد کی ذہنی، روحانی اور اخلاقی کیفیت مراد ہے۔ جو کسی بھی وقت اس پر طاری ہو۔ **مقام:** لفظی معنی درجہ، مرتبہ، جگہ، سلوک کی اصطلاح۔ **بتدریج:** درجہ بدرجہ، آہستہ آہستہ۔ **چشم نگراں:** دیکھنے والی آنکھ۔ **سالک:** لفظی معنی راہ چلنے والا۔ **تفاوت:** فرق۔ **کرگس:** گدھ۔

یہ مختصر مگر انتہائی خوبصورت نظم ہرچند کہ محض چار اشعار پر مشتمل ہے لیکن علامہ اقبال نے یہاں ایک اہم نکتے کو بڑی مہارت اور حکمت کے ساتھ واضح کیا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ہر وہ انسان جو اس دنیا میں آتا ہے اس کی کیفیت اور مرتبہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس نکتے کو علامہ نے انتہائی حکمت اور استدلال کے ساتھ اس نظم میں واضح کیا ہے۔ حال ان کے نزدیک فرد کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی کیفیت سے عبارت ہے جب کہ مقام کو وہ اس روحانی مرتبے سے متعلق سمجھتے ہیں۔ جس پر سالک پہنچا ہوا ہو۔ یعنی وہ محبوب حقیقی تک رسائی کے لئے مختلف مراحل سے گزر رہا ہو۔

اقبال کے کلام کے اجتماعی رویے اور اس کی کلیت تک رسائی کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ ان کے فکری نظام کے علاوہ فنی سطح پر جس مہارت اور چابکدستی کے ساتھ تمثال نگاری کی گئی ہے اور نئی علامتیں وضع کی ہیں۔ ان کی تفہیم بھی ضروری ہے۔ اس ضمن میں بنیادی اور اہم بات جو پیش نظر رکھی ہوگی وہ یہ ہے کہ اقبال کی تمثال نگاری میں جو قوت کارفرما نظر آتی ہے وہ ان کا تہذیبی لاشعور ہے جو ان کی لسانی اور شعری تشکیل میں بھی واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

① علامہ کی اس زیر تشریح نظم "حال و مقام" کے پہلے شعر میں وہ فرماتے ہیں کہ انسان اگر دل زندہ و بیدار کا مالک ہو تو قدرت بتدریج ایسی چشم بینا عطا کرتی ہے جو اسے کائنات کے اسرار و رموز سے آگاہی بخشے! حقیقت شناسی کا عمل اسی نکتے سے عبارت ہے۔

② تاہم یہ امر پیش نظر رکھنا لازم ہے کہ اس کا انحصار فرد کی کیفیت اور مرتبے پر ہے۔ ان دونوں کی وضاحت سطور بالا میں کر دی گئی ہے۔ بہرحال یہاں سالک کے مقام کے بارے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ جو شخص ہر لحہ محبوب حقیقی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کے لئے زمان و مکان کی کیفیت اس کے احوال و مقام کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔

③ اس امر کی ایک مثال اقبال ملا اور مجاہد کی اذان کے حوالے سے دیتے ہیں کہ زبان، الفاظ اور متن کے اعتبار سے ملا جو اذان دیتا ہے وہی اذان مجاہد بھی دیتا ہے لیکن ان میں فرق نیت اور کردار کا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ملا جو اذان دیتا ہے تو محض اس کا تعلق زبان اور حلق سے ہوتا ہے۔ روحانی سطح پر وہ اس کا اذان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا گویا اس کا عمل محض دکھاوے کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مجاہد کی اذان سے برآمد ہوتی ہے اور اس اذان میں قوت ایمان بھی کارفرما ہوتی

اس کی اذان نفس مطمئنہ کی مظہر ہوتی ہے۔ یہی ملا اور مجاہد کی اذان میں فرق ہے۔

④ اسی مضمون کو اقبال یہاں بھی دہراتے ہیں لیکن اس شعر میں انہوں نے کردار بدل دیئے ہیں۔ اس سے پہلے شعر میں بھی بنیادی مقصد تو اذان تھا لیکن تقابل دو کرداروں ملا اور مجاہد کے مابین رہا جب کہ زیر تشریح شعر میں فضا تو مشترک ہے لیکن جب اس میں کرگس (گدھ) اور شاہین (عقاب) محو پرواز ہوتے ہیں تو ان کا عمل ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ان دونوں اشعار کے حوالے سے دیکھا جائے تو اقبال نے تمثالی سطح پر ملا اور کرگس، دوسری جانب مجاہد اور شاہین کے کرداروں کے حوالے سے اپنا مفہوم واضح کیا ہے۔

## 163 ابوالعلا معری

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات

اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات

یہ خوان تر و تازہ معری نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحب غفران و لزومات

اے مرغک بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات؟

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات!

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات!

**معانی: شاطر**: لفظی معنی شطرنج کا ماہر، اصطلاحاً چالاک۔ **مکافات**: بدلہ۔

اقبال نے جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے اپنے پیغام اور فکری اظہار کے لئے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے ممتاز ہیں اور منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ سکندر، دارا، ارسطو، سقراط، منصور، نادر شاہ، خوشحال خاں خٹک، حسینؓ، امیرالمومنین حضرت علیؓ اور بے شمار کردار ایسے ملیں گے جو علامہ کے فکری اور شعری نظام میں اپنے خصوصی کردار کے سبب اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ پرندوں میں شاہین اور کرگس کا تذکرہ بھی تمثالی سطح پر اکثر و بیشتر آیا ہے۔

اس نظم کا مرکزی کردار ابوالعلا معری، عربی زبان کا ممتاز شاعر تھا۔ وہ نابینا ہونے کے علاوہ بلا کے حافظے کا مالک تھے۔ معری کے شعری دیوان کے علاوہ اس کی دو تصنیفات "غفران اور لزومات" بھی انتہائی طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس نظم میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ نظم کے مرکزی خیال کے مطابق ابوالعلا معری چھیاسی سال تک جیا لیکن کم و بیش پینتالیس سال تک اس نے گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا اور محض سبزیات پر گزر اوقات کی۔ اس مسئلے کا تذکرہ بھی ان اشعار میں آئے گا۔ تاہم اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کمزور اور ضعیف انسان کو ابتدائے آفرینش سے ہی جینے کا حق نہیں دیا گیا جب کہ طاقتور کو ہر اعتبار سے معزز و محترم سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس پس منظر کے حوالے سے اب نظم کی طرف آیئے!

① یہ ایک تاریخی روایت ہے کہ ابوالعلا معری گوشت کھانے سے پرہیز کرتا تھا اور محض پھل اور سبزیات پر ہی گزر اوقات کرتا تھا۔

② اس کے ایک دوست نے ایک دن معری کے لئے بڑی چالاکی کے ساتھ بھنا ہوا تیتر بھیجا کہ شاید وہ

تیتر کی لذت اور خوشبو کے سبب اپنی قسم توڑ دے لیکن معری بڑا صاحب کردار اور با اصول شخص تھا۔ اس نے اس تیتر کی بجائے معمول کے مطابق سبزی پر ہی گزارا کیا۔

③ تاہم جب اسے اپنے دوست کے بھیجے ہوئے بھنے ہوئے تیتر کا علم ہا تو وہ جو "غفران اور لزومات" جیسی تصانیف کا تخلیق کار تھا تیتر سے مخاطب ہو کر یوں گویا ہوا۔

④ اے ناتواں اور مسکین پرندے! ذرا یہ تو بتا کہ تو نے وہ کون سا گناہ کیا تھا جس کے سبب تجھے یہ دن دیکھنا پڑا یعنی تجھے آخر یہ کس گناہ کی سزا ملی۔

⑤ تیرے اس انجام پر بے شک مجھے بے حد افسوس ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فطرت کے اشارات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور شاہین بننے سے گریز کیا یعنی اگر تو عقاب کی سی بلند پروازی کا حوصلہ اور جراءت کا حامل ہوتا تو کس کی ہمت تھی جو تجھے اس طرح شکار کر کے دستر خوان پر لاتا۔ تیری کمزوری ہی اس عمل کا سبب بنی۔

⑥ اور میرا یہ قول بھی سن لے کہ فطرہ کا اشارہ تقدیر کے مفتی کا وہ فتویٰ ہے جو اس نے ازل سے جاری کیا ہوا ہے کہ ناتوانی اور کمزوری کا انجام موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو کمزور اور ناتواں ہوتے ہیں وہ طاقتور لوگوں کا شکار بن جاتے ہیں اور دنیا میں ہر طرح کے منصب و اعزاز سے محروم رہ کر اپنی جان گنوا بیٹھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال عملی طور پر خود اس نقطہ نظر کے حامی تھے جو انہوں نے ابو العلا معری کی وساطت سے ملت اسلامیہ کو پہنچایا۔

## سینما

164

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے ۔ سینما ہے یا صنعت آذری ہے؟
وہ صنعت نہ تھی شیوہ کافری تھا ۔ یہ صنعت نہیں شیوہ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوام عہد کہن کا ۔ یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے!
وہ دنیا کی مٹی، یہ دوزخ کی مٹی ۔ وہ بتخانہ خاکی یہ خاکستری ہے!

چار شعر کی اس نظم میں اقبال سینما کی شدید مذمت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک سیدھی سادی سی نظم ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔

① حضرت ابراہیم کو تو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ پیغمبر بھی بنے اور خلیل اللہ کا لقب بھی پایا۔ جب کہ ان کے والد محترم آذر اپنے عہد کے ممتاز بت تراش تھے اور اس حیثیت سے ان کا نام آج بھی تاریخ کی زینت ہے جس طرح آذر بت تراش کر ان کی تجارت کیا کرتے تھے۔ آج کے عہد میں سینما بھی اسی نوعیت کی صنعت و تجارت ہے۔ آذر بت تراش کر روپیہ کماتے تھے۔ سینما میں فلمیں دکھا کر دولت کمائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ان دونوں کے مابین کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

② بت تراشی عملاً صنعت نہیں بلکہ کافری کا ایک طریق کار تھا۔ جب کہ سینما بھی کوئی صنعت نہیں ہے بلکہ عملاً جادوگری ہے۔

③ اگر آذر کی بت تراشی کو عہد قدیم کے لوگوں کا مذہبی عقیدہ تصور کر لیا جائے کہ وہ بتوں کی پرستش

کرتے تھے تو سینما بھی اس سے کچھ کم نہیں کہ یہ دورِ حاضر کی تہذیب کی تجارت ہے۔
④ آخری بات یہ کہ بت تراشی تو دنیا کی مٹی سے عبارت تھی جب کہ سینما کی حیثیت تو دوزخ سے کم نہیں کہ وہاں بھی گمراہ لوگوں کو بھیجا جائے گا اور یہاں بھی گمراہ لوگ جاتے ہیں۔

## 165 پنجاب کے پیرزادوں سے

حاضر ہوا میں شیخ مجددؒ کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں مری بینا ہیں و لیکن نہیں بیدار!

آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار!

عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کُلہِ فقر سے ہو طرۂ دستار!

باقی کُلہِ فقر سے تھا ولولۂ حق
طروں نے چڑھایا نشۂ خدمتِ سرکار!

اس نظم کے عملاً دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کے چار اشعار میں اقبال حضرت شیخ مجدد کی قبر کی زیارت اور ان کے اوصافِ حمیدہ کا احوال بیان کرتے ہیں اور دوسرے حصے کا پہلا شعر حضرت شیخ مجدد سے خود اقبال ایک سوال کرتے ہیں۔ باقی تین اشعار اسی سوال کے جواب پر مشتمل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پنجاب کے پیرزادوں کی صورتِ حال کا اظہار خود شیخ مجدد نے کیا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ پنجاب کے ان پیرزادوں کے اسلاف ربّ العزت کے برگزیدہ بندے تھے چنانچہ ان کے معتقدین نے ان کو بڑی بڑی جاگیرداریاں نذرانے کے طور پر پیش کیں۔

ان بزرگوں کی وفات کے بعد ان کی اولاد نے اپنے اسلاف کی روایت سے منہ موڑ لیا اور ان کے بزرگوں کی حاصل کردہ جاگیروں کی آمدنی نے ان پیرزادوں کو لہو و لعب اور عیاشی کا خوگر بنا دیا۔ انہی دنوں انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط جمایا تو انہوں نے مفادات کے لئے ان پیرزادوں کو استعمال کیا اور نہ صرف ان کی جاگیروں کو برقرار رکھا بلکہ بشرطِ وفاداری ان کی جاگیروں اور مناصب میں بھی اضافہ کر دیا۔ اس نظم کے آخری اشعار میں شیخ مجدد کی زبانی انہی پیرزادوں کو سرزنش کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

## پہلا حصہ

① اقبال فرماتے ہیں کہ میں شیخ مجددؒ الف ثانی کی قبر پر زیارت کے لئے گیا وہ اس خاک تلے دفن ہیں جس کو یہ شرف حاصل ہے کہ زیرِ آسماں نورانی تجلیوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔
② شیخ مجدد کی قبر کی مٹی ایسی بلند پایہ مٹی ہے جس کے ذروں کی تابانی اور درخشانی کے روبرو ستاروں کی چمک بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ یہی وہ خاک ہے جس میں شیخ مجددؒ الف ثانی جیسا اولوالعزم بزرگ محوِ خواب ہے۔
③ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ آزادیٔ فکر و نظر کے حوالے سے وہ ایسے کردار کے مالک تھے جنہوں نے اپنے عہد کے تمام حریت پسند انسانوں کو متاثر کیا۔ ان کا یہی کردار تھا کہ شہنشاہ جہانگیر جیسے شہنشاہ کے

روبرو اپنے سر کو جھکانا گوارا نہ کیا۔

④ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر انہوں نے ملت اسلامیہ کے مفادات اور تصورات کا تحفظ کا اور اس مقصد کے لئے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہ کیا۔

## دوسرا حصہ

① اقبال کہتے ہیں کہ حضرت مجدد الف ثانی سے میں نے دست بستہ درخواست کی کہ آپ تو راز فطرت کے امین ہیں۔ ازراہ کرم مجھے بھی فقر کی دولت عطا کر دیں۔ ہر چند میری آنکھوں میں اشیا کو ظاہری سطح پر دیکھنے کا جوہر تو موجود ہے اس کے باوجود باطن تک ان کی رسائی ممکن نہیں۔ ان کو وہ روشنی عطا ہو کہ اس ضمن میں کامیاب ہو سکیں۔

② میری اس درخواست کے جواب میں شیخ مجدد کی قبر سے آواز آئی کہ پنجاب میں فقر کا جو سلسلہ تھا وہ تو ایک عرصے سے بند ہو چکا ہے اس لئے کہ اہل حق یہاں کے لوگوں اور ان کی ولایت سے مایوس و بیزار ہو چکے ہیں۔

③ اس لئے کہ جو لوگ معرفت الٰہی کا ادراک رکھتے ہیں وہ ایسے خطہ ارض میں قیام کرنا پسند نہیں کرتے جہاں طرۂ دستار عملاً کلہ فقر کی جگہ لے لے۔ یعنی اہل فقرا اپنے منصب کو بھلا کر ظاہری عز و جاہ کے چکر میں پڑ جائیں۔ وہ لوگ جو یہاں فقیری اور درویشی کی گدیوں کے مالک تھے۔ اب وہی دنیاوی جاہ و جلال اور امارت کے سحر میں گرفتار ہو کر اپنے حقیقی مسلک سے منحرف ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے اسلاف کی دولت و عزت کو دینی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی بجائے ذاتی اغراض کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ اہل حق کا رشتہ برقرار نہیں رہا کرتا۔

④ عشق حقیقی کا ولولہ اور جوش تو کلۂ فقر تک محدود تھا جب تک درویشی کا سلسلہ قائم رہا اور اہل فقر اس کی عظمت و منصب کے نگہبان رہے۔ ان کے مقاصد کو گزند نہ پہنچا لیکن جب طرۂ دستار نے کلۂ فقر کی جگہ لے لی تو پھر فقر کی گنجائش کہاں رہی۔ اب تو صورت یہ ہے کہ پنجاب کے جن بزرگوں نے یہاں درویشی کی محفلیں سجائیں۔ ان کی اولاد سلسلہ فقر کو نظر انداز کر کے ذاتی منصب اور مدارج کے حصول کی خاطر حکمرانوں کی خوشامد میں مصروف ہے۔ یہ لوگ خدمت حق کی جگہ انگریز کی خدمت گزاری کو اپنا نصب العین قرار دیئے بیٹھے ہیں۔ ایسے لوگوں سے خیر کی توقع رکھنا عبث ہے۔

166

# سیاست

167
# فقر

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری! اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری!
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری! اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری!
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری! میراث مسلمانی سرمایہ شبیری!

تین اشعار پر مشتمل اس انتہائی مختصر نظم میں نہ صرف یہ کہ فقر جیسے اہم مسئلے کو چھیڑا ہے بلکہ اس کا ایک تقابلی جائزہ پیش کر کے فقر کی حقیقی نوعیت سے بھی آگاہی بخشی ہے۔ اقبال کے نزدیک فقر کو ان کے عہد میں پیش کیا گیا۔ مسکینی، فقیری اور مفلسی کے حوالے سے پیش کیا گیا جب کہ اسلامی نقطہ نظر سے فقر ایک مختلف سے ہے۔ جس کو اختیار کرنے سے کسی بھی فرد کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے!

① ایک فقر جو اقوام میں برسر عمل ہے وہ تو ایسا فقر ہے جو شکاری میں خود شکار ہونے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس انداز کے فقر سے غالباً اقبال کی مراد رہبانیت ہے۔ اس کے بالمقابل حقیقی فقر وہ ہے جس سے دنیا کو مسخر اور زیر کرنے کے بھید انسان پر کھلتے ہیں۔

② پہلے قسم کا فقر تو قوموں کے عروج و ارتقاء کے لئے زہر قاتل ہے۔ اس کے برعکس وہ ان میں بے چارگی اور غم انگیز کیفیت جنم دیتا ہے جب کہ حقیقی فقر تو مٹی میں بھی کیمیا کی تاثیر پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی توضیح یوں بھی ہو سکتی ہے۔ ایسا فقر مٹی کو سونا نہیں بناتا بلکہ اکسیر کے درجے تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ جس شے سے مس ہو جائے وہ سونے میں تبدیل ہو جائے!

③ چنانچہ یہی فقر جو حقیقی ہے نواسۂ رسولؐ مقبول حضرت امام حسینؓ کے کردار کا جزو بنا۔ اسی فقر میں سربلندی اور برتری ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امام حسینؓ کا یہ فقر ہی فی الواقع ان کا سرمایہ حیات تھا۔ یہی فقر مسلمانوں کو ورثے میں ملا ہے اور ان کے لئے موجب فخر ہے۔

168
# خودی

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض
یہ کہتا ہے فردوسی دیدہ ور عجم جس کے سرمے سے روشن بصر
"زبہر درم تند و بد خومباش
تو باید کہ باشی درم گومباش"

**معانی:** روشن بصر: جس کی نظر روشن ہو۔

① خودی کا تصور اقبال کے ان بنیادی تصورات میں سے ایک ہے جن سے ان کا پورا نظام فکر عبارت ہے۔ تین اشعار کی اس نظم میں جن میں سے آخری شعر ایران کے ممتاز شاعر فردوسی کا ہے۔ علامہ نے تصور خودی کو اجاگر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دولت کے بدلے اپنی خودی کا سودا نہ کر! اس ضمن میں یہ حقیقت جان لے کہ چنگاری کی شعلے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔ مراد یہ کہ خودی تو ایک شعلے کی مانند ہے اور دولت محض ایک چنگاری کی طرح ہے۔

② تیرے لئے لازم ہے کہ فارسی کا ممتاز دانش ور اور شاعر فردوسی جو انتہائی حقیقت شناس تھا اس کا قول پیش نظر رکھ! اہل عجم کے لئے بھی اس کی حکمت و دانش بصیرت افروز ہے۔

③ فردوسی کا قول ہے کہ مال و دولت اور روپے پیسے کے لئے آپے سے باہر ہو کر اپنی عادت میں بگاڑ پیدا نہ کر! روپیہ پیسہ نہیں ملتا تو نہ ملے تجھ کو یہ امر زیب نہیں دیتا کہ اس کے لئے اپنے جذبہ انسانیت کا خون کر دے بلکہ معاملہ کیسا بھی ہو خود کو اعتدال میں رکھنا ہی احسن فعل ہے۔

مراد یہ ہے کہ مال و دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ یہ تو آنی جانی چیز ہے۔ مال و دولت کے لئے لوگوں سے نہ الجھ! اس ضمن میں تجھ پر اعتدال کی راہ اختیار کرنا لازم ہے۔ استغنا اسی خصوصیت کا نام ہے۔

## 169 جدائی

سورج بنتا ہے تار زر سے دنیا کے لئے ردائے نوری!
عالم ہے خموش و مست گویا ہر شے کو نصیب ہے حضوری!
دریا، کہسار، چاند، تارے کیا جانیں فراق و ناصبوری!
شایاں ہے مجھے غم جدائی یہ خاک ہے محرم جدائی!

اردو شاعری میں ہجر و وصال کا تصور ابتداء سے ہی ایک اہم اور بنیادی موضوع کی حیثیت سے کارفرما رہا ہے۔ رومانوی شاعری میں تو خیر ہجر و وصال کے موضوع کے بغیر بات آگے نہیں چلتی لیکن غیر رومانی بالخصوص سیاسی شاعری میں اس کا استعمال علامتی سطح پر قدرے نئے معانی کے ساتھ ہوا جب کہ علامہ اقبال نے تو زیر تشریح نظم میں جدائی کے استعارے کو قطعی نئی معنویت کے حوالے سے استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک پوری کائنات میں صرف انسان ہی ایسی ہستی ہے جو جدائی کی کیفیت کا ادراک رکھتا ہے کہ وہی عشق حقیقی سے بہرہ ور ہے اور عشق حقیقی میں ہی جدائی اور وصال کے اسرار سے آگاہی ہوتی ہے۔

① ہرچند کہ سورج اپنی زرتاب کرنوں سے پورے جہان کو روشنی سے معمور کرتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس عمل کو کسی مخصوص تناظر میں دیکھنے کی بجائے مقدر سمجھ لیا گیا ہے۔

② یہی صورت کائنات کی ہے جس میں موجود ہر شے اس طرح خاموش اور پر سکوت ہے جیسے اس کی منزل اور مقدر یہی ہے۔

③ اس عالم رنگ و بو میں یہ جو دریا، پہاڑ، چاند اور ستارے موجود ہیں۔ یہ اگرچہ اپنے اپنے مقام پر مصروف عمل ہیں تاہم انہیں ہجر و فراق کی کیفیتوں کا کوئی علم نہیں۔

④ البتہ یہاں ایک انسان کا وجود ہی ہے جسے ہجر اور جدائی کے غم اور کرب سے آگاہی نصیب ہے اس لئے کہ وہی ایک ایسی ہستی ہے جو عشق حقیقی کا شعور رکھتی ہے۔ اسی لئے وہ ہجر و فراق کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ ہے۔

ان اشعار میں اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کائنات میں جو سورج، چاند، ستارے، پہاڑ اور دریا غرض یہاں موجود ہر شے اپنے اپنے مقام پر مصروف عمل تو ہے لیکن ان سب کو عشق حقیقی کا ادراک نہیں۔

اسی لئے وہ جدائی کے احساس سے محروم ہیں۔ محض انسان ہی ہے جو عشق حقیقی کے سبب ہجر و فراق کی کیفیت سے آگاہ ہے۔

## 170 خانقاہ

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن!
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن!

**(43)معانی: قم باذن اللہ:** خدا کے حکم سے اٹھو۔

علامہ فرماتے ہیں کہ یہ عہد جس میں ہم سانس لے رہے ہیں اشاروں، کنایوں اور علامتی سطح پر بات کرنے کا عہد نہیں۔ یہاں تو صاف اور کھری بات کرنے کی ضرورت ہے۔ یوں بھی میں تصنع کا قائل نہیں ہوں چنانچہ کسی لگی لپٹی کے بغیر اپنے مطمع نظر کو واضح کر دیتا ہوں۔ سو امر واقع یہ ہے کہ وہ لوگ جو قم باذن اللہ کہہ کر مردوں کو پھر سے زندہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اب ہمارے درمیان موجود نہیں رہے۔ اب تو خانقاہوں میں ان لوگوں کی جگہ ایسے لوگ باقی رہ گئے ہیں جو یا تو مجاہد ہیں یا پھر قبر کھودنے والے!

مراد یہ ہے کہ خانقاہیں کبھی ان درویشوں کی آماجگاہ ہوتی تھیں جن کے دل عشق الٰہی سے معمور ہوتے تھے ان میں قدرت نے یہ صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ قم باذن اللہ (خدا کے حکم سے اٹھ جا) کہہ کر مردوں کو زندہ کر دیتے تھے جب کہ اب تو خانقاہوں میں مفادات کے بندے باقی رہ گئے ہیں جو پیسے کے لئے سب کچھ کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔

## 171 ابلیس کی عرضداشت

کہتا تھا عزازیل خداوند جہاں سے
پرکالہ آتش ہوئی آدم کی کف خاک!
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب!
دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک!
ناپاک جسے کہتی تھی مشرق کی شریعت
مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک!
تجھ کو نہیں معلوم کہ حوران بہشتی
ویرانی جنت کے تصور سے ہیں غمناک؟
جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک!

مغربی دنیائے سائنس اور صنعت کاری میں جو ترقی کی ہے اقبال اسے محض ظاہری ترقی سمجھتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ ایک ایسی ترقی معکوس ہے جس نے انسان کو روحانی اقدار سے محروم کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ اسے کار شیطانی قرار دیتے ہیں۔ اس نظم میں انہوں نے شیطان کی زبانی ہی معاشرے کے اس کھوکھلے پن کا اظہار کیا ہے۔

① شیطان ملعون بڑے طنز کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں عرض کرتا ہے کہ تو نے تو انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا تھا اور اس کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں مجھے جنت سے نکال پھینکا تھا لیکن اب اس کے کرتوت دیکھ! کہ اپنی فتنہ انگیزیوں کے سبب وہ ساری دنیا کو بھسم کرنے کے درپے ہے۔

② اس کی کیفیت ہے کہ بدن تو خوب موٹا تازہ ہے جس پر بھڑکدار لباس زیب تن کرتا ہے لیکن اس کی

داخلی کیفیت ہر خوبی سے محروم کی ہے البتہ ذہنی طور پر انتہائی چالاک اور عیار ہو چکا ہے کہ ساری دنیا کو انگلیوں پر نچا رکھا ہے۔

③ مشرقی تہذیب و شریعت نے شراب' جوا اور ہر نوع کی برائی و بدکاری کو حرام قرار دیا ہے۔ مغرب میں ان کو حلال قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے اثرات مشرق پر بھی نمودار ہو رہے ہیں جس کے سبب یہاں کے لوگ بھی تمام اخلاقی اور روحانی اقدار سے محروم ہو کر لہو و لعب میں گرفتار ہیں۔

④ اے قادر مطلق! کیا تو اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ انسان کی بدکاریوں کے سبب حوران بہشت بھی اس نتیجے پر پہنچ کر مغموم و مایوس ہیں کہ ایسے بدکردار لوگوں کے لئے جنت میں کوئی گنجائش نہیں لہٰذا وہ ویرانی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔

⑤ جہاں تک اس دنیا کے سیاستدانوں کا احوال ہے تو انہوں نے جمہوریت کے نام پر ہر وہ کام شروع کر دیا ہے جو بالعموم مجھ سے منسوب کیا جاتا تھا۔ وہ قدم قدم پر عوام کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اپنے ذاتی مفادات کے لئے ہر ممکن فریب کاری سے کام لے رہے ہیں۔ تو ہی بتا! کہ اب اس دنیا میں میری کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ میری جگہ تو ان لوگوں نے لے لی ہے۔

## 172 لہو

اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس
اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس
نہ سیم و زر سے محبت ہے نے غم افلاس!
جسے ملا یہ متاع گراں بہا اس کو

(44) انسانی جسم میں خون تندرستی اور جوش و جذبے کی علامت ہے۔ ان اشعار میں اسی امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ اگر جسم میں خون موجود ہے تو وہ انسان کو نہ صرف یہ کہ تر و تازہ رکھتا ہے بلکہ خوف و ہراس بھی اس کے قریب نہیں پھٹکتا۔ خون کی موجودگی کے سبب دل میں کوئی وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔

اقبال کہتے ہیں کہ جس شخص کو خون جیسی گراں بہا شے میسر آ گئی وہ ملک و دولت کی بھی پروا نہیں کرتا بلکہ افلاس اور غربت سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے اور اپنی تندرستی کے علاوہ جراءت و ہمت اور حوصلہ کی بنیاد پر ہر شے کے حصول پر قدرت رکھتا ہے۔

## 173 پرواز

کہا درخت نے اک روز مرغ صحرا سے
ستم پہ غمکدۂ رنگ و بو کی ہے بنیاد!
خدا مجھے بھی اگر بال و پر عطا کرتا!
شگفتہ اور بھی ہوتا یہ عالم ایجاد!
دیا جواب اسے خوب مرغ صحرا نے
غضب ہے داد کو سمجھا ہوا ہے تو بیداد!
جہاں میں لذت پرواز حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذب خاک سے آزاد

**معانی:** غم کدۂ رنگ و بو: لفظی معنی رنگ و بو کا وہ مقام جو غم کا گھر ہے یعنی دنیا۔ عالم ایجاد: مراد دنیا۔

اس نظم میں اقبال نے دو کرداروں کے مکالمے اور ان کی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر یہ حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو شخص سطحی نظر کا حامل ہوتا ہے وہ عملی طور پر نہ ترقی کر سکتا ہے نا ہی زندگی میں عروج حاصل کر سکتا ہے کہ بلند پروازی کے لئے بلند حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چار اشعار کی اس

مختصر نظم میں شاعر مشرق نے ایک درخت اور مرغ صحرا کے مابین مکالمے کو یوں نظم کیا ہے۔

① جیسا کہ بعض مقامات پر بتایا گیا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے افکار و نظریات کے اظہار کے لئے کہیں کہیں انسان کی بجائے مختلف اشیاء کے حوالے سے بات کی ہے۔ یہاں بھی اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک درخت اور ایک جنگلی پرندے کے مابین ایسا مکالمہ نظم کیا ہے۔ جس کی اساس خود ان کی حکمت و دانش پر ہے۔ فرماتے ہیں۔

ایک روز درخت نے جنگلی پرندے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ عالم رنگ و بو جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں دیکھا جائے تو اس کی اساس ظلم و ستم پر قائم ہے۔

② ایک تیری طرح اگر میں بھی بال و پر رکھتا تو اڑ کر بلندی پر پہنچ سکتا تھا اور اس جہان کی چہل پہل اور شگفتگی میں مزید اضافہ ہو جاتا یعنی میں بھی ترقی کی منازل طے کر سکتا۔

③ درخت کی بات سن کر جنگلی پرندہ حیرت زدہ ہوئے بغیر یوں بولا! کہ مجھے اس امر پر یقیناً تعجب ہوا کہ تو انصاف اور حق رسی کو ظلم و ستم سمجھ رہا ہے مگر اس نکتے سے آگاہ نہیں!

④ یہ جان لے کہ سطحی سوچ اور نظر رکھنے والا کبھی بلند مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ نا ہی ایسا فرد اس استحقاق کا روادار ہو سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ درخت کی نشوونما تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کی جڑیں مٹی میں پیوست ہوں۔ اگر یہ جڑیں مٹی سے باہر آ جائیں تو درخت مرجھا کر رہ جاتا ہے۔ یہی عمل اسے لذت پرواز سے محروم رکھتا ہے۔ چنانچہ اسے ظلم و ستم سے تعبیر کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ پرواز کا حق تو اسی کو ہوتا ہے جو خود کو مٹی سے آزاد کر لے۔

## 174 شیخ مکتب سے

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر جس کی صنعت ہے روح انسانی
نکتہ دل پذیر تیرے لئے کہہ گیا ہے حکیم قاآنی

"پیش خورشید برمکش دیوار
خواہی از صحن خانہ نورانی"

**معانی:** قاآنی: ایران کا مشہور شاعر جسے پرانی ایرانی شاعری کا خاتم کہا جاتا ہے۔

اس مختصر نظم کی اساس فارسی کے بلند پایہ شاعر اور دانشور حکیم قاآنی کے ایک شعر پر قائم ہے۔ تین اشعار کی اس نظم میں ابتدائی دو اشعار علامہ اقبال کے ہیں۔ تیسرا اور آخری شعر قاآنی کا ہے جس کی طرف علامہ نے خود اپنے چوتھے مصرع میں اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

① مدرسے کا استاد تو ایک ایسے معمار کی حیثیت رکھتا ہے جو اپنے طلبا کو روحانی سطح پر تعمیر و تربیت کرتا ہے۔ اپنے علم و دانش کے ذریعے وہ طالب علموں کی ذہنی سطح بلند کرتا ہے۔

② یہی وہ نکتہ ہے جس کو حکیم قاآنی نے اپنے شعر میں بیان کر گئے ہیں کہ ہر پڑھنے والا اس سے استفادہ کر سکے۔

③ حکیم قاآنی کے بقول وہ گراں قدر نکتہ یہ ہے کہ اگر تو اپنے گھر کا صحن روشن رکھنے کا خواہشمند ہے تو ایسی دیوار کی تعمیر سے گریز کرو۔ جو سورج کی روشنی کے مابین حائل ہو! یعنی کہ ایسی تعمیر و تربیت ہی افادیت کی حامل ہوتی ہے جو فطرت اور صورت حال سے مطابقت رکھے!

175
# فلسفی

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم سر محبت سے بے نصیب رہا!
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا!

(45) **معانی**: **بلند بال**: اونچا اڑنے والا۔ **جسور**: جسارت والا۔

اقبال کے نزدیک فلسفی کی تعریف یہ ہے کہ بظاہر وہ ذہنی طور پر تو بلند ہوتا ہے لیکن اس میں جراءت وہمت نہیں ہوتی بلکہ دیکھا جائے تو غیرت کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ فلسفی کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے علامہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ محبت کے جذبے سے آشنا ہوتا ہے اس لئے مذکورہ بالا صلاحیتوں سے محرومی فطری امر ہے۔

اس کی مثال وہ شاہین اور گدھ کے کرداروں کے حوالے سے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ پرندے تو دونوں ہی ہیں اور فضاؤں میں اڑنے کا شرف بھی دونوں کو ہی حاصل ہے لیکن فطری سطح پر دونوں کی خصوصیات متضاد ہیں۔ شاہین تو زندہ پرندوں کو خود شکار کرتا ہے اس لئے کہ اس میں جراءت وہمت موجود ہے۔ وہ غیرت مند بھی ہے کہ نہ مردہ گوشت کھاتا ہے نہ کسی کا مارا ہوا شکار! اس کے برعکس گدھ اگرچہ ہر ممکن بلندی تک اڑنے کی صلاحیت تو رکھتا ہے لیکن جراءت وہمت دونوں صلاحیتوں سے محروم رہتا ہے اسی باعث وہ زندہ شکار کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا بلکہ مردہ گوشت پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک یہی کیفیت ایک فلسفی کی ہوتی ہے جو موخرالذکر پرندے سے منسوب کی گئی ہے۔

176
# شاہیں

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ!
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھکو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ!
نہ باد بہاری، نہ گلچیں، نہ بلبل
نہ بیماری نغمۂ عاشقانہ!
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جوانمرد کی ضربت غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ!
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ!
یہ پورب، یہ پچھم، چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بیکرانہ!
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ!

**معانی**: **خاکدان**: لفظی معنی مٹی کا گھر، مراد دنیا۔ **راہبانہ**: درویشوں جیسی۔ **خیابانی**: باغوں میں رہنے والا۔ **ضربت**: چوٹ، وار۔ **حمام**: وہ پرندہ جس کے گلے میں طوق ہو، مثلاً قمری فاختہ یا طوق والا کبوتر۔

علامہ اقبال کے پورے فکری نظام اور اس کے تحت ہونے والی اردو فارسی شاعری میں شاہین ایک بنیادی اور مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ شاہین پرندوں کی دنیا کا بقول اقبال درویش ہے۔ یعنی وہ صفات جو ایک مرد درویش میں ہونی چاہئیں۔ اسی طرح کی صفات پرندوں میں شاہین کی ہیں۔ زیر تشریح اشعار میں شاہین خود اپنی جملہ صفات کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے کہ:

① میں نے اس دنیا سے رشتہ توڑ دیا ہے جہاں رزق کو آب و دانہ کا نام دیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ میں زمین پر بکھرے ہوئے دانے دنکے پر گزارہ نہیں کرتا بلکہ اپنا رزق فضاؤں میں تلاش کرتا ہوں۔
② ابتدائے آفرینش سے میری فطرت میں فقر و درویشی کی صفات ودیعت کر دی گئی ہیں۔ اسی لئے تو صحراؤں کی خلوت میرا پسندیدہ مقام ہے۔
③ اس لئے کہ صحرا میں نہ بہار کا موسم ہوتا ہے' پھول بھی نہیں ہوتے تو ان کو توڑنے والا کہاں سے آئے گا۔ نہ یہاں بلبل ہوتی ہے اور نا ہی یہاں عشق و محبت کے نغموں سے پیدا ہونے والی بیماری کا ہی کوئی وجود ہوتا ہے۔ یہی فضا مجھے راس آتی ہے۔
④ باغوں کی فضاؤں میں بسنے والے نرم و نازک لوگوں کا وجود مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا اس لئے کہ ان مردانہ صفات کی بجائے معشوقوں کے سے انداز ہوتے ہیں۔ جب کہ میری فطرت تو جراءت و مردانگی سے عبارت ہے۔
⑤ یوں بھی صحرا میں بسر کرنے والے جوانمردوں کا وار زیادہ بھرپور قوی اور کاری ہوتا ہے کہ صحرا کی ہوائیں اسے زیادہ تقویت بخشتی ہیں۔
⑥ یہ بات غور سے سن لو کہ میں فاختہ اور کبوتر جیسے مسکین پرندوں کے گوشت کا بھوکا نہیں ہوں اس لئے کہ میں تو درویشوں اور زاہدوں کی سی زندگی کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔
⑦ البتہ میرا ان پرندوں پر جھپٹنا پھر پلٹنا اور پلٹنے کے بعد پھر سے جھپٹنا محض ان کے شکار کی خاطر نہیں ہوتا بلکہ یہ تو اپنے لہو کو گرم رکھنے کا ایک بہانہ ہے کہ جسم میں لہو گرم نہ ہو اور اس روانی معطل ہو جائے تو ہر جاندار ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔
⑧ یہ بھی جان لو کہ یہ جو مشرق و مغرب کی فضا ہے۔ اس میں تو صرف چکور جیسے کمزور اور ناتواں پرندے بسر اوقات کرتے ہیں جب کہ میں تو نیلگوں آسمانوں کی ان فضاؤں میں محو پرواز رہتا ہوں جہاں عزم و ہمت اور حوصلہ درکار ہوتے ہیں۔ کم ہمتی اور بزدلی مجھ ایسے جواں مرد کا شیوہ نہیں!
⑨ میری یہی صفات ہیں جن کی بنا پر مجھے پرندوں کی دنیا کا درویش کہا جاتا ہے چنانچہ درویش کی مانند میں بھی کسی ایک مقام پر اپنا آشیانہ نہیں بناتا۔ میری دنیا تو لامحدود ہے۔

## 177 باغی مرید

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن!
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن!
نذرانہ نہیں! سود ہے پیران حرم کا
ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن!
میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

**معانی:** خرقہ سالوس: مکر و فریب کا لباس۔ زاغ: کوا۔

ان اشعار میں اقبال ان نام نہاد' دنیادار اور بد اعمال پیروں کے خلاف ان کے ایک ایسے باغی مرید کے رد عمل کا اظہار کرتے ہیں جو ان پیروں کی کرتوتوں سے آگاہ ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو گیا ہے۔ یہ مسئلہ

محض کسی ایک مخصوص پیر کا نہیں بلکہ اب تو کم وبیش تمام پیر اپنے حقیقی کردار کو بھلا کر لہو ولعب اور عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ماضی میں یہ لوگ اپنے سادہ دل مریدوں کی ارادت سے جائز و ناجائز مفاد حاصل کرتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اب مرید بھی باشعور اور بیدار ہو گئے ہیں۔ رد عمل کے طور پر ان میں جو اپنے پیروں کے خلاف بغاوت کا عنصر عود کر آیا ہے۔ ان اشعار میں ان کی سوچ اور باغیانہ رد عمل کا اظہار ہے۔

① چنانچہ باغی مرید کہتا ہے کہ ہم جو شب و روز محنت کر کے ان نام نہاد پیروں پر اپنی کمائی نچھاور کر دیتے ہیں ان کے گھروں میں تو روشنی کے لئے ایک مٹی کا دیا بھی موجود نہیں ہے جب کہ پیروں کے محلات برقی قمقموں سے جگمگا رہے ہیں۔

② ہم سادہ لوح مرید خواہ شہری باشندے ہوں یا دیہات کے رہنے والے! عملی سطح پر ہمارا چالاکی اور عیاری سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا جب کہ ہم لوگ ان پیروں کی اس طرح سے پرستش کرتے ہیں جس طرح کہ یہ لوگ "کعبے کے برہمن" ہوں اور ہم ان کی اسی طرح پوجا کرنے پر مجبور ہیں جیسے کہ برہمن بتوں کی کرتے ہیں۔ علامہ نے یہاں "کعبے کے برہمن" کا استعارہ پیر کے لئے طنزاً باندھا ہے کہ یہ حضرات بھی بتوں کی مانند اپنی پرستش کے خواہاں ہیں۔

③ یہ پیر ہم سے جو خراج وصول کرتے ہیں یہ نذرانہ نہیں بلکہ سود کے مانند ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان مکرو فریب کے پتلوں کے اندر کوئی مہاجن چھپا بیٹھا ہے۔

④ افسوسناک امر یہ ہے کہ وعظ و نصیحت کی مسندیں ان ناعاقبت لوگوں کو ورثے میں ملی ہوئی ہیں۔ یہاں سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ عقابوں کے گھونسلے کووں کی کمین گاہ بنے ہوئے ہیں۔

# ہارون کی آخری نصیحت

178

ہاروں نے کہا وقت رحیل اپنے پسر سے جائے گا کبھی تو بھی اسی راہگذر سے!
پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے!

(46) یہ قطعہ عباسی خاندان کے سب سے اہم حکمران ہارون الرشید کی آخری نصیحت سے متعلق ہے۔ یہ نصیحت ہارون نے اپنی وفات سے چند لمحے قبل اپنے بیٹے کے گوش گزار کی تھی۔ جس میں اسے تلقین کی تھی کہ میری طرح سے تو بھی ایک اور فنا کے مرحلے سے گزرے گا۔ لہٰذا یہ امر ذہن نشین کر لے کہ موت کا فرشتہ جب روح قبض کرنے آتا ہے تو بے شک وہ کافر کی نظروں سے تو معدوم رہتا ہے لیکن مسلمان کی آنکھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ مراد یہ ہے کہ کافر چونکہ منکر خدا ہوتا ہے لہٰذا وہ موت کو بھی یاد نہیں رکھتا اس کے برعکس وہ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے لیکن مسلمان خدا کے ساتھ موت کو بھی ہر لمحے یاد رکھتا ہے اور قیامت پر بھی ایمان رکھتا ہے۔

# ماہر نفسیات سے

179

جراءت ہے تو افکار کی دنیا سے گذر جا ہیں بحر خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے!

کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار جب تک تو اسے ضرب کلیمی سے نہ چیرے!

(47) ماہر نفسیات سے ہم کلام ہوتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ تو ہر لمحے جو انسانوں اور ان کے مسائل کے بارے میں جائزے لیتا رہتا تھا۔ یہ سب اپنی جگہ درست سہی! پھر بھی تجھ میں اگر جراءت و ہمت ہے تو محض اس خیالی دنیا تک محدود نہ رہ بلکہ اس سے آگے نکل کر یہ بھی دیکھ کر خودی تو ایک بحر بے کنار کی مانند ہے اور اس میں ابھی تک کئی ایسے گوشے موجود ہیں جو انسان کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔

یاد رکھ! کہ خودی ایک ایسا خاموش سمندر ہے جس کے بھیدوں کو اس وقت تک انسان نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ حضرت موسیٰ کی پیروی نہ کرے۔ یعنی حکم خدا پر حضرت موسیٰ نے اپنی عصا کو پانی پر مارا جس سے انہیں پار اترنے کا راستہ مل گیا۔ مراد یہ ہے کہ محض اپنی سوچ اور تصورات ہی زندگی میں کامیابی و کامرانی کا ذریعہ نہیں بن سکتے بلکہ یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ کسی معاملے میں حکم خداوندی اور رضائے الٰہی کی نوعیت کیا ہے۔ خودی سے بہرہ ور ہونے کا یہی طریقہ ہے۔

## 180 یورپ

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زور پلنگ!
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ!

(48) ایک مدت سے یہودی سود خوار یورپ کو ہڑپ کرنے کی تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ وہ عیار و مکار لوگ ہیں جن کے بالمقابل چیتے جیسی پھرتی اور شہ زوری بھی ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ یورپ کی حیثیت تو ایک پکے ہوئے پھل کی مانند ہے۔ کون جانے وہ کس کی جھولی میں جا گرے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ خیال اقبال نے جرمنی کے مشہور فلسفی اور دانشور نطشے سے لیا ہے۔ جس نے پہلی بار اپنی ایک تحریر میں یہودی ساہوکاروں کی مکاری اور عیاری کو واشگاف انداز میں بیان کیا۔

## 181 آزادی افکار

جو دونیِ فطرت سے نہیں لائق پرواز اس مرغک بیچارہ کا انجام ہے افتاد!
ہر سینہ نشیمن نہیں جبریل امیں کا ہر فکر نہیں طائر فردوس کا صیاد!
اس قوم میں ہے شوخیِ اندیشہ خطرناک جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد!
گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ آزادیِ افکار ہے ابلیس کی ایجاد!

یہ نہیں کہ علامہ اقبال آزادی افکار کے پر زور حامی نہیں تھے البتہ یہ ضرور ہے کہ ایسی آزادی کو ناپسند کرتے تھے جو تہذیبی اور اخلاقی اقدار سے تجاوز کرتی نظر آتی ہو۔ بلندی افکار تو ہر شخص کے لئے قابل فخریات ہوتی ہے۔ لیکن جو افکار عملاً مادر پدر آزادی سے عبارت ہوں وہ کسی بھی معاشرے اور اس کے افراد بالخصوص نوجوان نسل کے لئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بے شک قومی اور عالمی سطح پر ہر عہد بالخصوص موجودہ دور میں آزادی اظہار کو انسان کے بنیادی حقوق سے وابستہ سمجھا جاتا ہے لیکن ایسے افکار جو عملاً آزادی کے حقیقی مفہوم سے متصادم ہوں ان کو کسی طور بھی مثبت انداز سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ زیر تشریح مختصر نظم میں اقبال عملاً افکار کی آزادی کے **مخالف** نہیں البتہ وہ ہر نوع کی مادر پدر

آزادی کی چاہت نہیں کرتے۔ وہ ایسی آزادی کے حامی ہیں جو معاشرے کی تعمیر و ارتقاء میں مددگار ثابت ہو سکے۔ بصورت دیگر آزادی کا منفی رویہ کسی بڑے فتنے سے کم نہیں! ملاحظہ ہو!

① جو پست فطرت پرندہ فضاء میں بلندی پر اڑنے کی صلاحیت سے محروم ہو اس صورت میں اگر وہ اڑنے کی جسارت کرے گا تو اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہ ہو گا کہ دھڑام سے نیچے گر پڑے۔ مراد یہ کہ افکار کی بلندی اور آزادی ہر فرد کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتی۔

② ہر فرد کا سینہ جبریلؑ امیں کے پیغامات کا متحمل نہیں ہو سکتا بالکل اسی طرح جیسے کہ فکر اقبال کے بقول بہشت کی معنویت کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی۔ مراد یہ ہے کہ حضرت جبریلؑ کو تو محض اس امر کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا کہ وہ حق تعالیٰ کے پیغامات اور احکامات دنیا میں اس کے پیغمبروں تک پہنچا دیں کہ ہر شخص کو ان پیغامات کا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

③ یہ شعر بھی اپنے مطالب کے لحاظ سے پہلے دو اشعار کے تسلسل میں ہے۔ یہاں اقبال واضح طور پر اپنے اس نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہیں کہ جو قوم اور معاشرہ خود کو ہر نوع کی اخلاقی و تہذیبی اور دوسری انسانی اقدار کو مسترد کر کے خود کو مادر پدر آزاد قسم کی قوم اور معاشرہ تصور کر لے اس کے لئے آزادی اظہار و افکار ہمیشہ خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ یعنی آزادی اظہار و افکار کے لئے بھی بعض معاشرتی اور اخلاقی اقدار کی پابندی ناگزیر ہے۔

④ اس شعر میں اقبال مذکورہ پس منظر کے حوالے سے جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں اس کا اعلان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں بے شک کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ رب ذوالجلال نے انسان کو غور و فکر اور اپنے نقطہ نظر کے اظہار کے لئے جو صلاحیت عطا کی ہے وہ معاشرے کے لئے روشن ہدایات کا کام دیتی ہے۔ اور راہنمائی کا سبب بنتی ہے۔ لیکن جہاں تک "مادر پدر آزادی" کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ یہ تو شیطان کی ان ایجادات اور لعنتوں میں سے ایک ہے جو اس نے دنیا میں وارد ہو کر انسان کو گمراہی اور قعر مذلت سے ہم کنار کرنے کے لئے وضع کی ہیں اور جس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں!

چنانچہ ایک بار پھر اس نقطہ کا اعادہ غیر ضروری نہیں ہو گا کہ اقبال آزادی افکار و اظہار کے قطعی طور پر مخالف نہیں ہیں تاہم اس کے لئے وہ کچھ حدود کا تعین ضروری سمجھتے ہیں جن کے بغیر یہ آزادی کار ابلیس کے سوا اور کچھ نہیں رہتی۔

# شیر اور خچر

## شیر

182 ساکنانِ دشت و صحرا میں ہے تو سب سے الگ
کون ہیں تیرے اب وجد؟ کس قبیلے سے ہے تو؟

# خچر

میرے ماموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور
وہ صبا رفتار! شاہی اصطبل کی آبرو!

(ماخوذ از جرمن)

اقبال نے دو اشعار پر مشتمل اس نظم میں شیر اور خچر کے مابین ایک مکالمہ پیش کیا ہے جس کا مرکزی خیال بقول ان کے جرمن ادب سے ماخوذ ہے۔ مکالمہ کچھ یوں ہے۔

# شیر

① اس شعر میں خچر سے مخاطب ہو کر شیر یوں گویا ہوتا ہے کہ اس جنگل میں جو جانور رہائش پذیر ہیں ان میں تیری وضع قطع یقیناً سب سے نرالی ہے۔ اتنا تو بتا دے کہ تیرا کس قبیلے سے تعلق ہے اور تیرے باپ دادا کون تھے؟ حقیقتاً یہاں شیر ایک طرح سے خچر کے دوغلے پن پر طنز کرتا نظر آتا ہے۔

# خچر

② لیکن خچر بھی بڑا ہوشیار اور کائیاں ثابت ہوتا ہے وہ اپنے باپ کا ذکر کرنے کی بجائے جواباً یوں گویا ہوتا ہے کہ حضرت آپ یقیناً گھوڑے کو تو یوں پہچانتے ہوں گے جس کی چال ہوا کے مانند ہے اور جس کے دم سے شاہی اصطبل کا وقار قائم ہے سو میرا ماموں وہی تو ہے۔

# چیونٹی اور عقاب 183

## چیونٹی

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند؟

## عقاب

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں!
میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں!

ان دو اشعار میں بھی چیونٹی اور عقاب کے مابین ایک سبق آموز مکالمہ ہے جس کا ایک کردار کمزور

اور پست ہے۔ جب کہ دوسرا کردار یا ہمت' حوصلہ مند اور بلند پرواز ہے۔ یہ مکالمہ اس منطقی نتیجے کی نشاندہی کرتا ہے کہ دنیا میں وہی لوگ باوقار اور سربلند ہوتے ہیں جو اعلیٰ آدرش کے مالک ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو!

## چیونٹی

① اس شعر میں چیونٹی' عقاب سے یوں مکالمہ کرتی ہے کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ انتہائی خوار و خستہ اور حقیر شے ہوں جسے راہگیر اپنے پیروں تلے روند ڈالتے ہیں جب کہ تیرا مرتبہ تو مجھے ستاروں سے بھی اونچا لگتا ہے آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

## عقاب

② اس شعر میں چیونٹی کے استفسار کے جواب میں عقاب یوں گویا ہوتا ہے کہ تیری ذلت و خواری کا سبب یہ ہے کہ تو نے پستی پر ہی قناعت کر لی ہے۔ اس سے بڑی کم ہمتی اور کیا ہو گی کہ تو زندہ رہنے کے لئے رزق کی تلاش میں بھی خاک راہ تک محدود رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راہگیر تجھے روند ڈالتے ہیں جب کہ میں تو آسمانوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور ان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ یہی سبب ہے کہ میں باوقار ہوں اور تو ذلیل و خوار!

184 (49)

فطرت مری مانند نسیم سحری ہے رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز
پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالہ و گل کو کرتا ہوں خار کو سوزن کی طرح تیز!

(49) جس طرح نسیم سحر کے رویے میں تیزی اور ٹھہراؤ دونوں پہلو موجود ہیں۔ میری فطرت بھی اسی نوعیت کی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اپنے کمال ہنر سے کبھی لالہ و گل کو اطلس کی قبا






پیشکش:مجلس اقبال

نشر و توزیع:محمد اسلم باقر

لحظه‌های مستی آسمانی

# بالِ جبریل

## (متن و شرح)

